تمام دنیا کے مزدورو، متحد ہو جاؤ!

فریڈرک اینگلس

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

بدیشی زبانوں کا اشاعت گھر
ماسکو

فہرست

صفحہ:

پہلے اڈیشن کا دیباچہ

۱۸۸۴ء

مندرجہ ذیل ابواب میں، ایک اعتبار سے، ایک وصیت کو پورا کیا گیا ہے۔ خود کارل مارکس کا خیال تھا کہ مارگن کی تحقیقات کے نتیجوں کو ان نتیجوں کے ساتھہ ملاکر پیش کرے، جن پر وہ ــ کسی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں ــ تاریخ کا مادی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد پہونچے تھے اور اس طرح ان کی پوری اہمیت کو صاف کرے۔ کیونکہ مارگن نے اپنے ڈھنگ سے امریکہ میں تاریخ کے مادی تصور کو نئے سرے سے دریافت کیا تھا جس کا مارکس چالیس برس پہلے پتہ لگا چکا تھا اور عہد بربریت اور عہد تہذیب کا مقابلہ کرکے، اس تصور کی مدد سے، اہم سوالوں پر، وہ بھی انہیں نتیجوں پر پہونچا جن پر مارکس پہونچ چکا تھا۔ اور جس طرح جرمنی کے سرکاری ماہرین اقتصادیات برسوں تک «سرمایہ» سے نہایت سرگرمی سے سرقہ بھی کرتے تھے اور برابر اسے چپ چاپ دبا دینے کی کوشش بھی کرتے تھے، اسی طرح کا سلوک انگلستان کے علم «ماقبل

تاریخ» کے نمائندوں نے مارگن کی کتاب «قدیم سماج» * کے ساتھہ
کیا۔ میرے مرحوم دوست کو جس کام کے کرنے کا موقع
نہ نصیب ہو سکا اس کو کرنے کی ایک حقیر کوشش میری
یہ کتاب ہے۔ لیکن مارگن سے اس نے جو طویل اقتباسات**
لئے ان پر اس کے اپنے تنقیدی حاشئے بھی ہیں جن کو میں
نے یہاں جہاں کہیں ممکن ہؤا، نقل کر دیا ہے۔

مادی تصور کے مطابق تاریخ میں فیصلہ‌کن چیز، بنیادی
حیثیت سے، فوری زندگی کی پیدائش اور تکرار پیدائش ہے۔
لیکن خود اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف ذرائع زندگی
یعنی غذا، کپڑے، رہنے کے لئے گھر وغیرہ اور ان چیزوں
کے لئے ضروری اوزاروں کی پیدائش ہے۔ اور دوسری طرف
خود انسانوں کی پیدائش یعنی انسانی نسل کو بڑھانے کا کام

---

* «قدیم سماج یا عہد وحشت سے لے کر اور عہد بربریت
سے ہوتے ہوئے عہد تہذیب تک انسانی ارتقا کے رستوں کی
تحقیقات۔» «Ancient society, or researches in the lines of human
progress from savagery through barbarism to civilization». By Lewis H.
Morgan. London, MacMillan and Co., 1877. یہ کتاب امریکہ میں
چھپی اور لندن میں مشکل سے ملتی ہے۔ مصنف کا چند
برس ہوئے انتقال ہو گیا۔ (نوٹ از اینگلس۔)

** اینگلس یہاں کارل مارکس کے مارگن کے «قدیم سماج»
کے خلاصہ کا ذکر کر رہے ہیں، جو روسی زبان میں ۱۹٤۵ء
میں شایع ہؤا تھا۔ دیکھئے: مارکس اینگلس دستاویزات،
نویں جلد۔ (اڈیٹر۔)

ہے*۔ کسی خاص تاریخی عہد یا کسی خاص ملک کے لوگ جن سماجی اداروں کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں ان کو بنانے میں دونوں قسم کی پیدائش کا ہاتھہ ہوتا ہے: ایک طرف وہ محنت کے ارتقا کی حالت سے اور دوسری طرف خاندان کے ارتقا کی حالت سے متعین ہوتے ہیں۔ محنت کا ارتقا جتنا کم ہوتا ہے اور اس لئے پیداوار کا حجم اور سماج کی دولت جتنی کم ہوتی ہے، اتنی ہی سماجی نظام میں جنسی تعلقات کی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سماجی نظام کے اندر، جو جنسی تعلقات پر مبنی ہے، محنت کی پیداواری قوت برابر بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھہ ذاتی ملکیت اور تبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے، دولت کا فرق بڑھتا ہے، دوسروں کی محنت کی طاقت کو استعمال کرنے کا امکان بڑھتا ہے اور اس طرح طبقاتی تضاد کی بنیاد تیار ہوتی ہے۔ نئے سماجی عناصر بڑھتے ہیں جو کئی پشت کے دوران میں سماج کے

---

* یہاں اینگلس نے ذرائع زندگی کی پیدائش کے ساتھہ انسانی نسل کو بڑھانے کے کام کو بھی سماج اور سماجی اداروں کی ترقی کو متعین کرنے والا سبب بتا کر غلطی کی ہے۔ «خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز» کے اصل متن میں اینگلس نے خود ٹھوس مواد کا تجزیہ کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سماج اور سماجی اداروں کی ترقی سب سے زیادہ جس چیز پر منحصر ہے وہ مادی پیداوار کا طریقہ ہے۔ (اڈیٹر۔)

پرانے ڈھانچہ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ھیں یہاں تک کہ آخر میں دونوں کے بے میل ھونے کی وجہ سے پورا انقلاب ھو جاتا ھے۔ پرانا سماج جس کی بنیاد جنسی گروھوں پر تھی، نئے ابھرنے والے سماجی طبقوں کی ٹکروں سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ھے، اس کی جگہ ایک نیا سماج جنم لیتا ھے جو اپنے کو ریاست کی شکل میں منظم کرتا ھے، جس کی نیچے کی اکائیاں جنسی تعلقات کی بنیاد پر بننے والے گروہ نہیں بلکہ علاقائی گروہ ھوتے ھیں۔ اس سماج میں خاندانی نظام پوری طرح ملکیت کے نظام کے ماتحت ھوتا ھے اور اس میں وہ طبقاتی تضاد اور طبقاتی جد و جہد خوب کھل کر بڑھتی ھے، جو ابھی تک کی ساری لکھی ھوئی تاریخ کی اصلیت ھے۔

مارگن کی عظمت یہ ھے کہ اس نے ھماری لکھی ھوئی تاریخ کی اس ماقبل تاریخی بنیاد اور اس کی نمایاں خصوصیتوں کا پتہ لگایا اور اس کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اس کی عظمت اس بات میں بھی ھے کہ اس نے شمالی امریکہ کے انڈینوں کے ان گروھوں میں جو جنسی تعلقات پر مبنی تھے، قدیم ترین یونانی، رومی اور جرمن تاریخ کی سب سے اہم پہیلیوں کو، جن کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا تھا، سلجھانے کی کنجی کھوج نکالی۔ لیکن اس کی کتاب کوئی ایک دن کا کام نہیں تھی۔ تقریباً چالیس برس تک جب تک کہ وہ اپنے مواد کو پوری طرح سمجھ لینے میں کامیاب نہیں ھو گیا، وہ اس کے ساتھ الجھا رھا۔ یہی وجہ ھے کہ

اس کی کتاب ہمارے زمانہ کی گنتی کی چند عہدآفریں کتابوں میں سے ایک ہے۔

آئندہ صفحات میں پڑھنےوالا عام طور پر آسانی سے پہچان لےگا کہ کون سی باتیں مارگن کی کتاب سے لی گئی ہیں اور کون سی میں نے اضافہ کی ہیں۔ ان تاریخی حصوں میں جہاں یونان و روم سے بحث کی گئی ہے، میں نے اپنے آپ کو مارگن کے فراہم کئے ہوئے مواد تک محدود نہیں رکھا بلکہ میرے پاس جو کچھ بھی مسالہ موجود تھا، اس کو استعمال کیا ہے۔ کیلٹ اور جرمن لوگوں سے جن حصوں میں بحث کی گئی ہے وہ زیادہ‌تر میرے اپنے ہیں۔ اس موضوع پر مارگن کے پاس صرف پرانی اور پہلے کی استعمال کی ہوئی چیزیں تھیں اور جہاں تک جرمنی کے حالات کا تعلق ہے، بس ایک ٹیسی‌ٹس کو چھوڑکر اس کے پاس صرف مسٹر فری‌مین کی مہمل، لبرل خیالات کی غلط بیانیاں تھیں۔ مارگن کی اقتصادی دلیلیں اس کے اپنے مقصد کے لئے بھلے ہی کافی رہی ہوں، لیکن میرے لئے وہ بالکل ناکافی تھیں۔ انہیں میں نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔اور آخری بات یہ کہ جہاں کہیں مارگن کا قول صاف صاف نقل نہیں کیا گیا ہے، وہاں سبھی نتیجوں کی ذمہ‌داری مجھ پر ہے۔

* * *

چوتھے اڈیشن کا دیباچہ

۱۸۹۱ء

اس کتاب کے پچھلے بڑے اڈیشن تقریباً چھہ مہینے سے نایاب ہیں اور ناشر کا کچھہ دنوں سے یہ تقاضہ رہا ہے کہ میں اس کا ایک نیا اڈیشن تیار کروں ۔ کچھہ زیادہ ضروری کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ابھی تک میں اس کام کو پورا نہیں کر سکا ۔ پہلے اڈیشن کو شایع ہوئے سات برس کا عرصہ گذر گیا اور اس مدت میں خاندان کی ابتدائی شکلوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اہم اضافہ ہؤا ہے ۔ اس لئے ضروری تھا کہ اضافہ اور اصلاح و ترمیم کے کام کو محنت کے ساتھہ کیا جائے ۔ خاص کر اس لئے کہ اس نئے اڈیشن کے لئے چھپائی کی مستقل پلیٹیں تیار کرنے کا ارادہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ کچھہ عرصہ کے لئے کتاب میں کوئی تبدیلی کرنا میرے لئے ناممکن ہو جائے گا ۔

لہذا میں نے پوری کتاب پر احتیاط کے ساتھہ نظر ثانی کی ہے اور کئی جگہ نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے، جن میں میرا خیال ہے سائنس کی موجودہ حالت کا پورا دھیان رکھا

گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دیباچہ میں میں باخوفن سے مارگن تک خاندان کی تاریخ کے ارتقا کا مختصر حال بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ خاص‌کر اس لئے بھی ضروری ہے کہ ماقبل تاریخی عہد کے انگریز مورخ جن میں جارحانہ وطن پرستی موجود ہے، آج بھی انتہائی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ قدیم سماج کی تاریخ کے بارے میں ہمارے تصورات میں مارگن کی دریافتوں نے جو انقلاب پیدا کر دیا ہے، اس کو اپنی خاموشی کے حربے سے دبا دیں حالانکہ مارگن کی تحقیقات کے نتیجوں کو اپنا بنا لینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ دوسرے ملکوں میں بھی انگریزوں کی اس مثال پر اکثر عمل کیا جاتا ہے۔

میری کتاب کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا ترجمہ اطالوی میں ہوا: «L'origine della famiglia, della proprieta privata e dello stato, versione riveduta dall'autore, di Pasquale Martignetti», Benevento, 1885. اس کے بعد رومانیا کی زبان میں ایک ترجمہ ہوا: «Origina familei, proprietatei private si a statului, traducere de Joan Nadejde». «Contemporanul» کے نام سے یاسی سے شایع ہونے والے رسالہ میں ستمبر ۱۸۸۵ء سے مئی ۱۸۸٦ ء تک نکلا۔ اس کے بعد ڈنمارکی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا: «Familjens, Privatejendommens og Statens Oprindelse, Dansk, af Forfatteren gennemgaaet Udgave, besörget af Gerson Trier», Köbenhavn, 1888. آنری راوے کا کیا ہوا فرانسیسی ترجمہ جو موجودہ جرمن اڈیشن پر مبنی ہے، ابھی پریس میں ہے۔

* * *

اس صدی کی ساتویں دھائی کے شروع تک خاندان کی تاریخ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس شعبہ میں علم تاریخ پر اس وقت تک موسیٰ کی توریت کا اثر حاوی تھا۔ توریت میں خاندان کی پدری شکل کو جتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اتنی تفصیل سے اس کا بیان اور کہیں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کو نہ صرف خاندان کی سب سے قدیم شکل مان لیا گیا تھا بلکہ — کثرت زوجگی کے نظام کو الگ کر کے — اس کو اور موجودہ زمانہ کے بورژوا خاندان کو ایک ھی چیز سمجھ لیا گیا تھا، گویا خاندان اصل میں کسی تاریخی ارتقا سے گذرا ھی نہ ھو۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنا مانا جاتا تھا کہ ممکن ھے کہ قدیم زمانہ میں آزاد جنسی تعلقات کا کوئی دور رھا ھو۔ اس میں شک نہیں کہ یک‌زوجگی کے علاوہ مشرق کی کثرت زوجگی اور ھندوستان اور تبت میں کثرت شوھری کا حال بھی لوگوں کو معلوم ھو چکا تھا۔ لیکن یہ تینوں شکلیں اس وقت تک کسی تاریخی سلسلہ کی کڑیاں نہیں بنی تھیں اور آپس میں بلا کسی تعلق کے ایک دوسرے کے متوازی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ امر کہ قدیم زمانہ کے کچھ لوگوں میں اور آج کل کے کچھ وحشیوں میں بھی نسل باپ سے نہیں بلکہ ماں سے چلتی ھے اور اس لئے ان میں صرف عورت کے سلسلۂ نسب کو ھی صحیح سمجھا جاتا ھے، اور یہ کہ موجودہ زمانہ کے بہت سے لوگوں میں چند مخصوص گروھوں کے اندر — جن کے بارے میں اس وقت تک زیادہ قریب سے چھان بین نہیں کی گئی تھی — شادی کرنے کی ممانعت ھے،

اور یہ کہ یہ رواج دنیا کے سبھی حصوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ باتیں لوگوں کو معلوم تھیں اور نئی مثالیں برابر سامنے آ رہی تھیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان سے کیا نتیجہ نکالا جائے۔ یہاں تک کہ ای۔ بی۔ ٹائلر کی کتاب «بنی نوع انسان کی ابتدائی تاریخ اور تہذیب کے ارتقاء کی تحقیقات» (۱۸٦۵ء)* میں ان باتوں کو اسی طرح کی «عجیب وغریب رسموں» کے زمرے میں ڈال دیا گیا ہے جیسے بعض وحشیوں میں جلتی لکڑی کو لوہے کے اوزاروں سے نہ چھونے کا رواج، اور اسی طرح کی دوسری مہمل اور بے معنی مذہبی باتیں۔

خاندان کی تاریخ کا مطالعہ ۱۸٦۱ء سے شروع ہوا جبکہ باخوفن کی کتاب «مادری حق» شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے مندرجہ ذیل خیالات کو پیش کیا ہے: (۱) انسانوں میں شروع میں آزاد جنسی تعلقات کا رواج تھا۔ مصنف نے اسے hetaerism (داشتہ عورتوں کا رواج) کے غیرموزوں نام سے پکارا ہے۔ (۲) اس آزاد جنسی تعلق کی وجہ سے کسی کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس لئے نسب کا سلسلہ صرف ماں سے — مادری حق کے مطابق ہی — چل سکتا تھا اور ابتدا میں قدیم زمانہ کی سبھی قوموں میں یہ بات پائی جاتی تھی۔ (۳) چونکہ

---

* Tylor E. B., Researches into the Early History of Mankind and the Development of Civilization, London, 1865. (اڈیٹر —)

والدین میں صرف ماں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا، اس لئے عورتوں کی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی اور باخوفن کی رائے میں یہ اتنی بڑھ گئی کہ پوری طرح عورت کا راج (gynecocracy) ہو گیا۔ (٤) یک‌زوجگی کا نظام جس میں عورت پر صرف ایک مرد کا حق مانا جاتا ہے، اس کے قائم ہونے کا مطلب ایک قدیم مذہبی اصول کی خلاف ورزی (یعنی اصل میں اس عورت پر دوسرے مردوں کے قدیم روائتی حق کی خلاف ورزی) تھی۔ اور اس لئے اس کی تلافی کرنے یا اس کا ہرجانہ ادا کرنے کے لئے عورت کو ایک خاص مدت کے لئے غیر مردوں کے حوالہ کرنا پڑتا تھا۔

باخوفن کو قدیم کلاسیکی ادب کے بے‌شمار ٹکڑوں میں ان بیانات کے ثبوت ملے جنہیں اس نے بڑی محنت سے یکجا کیا۔ اس کی رائے میں «داشتہ عورتوں کے رواج» سے یک‌زوجگی تک اور مادری حق سے پدری حق تک جو ارتقاء ہؤا، وہ ــ خاص‌کر یونانیوں میں ــ مذہبی خیالات کے ارتقا کی بدولت، پرانی روائتی دیومالا میں جو پرانے روائتی خیالات کی حامل تھی، نئے خیالات کے نمائندے، نئے دیوتاؤں کے درآنے کی بدولت ہؤا جنہوں نے پرانے دیوتاؤں کو دھکیل کر بہت پیچھے کر دیا۔ چنانچہ باخوفن کی رائے میں مرد اور عورت کے باہمی تعلقات اور سماجی حیثیت میں جو تاریخی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کی وجہ ان خارجی حالات کی ترقی نہیں جن میں انسان زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ انسانوں کے ذہن میں زندگی کے ان حالات کا مذہبی عکس ہے۔ چنانچہ

باخوفن کا کہنا ہے کہ ایسکیلس کا «آرسطیا» اس کشمکش کی ڈرامائی تصویر پیش کرتا ہے جو زوال پذیر مادری حق اور ابھرتے ہوئے فتح‌مند پدری نظام میں سورمائی عہد میں چھڑی تھی۔ کلیتم نسترا نے اپنے عاشق ایگس تھس کی خاطر اپنے شوہر آگامنان کو قتل کر دیا جو ٹروجن کی جنگ سے لوٹا ہی تھا۔ لیکن اس کا بیٹا آرسطس جو آگامنان سے پیدا ہؤا تھا، باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اپنی ماں کو مار ڈالتا ہے۔ اس پر مادری حق کی عفریتی محافظ ایرینیئں* آرسطس کا پیچھا کرتی ہیں کیونکہ مادری حق کے مطابق ماں کا قتل سب سے سنگین جرم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اپولو، جس نے اپنے ہاتف غیبی کے ذریعہ آرسطس کو اس جرم کی ترغیب دلوائی تھی اور ایتھنہ جسے ثالث بنایا جاتا ہے، آرسطس کو بچاتے ہیں۔ یہ دونوں دیوی دیوتا نئے نظام کے نمائندے ہیں جس کی بنیاد پدری حق پر ہے۔ ایتھنہ دونوں فریقوں کی بات سنتی ہے۔ آرسطس اور ایرینیوں میں جو بحث ہوتی ہے اس میں پورے اختلاف کا خلاصہ سامنے آ جاتا ہے۔ آرسطس کہتا ہے کہ کلیتم نسترا نے دوہرا جرم کیا ہے۔ اپنے شوہر کو قتل کرکے اس نے میرے باپ کو بھی مار ڈالا ہے۔ اس لئے

---

* ایرینیئں (یونانی دیومالا) — انتقام کی دیویاں جن کے سر پر بالوں کے بجائے سانپ ہوتے تھے اور جنہیں قدیم مصور عورتوں کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ (اڈیٹر۔)

ایرینیٹس میرے پیچھے کیوں پڑی ہیں، کلیتم‌نسترا کو، جس کا جرم کہیں زیادہ بڑا ہے، انہوں نے کیوں سزا نہیں دی؟ جواب قابل غور ہے:

اس نے جس مرد کو قتل کیا، اس سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔»

جس مرد سے خون کا کوئی رشتہ نہ ہو، چاہے وہ قاتلہ کا شوہر ہی کیوں نہ ہو، اس کے خون کی تلافی ہو سکتی ہے اور ایرینیوں کو اس کی کوئی فکر نہیں۔ ان کا کام خون کے رشتہ‌داروں کے قتل کا انتقام لینا ہے، اور ان میں بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز قتل، مادری حق کے مطابق، ماں کا قتل ہے۔ اب آرسطس کی طرف سے اپولو بحث میں شریک ہوتا ہے۔ ایتھنہ، ایریوپیگاٹیٹز سے — یعنی ایتھنز کے جوریوں سے — اس مسلہ پر اپنی رائے دینے کو کہتی ہے۔ ملزم کو بری کر دینے اور سزا دینے، دونوں کے حق میں برابر برابر ووٹ پڑتے ہیں۔ تب عدالت کی صدر کی حیثیت سے ایتھنہ اپنا ووٹ آرسطس کے حق میں دیتی ہے اور اسے بری کر دیتی ہے۔ مادری حق کے مقابلہ میں پدری حق کی جیت ہوتی ہے۔ خود ایرینیوں کے الفاظ میں «چھوٹے سلسلۂ نسب کے دیوتا» ایرینیوں پر فتح حاصل کرتے ہیں اور ایرینیٹس آخر میں نیا عہدہ قبول کرکے نئے نظام کی خدمت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔

«آرسطیا» کی یہ نئی لیکن بالکل صحیح توجیہہ جس حصہ میں دی گئی ہے وہ پوری کتاب کے سب سے اچھے اور

خوبصورت ٹکڑوں میں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بات
بھی صاف ہو جاتی ہے کہ خود باخوفن کو بھی ایرینیوں،
اپولو اور ایتھنہ میں کم سے کم اتنا ہی عقیدہ ہے جتنا
ایسکیلس کو اپنے زمانہ میں تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ باخوفن کو واقعی یقین ہے کہ یونان کے سورمائی عہد
میں مادری حق کو ہٹانا اور اس کی جگہ پدری حق قائم
کرنا انہیں دیوی دیوتاؤں کا معجزہ اور کارنامہ تھا۔ ظاہر
ہے کہ مذہب کو دنیا کی تاریخ کا روح رواں بتلانے والا
نظریہ آخر میں محض مخفی قوتوں کی بھول بھلیاں میں پہونچ کر
ہی دم لےگا۔ اس لئے باخوفن کی ضخیم کتاب کو پڑھنا
کافی مشکل کام ہے اور بہت زیادہ سودمند بھی نہیں۔ لیکن
ان سب باتوں سے باخوفن کی عظمت میں کوئی کمی نہیں
ہوتی کیونکہ وہ اس راہ کا خضر تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا
جس نے قدیم زمانہ کی اس حالت کے بارے میں، جس میں
آزاد جنسی تعلقات کا رواج تھا، محض لفاظی سے کام نہیں
لیا بلکہ اس کے بجائے یہ ثابت کر دکھایا کہ قدیم کلاسیکی
ادب میں اس حالت کے بہت سے آثار بکھرے پڑے ہیں جن
سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی اور ایشیائی لوگوں میں یک زوجگی
کا رواج ہونے سے پہلے وہ حالت پائی جاتی تھی جس میں
نہ صرف مردوں کا ایک سے زیادہ عورتوں سے جنسی تعلق
ہوتا تھا بلکہ عورتوں کا بھی ایک سے زیادہ مردوں سے
جنسی تعلق ہوتا تھا اور اس سے کسی مروجہ اصول کی خلاف
ورزی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ثابت کیا کہ یہ رواج تو اب

نہیں رہا لیکن اس کا اثر باقی ہے۔ صرف ایک مرد سے شادی کا حق خریدنے کے لئے عورتوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ ایک محدود دائرے کے اندر اپنے آپ کو غیر مردوں کے حوالے کریں۔ اور ان وجہوں سے شروع میں خاندان عورتوں سے، ایک ماں کے بعد دوسری ماں سے چلا کرتا تھا۔ یک‌زوجگی کا رواج ہونے کے بعد بہت دنوں تک عورتوں سے نسل چلنے کا رواج قائم رہا حالانکہ اس وقت یہ بات یقین کے ساتھہ کہی جا سکتی تھی یا کم از کم مان لی جاتی تھی کہ بچہ کا باپ کون ہے۔ اور شروع میں چونکہ بچے کی صرف ماں کے بارے میں یقین کے ساتھہ کہا جا سکتا تھا اس لئے ماں کا اور عام طور پر عورتوں کا درجہ سماج میں بہت اونچا تھا۔ بعد میں انہیں کبھی یہ درجہ نہیں ملا۔ باخوفن نے یہ تمام باتیں اتنی صفائی سے نہیں کہیں۔ اس کے مذہبی صوفیانہ نظریہ نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ یہ تمام باتیں صحیح ہیں۔ اور ۱۸۶۱ء میں یہ ایک پورا انقلاب تھا۔

باخوفن کی ضخیم کتاب جرمن میں لکھی گئی تھی — یعنی اس قوم کی زبان میں جس کو موجودہ خاندان کی ماقبل تاریخی حالت میں اس زمانہ میں سب سے کم دلچسپی تھی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ اس کو کسی نے نہیں جانا۔ اس شعبہ میں اس کا جو جانشین ہؤا، وہ ۱۸۶۵ء میں سامنے آیا مگر اس نے باخوفن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

یہ جانشین ج ـ ف ـ میکلینن تھا ـ وہ اپنے پیشرو کا بالکل الٹ تھا ـ ایک اگر صوفی اور صاحب‌کمال تھا تو دوسرا بےرس اور خشک وکیل ـ ایک میں اگر رنگینی اور شاعرانہ خیال‌آرائی تھی، تو دوسرا عدالت میں بحث کرنےوالے وکیل کی طرح سبھی ممکن دلیلوں کا طومار کھڑا کر دیتا تھا ـ میکلینن نے قدیم اور موجودہ زمانے کی بہت سی وحشی، بربری، اور مہذب قوموں میں بھی شادی کی ایک ایسی شکل کا پتہ لگایا تھا جس میں دولھا کو، اکیلے یا اپنے دوستوں کے ساتھہ، دلھن کو اس کے رشتہ داروں کے یہاں سے زبردستی بھگا لے جانے کا سوانگ رچنا پڑتا تھا ـ یہ رواج کسی پرانے رواج کی بچی ہوئی نشانی ہے جس میں ایک قبیلے کے مرد قبیلے کے باہر کی، دوسرے قبیلوں کی، لڑکیوں کو سچ مچ زبردستی اغوا کر لے جاتے تھے اور اس طرح بیویاں لاتے تھے ـ مگر اس «اغوائی شادی» کی ابتدا کیسے ہوئی ہوگی؟ جب تک مردوں کو اپنے ہی قبیلے کے اندر کافی عورتیں مل سکتی تھیں، تب تک اس طریقہ کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی ـ لیکن اسی طرح سے اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ غیرترقی‌یافتہ لوگوں میں کچھہ ایسے گروہ ہوتے ہیں (۱۸٦۵ء کے لگ بھگ ان گروہوں کو اور قبیلوں کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا) جن کے اندر شادی کرنے کی ممانعت ہے جس کی وجہ سے مردوں کو اپنے لئے بیویاں، اور عورتوں کو اپنے لئے شوہر ان گروہوں کے باہر ڈھونڈھنے پڑتے ہیں ـ اس کے علاوہ کچھہ

اور لوگوں میں یہ رواج پایا جاتا ھے کہ ایک گروہ کے مردوں کو اپنے گروہ کی عورتوں سے ھی شادی کرنی پڑتی ھے۔ میکلینن نے پہلی قسم کے گروھوں کو گوت باھر شادی کرنےوالے گروہ، اور دوسرے کو گوت اندر شادی کرنےوالے گروہ کا نام دیا۔ اور پھر بلا کسی مزید درد سری کے یہ طے کر دیا کہ گوت باھر شادی کرنےوالے اور گوت اندر شادی کرنےوالے «قبیلوں» میں ایک ایسا تضاد ھے جو سختی کے ساتھہ قائم رھتا ھے۔ حالانکہ گوت باھر شادی کرنے کے رواج کے بارے میں اس کی اپنی چھان بین سے ھی ٹھیک اس کی ناک کے نیچے اس بات کا ثبوت آکر موجود ھو جاتا ھے کہ اگر سبھی یا زیادہ‌تر صورتوں میں نہیں تو کم از کم بہت سی صورتوں میں یہ تضاد صرف اس کے تخیل کی اپج ھے، پھر بھی اس نے اسے اپنے سارے نظرئے کی بنیاد بنا ڈالا۔ چنانچہ اس کے مطابق گوت باھر شادی کرنےوالے قبیلے صرف دوسرے قبیلوں سے ھی بیویاں لا سکتے ھیں اور چونکہ عہد وحشت میں مختلف قبیلوں کے درمیان مستقل جنگ کی حالت رھتی تھی، اس لئے یہ صرف اغوا کے ذریعہ ھی ممکن تھا۔

میکلینن اس کے بعد سوال کرتا ھے: گوت باھر شادی کرنے کا رواج کیسے شروع ھؤا؟ ایک گوتر یا خاندان کے اندر یا بہت قریبی رشتہ‌داروں کے ساتھہ جنسی تعلق کی ممانعت کے تصورات سے اس کو کوئی مطلب نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو بہت بعد کی ھیں۔ لیکن لڑکیوں کو پیدا ھوتے

ہی مار ڈالنے کے رواج سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ رواج بہت سے وحشی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سے الگ الگ ہر قبیلے میں مردوں کی کثرت ہو جاتی ہے جس کا لازمی اور فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایک عورت پر مشترک طور پر کئی کئی مردوں کا قبضہ ہونے لگا یعنی کثرت شوہری کا رواج ہو گیا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بچہ کی ماں کا پتہ تو رہتا تھا مگر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس لئے نسل صرف ماں سے چلتی تھی اور اس معاملہ میں مرد کی کوئی اہمیت نہیں تھی، یعنی مادری حق قائم تھا۔ قبیلے کے اندر عورتوں کی کمیابی کثرت شوہری کی وجہ سے کسی حد تک کم ضرور ہو جاتی تھی، پوری طرح دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کمی کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ دوسرے قبیلوں کی عورتوں کو باقاعدہ، زبردستی اغوا کیا جاتا تھا۔ میکلینن نے لکھا ہے:

«گوت باہر شادی کرنے کا رواج، اور ایک ایک عورت کے متعدد شوہروں کا رواج، دونوں کی وجہ ایک ہے — مردوں اور عورتوں کی تعداد میں توازن کا نہ ہونا۔ اس لئے ہمیں مجبور ہوکر اس نتیجے پر پہونچنا پڑتا ہے کہ جن نسلوں میں گوت باہر شادی کرنے کا رواج ہے، ان سب میں شروع میں کئی کئی شوہروں کا رواج تھا... اس لئے ہمیں اس بات میں کوئی شبہہ نہیں ہونا چاہئیے کہ گوت باہر شادی کرنےوالی نسلوں میں قرابت‌داری کا پہلا نظام وہ تھا جو صرف ماں

کے ذریعہ خون کے رشتوں کو مانتا تھا»۔ (میکلینن، «قدیم تاریخ کا مطالعہ»، ۱۸۸٦ء۔ قدیم شادی*، صفحہ ۱۲٤۔)

میکلینن کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس بات کی طرف توجہ دلائی جسے وہ گوت باہر شادی کرنے کا رواج کہتا ہے اور یہ بتایا کہ اس کی کتنی بڑی اہمیت اور کتنا عام رواج تھا۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ گوت باہر شادی کرنے والے گروہوں کو اس نے دریافت کیا تھا۔ اور یہ کہنا تو اور بھی غلط ہوگا کہ اس نے ان کو سمجھہ لیا تھا۔ پہلے کے ان بہت سے مشاہدہ کرنے والوں کے علاوہ جن کی مختصر یادداشتوں نے میکلینن کے لئے مواد کا کام دیا، لیتھم نے («تشریحی علم الانسان»، ۱۸۵۹ء** میں) ہندوستان کے ماگر لوگوں میں اس دستور کا ٹھیک ٹھیک اور بالکل صحیح حال بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ دنیا کے سبھی حصوں میں عام طور پر اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ خود میکلینن نے اپنی کتاب میں اس حصہ کو نقل کیا ہے۔ اور ہمارا مارگن بھی، ۱۸٤۷ء میں ہی، ایراکواس لوگوں کے بارے میں اپنے خطوط میں (جو کہ «امریکن ریویو» («American Review») میں شائع ہوئے

---

* Mac-Lennan J. F., Studies in Ancient History, comprising a reprint of Primitive Marriage. London, 1886. (اڈیٹر۔)

** Latham R. G., Descriptive Ethnology, Vols, I—II, London, 1859. (اڈیٹر۔)

تھے) اور ۱۸۵۱ء میں «ایراکواس لوگوں کی انجمن»* نامی اپنی کتاب میں بتا چکا تھا کہ اس قبیلے میں بھی یہ دستور موجود تھا اور اس نے اس دستور کی بالکل صحیح تفصیل بیان کی تھی۔ اس کے برعکس ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ باخوفن کی صوفیانہ خیال‌آرائی نے مادری حق کے بارے میں جتنی الجھن پیدا کی تھی اس سے کہیں زیادہ الجھن میکلینن کی وکیلانہ ذہنیت نے اس موضوع کے بارے میں پیدا کی۔ میکلینن نے ایک اور قابل ذکر کام یہ کیا کہ اس نے یہ پتہ لگایا کہ شروع میں نسل ماں سے چلتی تھی۔ حالانکہ جیسا کہ بعد میں اس نے خود اعتراف کیا، باخوفن اس سے پہلے ھی اس بات کا پتہ لگا چکا تھا۔ لیکن اس معاملہ میں بھی اس کی رائے بہت صاف نہیں ہے۔ وہ برابر «محض عورتوں کے ذریعہ قرابت‌داری» (kinship through females only) کا ذکر کرتا ھے اور اس جملہ کو، جو ایک ابتدائی دور کے لئے بالکل صحیح تھا، ارتقا کے بعد کے ادوار پر بھی چسپاں کرتا ھے، جبکہ نسل اور وراثت کا سلسلہ تو یقیناً ابھی تک عورتوں سے چلتا تھا مگر قرابت‌داری مرد کی طرف سے بھی مانی جانے لگی تھی اور اس کا اظہار بھی ہونے لگا تھا۔ یہ ایک قانون‌داں کی محدود ذہنیت ھے جو اپنے لئے ایک بےلوچ قانونی اصطلاح گھڑتا ھے اور پھر اسے بلاکسی رد و بدل کے ان حالات پر بھی چسپاں کرتا ھے جو

* Morgan L. H., League of the Ho-dê-no-sau-nee, or Iroquois Rochester, 1851. (اڈیٹر)

اس دوران میں بدل گئے ہیں اور جن پر وہ اصطلاح اب صادق نہیں آتی۔

میکلینن کا نظریہ بادی النظر میں قابل قبول معلوم ہوتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف کی نظر میں بھی اس کی مضبوط بنیاد نہیں تھی۔ کم سے کم یہ بات خود اس کو بھی کھٹکتی ہے کہ «(جھوٹ موٹ کے دکھاوٹی) اغوا کا رواج صاف طور پر انہیں نسلوں میں ہے اور وہی اس کو دھوم دھام سے مناتے ہیں جن میں قرابت داری مرد کی طرف سے ہوتی ہے (یعنی جن میں مرد سے نسل چلتی ہے)» (صفحہ ۱٤۰) ۔ ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے کہ «یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اب ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں گوت باہر شادی کرنے کے رواج کے ساتھ ساتھ قرابت داری کی سب سے پرانی شکل موجود ہے اور وہاں بچوں کو مار ڈالنے کا دستور ہے» (صفحہ ۱٤٦) ۔ ان دونوں باتوں سے اس کے خیال کی براہ راست تردید ہوتی ہے اور ان کے خلاف وہ محض نئے اور پہلے سے بھی زیادہ الجھے ہوئے مفروضات پیش کرتا ہے۔

پھر بھی انگلینڈ میں اس کے نظرئیے کا بڑے زوروں سے خیرمقدم ہؤا اور لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ وہاں عام طور پر میکلینن کو خاندان کی تاریخ کا بانی اور اس شعبہ کا سب سے ممتاز عالم مان لیا گیا۔ گوت باہر شادی کرنے والے اور گوت اندر شادی کرنے والے «قبیلوں» میں اس نے جو تضاد قائم کیا تھا، وہ چند مستثنیات اور رد و بدل کو

مان لینے کے باوجود، مروجہ خیال کی بنیاد بنا رہا جس کی اس حیثیت کو سبھی تسلیم کرتے تھے۔ اس تضاد نے لوگوں کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا جس سے اس شعبہ میں آزادی کے ساتھہ چھان بین کرنا اور کوئی خاص ترقی کرنا ناممکن ہو گیا۔ چونکہ انگلینڈ میں اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ملکوں میں بھی میکلینن کی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بتانا ایک فیشن سا ہوگیا ہے، اس لئے اس کے مقابلہ میں یہ بتانا ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ گوت باہر شادی کرنے والے اور گوت اندر شادی کرنے والے «قبیلوں» میں ایک بالکل غلط تضاد کھڑا کر کے میکلینن نے جو نقصان پہونچایا ہے، اس کے مقابلہ میں اس کی چھان بین سے فائدہ بہت کم ہوا ہے۔

اس دوران میں، جلد ہی ایسے بہت سے واقعات سامنے آ گئے جو میکلینن کے بنائے ہوئے خوبصورت چوکھٹے میں ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے۔ میکلینن شادی کی صرف تین صورتوں سے واقف تھا: ایک شوہر کی بہت سی بیویاں یعنی کثرت ازواج، ایک بیوی کے بہت سے شوہر یعنی کثرت شوہری، اور ایک میاں ایک بیوی یعنی یک زوجگی۔ لیکن جب ایک بار لوگوں نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی تو اس بات کے نت نئے ثبوت ملنے لگے کہ نا ترقی یافتہ لوگوں میں شادی کی ایسی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں مردوں کا ایک گروہ مشترک طور پر عورتوں کے ایک گروہ کا مالک ہوتا ہے۔ اور لوباک نے (۱۸۷۰ء میں اپنی کتاب «تہذیب کی

ابتدا» * میں) اس گروہ واری شادی (Communal marriage) کو ایک تاریخی حقیقت مان لیا۔

اس کے فوراً بعد ھی ۱۸۷۱ء میں مارگن نئی، اور کئی پہلوؤں سے فیصلہ کن، شہادتیں لےکر سامنے آیا۔ اس کو یہ یقین ھو چکا تھا کہ ایراکواس لوگوں میں قرابت داری کا جو انوکھا طریقہ رائج ھے، وہ ریاست ھائے متحدہ امریکہ میں رھنے والے سبھی آدی باسیوں میں پایا جاتا ھے اور اس طرح وہ ایک پورے براعظم میں پھیلا ھوا ھے حالانکہ قرابت داری کا یہ سلسلہ ان رشتوں کے بالکل برعکس ھے جو وھاں کے مروجہ ازدواجی نظام سے پیدا ھوتے ھیں۔ تب اس نے امریکہ کی وفاقی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دوسری قوموں میں قرابت داری کی جو صورتیں پائی جاتی ھیں ان کے بارے میں معلومات فراھم کرے۔ اور اس کام کے لئے اس نے خود سوالات اور جدول تیار کئے۔ ان سوالوں کے جو جواب آئے ان سے مارگن کو پتہ چلا کہ (۱) امریکہ کے انڈینوں میں قرابت داری کا جو سلسلہ پایا جاتا ھے، اس کا رواج ایشیا کے بہت سے قبیلوں میں بھی ھے اور کسی قدر بدلی ھوئی صورت میں افریقہ اور آسٹریلیا میں بھی۔ (۲) اس کی پوری توجیہہ ایک قسم کی گروہ وار شادی سے ھو جاتی ھے جو ھوائی میں اور آسٹریلیا کے دوسرے جزیروں میں پائی جاتی ھے اور اب مٹنے لگی ھے۔ اور (۳) شادی کی اس شکل کے

* Lubbock I., The Origin of Civilization and the Primitive Condition of Man. Mental and Social Condition of Savages. London 1870. (اڈیٹر۔)

ساتھ ساتھ انہیں جزیروں میں قرابت‌داری کا ایک ایسا سلسلہ پایا جاتا ہے جس کی توجیہہ صرف اس بات سے ہو سکتی ہے کہ پہلے وہاں گروہ‌وار شادی کی ایک اس سے بھی زیادہ ابتدائی شکل رائج تھی جو اب مٹ چکی ہے۔ مارگن نے جو مواد جمع کیا اور اس سے جو نتیجے نکالے، ان کو اس نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب «ہم‌خاندانی اور رشتہ داری کے نظام» * میں شائع کیا اور اس طرح بحث کے دائرے کو بے‌حد وسیع کر دیا۔ اس نے پہلے قرابت‌داری کے نظاموں کو لیا اور ان کی روشنی میں اور ان کے مطابق خاندان کی شکلوں کو نئے سرے سے مرتب کیا اور اس طرح انسان کے ماقبل تاریخی حالات کی چھان‌بین اور اس کے زیادہ گہرے مطالعہ کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اس طریقے کو صحیح مان لینے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میکلینن کے خوبصورت محل ہوا میں بکھر جاتے۔

میکلینن نے اپنی کتاب «قدیم شادی» («قدیم تاریخ کا مطالعہ»، ۱۸۷۶ء) کے ایک نئے اڈیشن میں اپنے نظریئے کی پرزور حمایت کی۔ حالانکہ اس نے خود نہایت مصنوعی طور پر محض فرضی باتوں کی بنیاد پر خاندان کی تاریخ مرتب کی ہے مگر لوباک اور مارگن سے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کے لئے ثبوت پیش کریں اور یہ ثبوت ایسے ہوں جن میں حجت کی گنجائش نہ ہو، جیسے ثبوت

* Morgan L. H., Systems of Consanguinity and Affinity of the Human Family. Washington, 1871. (اڈیٹر۔)

اسکاٹلینڈ کی عدالتوں میں مانے جائیں۔ اور یہ مطالبہ وہ آدمی کرتا ہے جو جرمنوں میں ایک شخص کی ماں کے بھائی اور بہن کے بیٹے کے درمیان قریبی تعلق ہونے کی بات سے (ٹیسی ٹس، «جرمنیا»، باب ۲۰)، سیزر کی، اس رپورٹ سے کہ بریٹون* لوگ دس بارہ کی تعداد میں مل کر مشترک بیویاں رکھتے تھے، اور بربری لوگوں میں مشترک بیویوں کے رواج کے بارے میں قدیم زمانہ کے مصنفوں کی تمام رپورٹوں سے، بلا کسی تامل کے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ان تمام لوگوں میں کثرت شوہری کا رواج تھا۔ اس کی باتوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی سرکاری وکیل اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے تو ہر طرح کی من مانی کرتا ہے لیکن مخالف فریق کے وکیل سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر لفظ کو ثابت کرنے کے لئے بالکل پکے اور قانونی طور سے بالکل صحیح ثبوت پیش کرے۔

اس کا دعوی ہے کہ گروہ وار شادی محض تخیل کی اڑان ہے اور اس طرح وہ باخوفن سے بھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مارگن نے جس چیز کو قرابت داری کے نظام سمجھا ہے، وہ شائستہ اور مہذب آداب مجلس کے متعلق احکام سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ریڈ انڈین لوگ اجنبیوں اور گورے آدمیوں سے بی «بھائی» یا «باپ» کہہ کر بات کرتے ہیں۔ یہ تو ویسی

---

* بریٹون۔ پانچویں اور چھٹی صدی میں اینگلو سیکسن تسلط سے پہلے بریٹون — برطانیہ کی کیلٹ آبادی کا نام تھا۔(اڈیٹر)۔

هی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ چونکہ کیتھولک پادریوں اور راہبہ عورتوں کو لوگ «فادر» (باپ) اور «مدر» (ماں) کہتے ہیں اور چونکہ راہب اور راہبہ عورتیں، اور یہاں تک کہ انگلینڈ میں فری میسن لوگ اور کرافٹ یونینوں کے ممبر بھی جلسوں میں ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے ہیں، اس لئے باپ، ماں، بھائی، بہن وغیرہ الفاظ محض القاب ہیں اور اس سے زیادہ ان کا کوئی مطلب نہیں ـ مختصر یہ کہ میکلینن کی دلیل بہت کمزور تھی ـ

لیکن ایک بات رہ گئی ہے جس پر کسی نے میکلینن کی تردید نہیں کی ـ گوت باہر شادی کرنے والے اور گوت اندر شادی کرنے والے «قبیلوں» میں اس نے جو تضاد قائم کیا تھا اور جس پر اس کا سارا ڈھانچہ کھڑا تھا، وہ ذرا بھی نہیں ہلا تھا ـ یہی نہیں بلکہ وہ اب بھی خاندان کی پوری تاریخ کا محور مانا جاتا تھا ـ لوگ یہ مانتے تھے کہ میکلینن نے اس تضاد کی وضاحت کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکافی تھی اور اس سے خود ان واقعات کی تردید ہوتی تھی جن کو میکلینن نے پیش کیا تھا ـ لیکن خود اس تضاد کو، اس خیال کو کہ دو بالکل علیحدہ اور خودمختار قسم کے قبیلے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک طرح کے قبیلوں کے مرد اپنے قبیلے کے اندر کی ہی عورتوں سے شادی کرتے ہیں مگر دوسری طرح کے قبیلوں میں اس طرح کی شادی کی بالکل ممانعت ہوتی ہے ــ ان باتوں کو لوگ الہامی کتابوں کی طرح ناقابل انکار صداقت سمجھتے تھے ـ مثال کے طور پر

ژیرا تیولوں کی کتاب «خاندان کا آغاز» (۱۸۷٤ء)* اور خود لوباک کی کتاب «تہذیب کا آغاز» (چوتھا اڈیشن، ۱۸۸۲ء) کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں مارگن کی خاص تصنیف «قدیم سماج» (۱۸۷۷ء) بحث میں شامل ہوتی ہے۔ میری یہ کتاب اسی کتاب پر مبنی ہے۔ جن باتوں کو ۱۸۷۱ ء میں مارگن نے نہایت مبہم طریقے سے محسوس کیا تھا، یہاں ان کو پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ مارگن کہتا ہے کہ گوت اندر شادی کرنے اور گوت باہر شادی کرنے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی «قبیلہ» نہیں ملا ہے جس میں صرف گوت باہر ہی شادی کرنے کا رواج ہو۔ لیکن جس زمانہ میں گروہ وار شادی کا رواج تھا — اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ کسی نہ کسی زمانہ میں اس کا رواج ہر جگہ تھا — تب قبیلے کے اندر کئی گروہ ایسے ہؤا کرتے تھے جن میں ایک دوسرے سے ماں کی طرف سے خون کا رشتہ ہوتا تھا۔ یہ گروہ گن کہلاتے تھے اور ان کے اندر شادی کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ اس لئے کسی بھی گن کے مرد قبیلے کے اندر ہی اپنے لئے بیویاں حاصل کر سکتے تھے اور عام طور پر وہ یہی کرتے تھے، مگر انہیں اپنے گن کے باہر ہی بیویاں حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اس طرح جبکہ گن، سختی سے گوت

* Giraud-Teulon A, Les origines de la famille. Genève, Paris 1874— (اڈیٹر—)

باھر شادی کرنے کے اصول پر عمل کرتا تھا، تب قبیلہ جس میں تمام گن شامل ھوتے تھے، اتنی ھی سختی سے، گوت اندر شادی کرنے کے اصول پر عمل کرتا تھا۔ میکلینن نے بناوٹی ڈھنگ سے جو محل کھڑا کیا تھا، اس کے آخری کھنڈر بھی اس کی تاب نہ لاکر زمین پر آ رھے۔

لیکن مارگن کو اس سے ھی اطمینان نہیں ھؤا۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کا گن اس کے لئے ایک ذریعہ بن گیا جس کی مدد سے اس نے تحقیق کے اس شعبہ میں، جس میں اب وہ داخل ھو رھا تھا، دوسرا فیصلہ‌کن قدم اٹھایا۔ مادری حق کی بنیاد پر منظم شدہ گن میں اس نے گنوں کی ابتدائی شکل دریافت کی جس سے بعد والے وہ گن پیدا ھوئے جو پدری حق کی بنیاد پر منظم ھوئے — جنھیں ھم قدیم زمانہ کی مہذب قوموں میں پاتے ھیں۔ اس طرح یونانی اور رومی گن جو اس کے پہلے کے سبھی مورخوں کے لئے پہیلی بنے ھوئے تھے، امریکہ کے آدی باسیوں میں پائے جانے والے گن کی روشنی میں سمجھہ میں آ گئے اور قدیم سماج کی پوری تاریخ کے لئے ایک نئی بنیاد پڑ گئی۔

ابتدائی مادری حق والے گن کے بارے میں یہ نئی بات معلوم ھوئی تھی کہ وہ پدری حق والے گنوں سے، جو مہذب قوموں میں پائے جاتے ھیں، پہلے کی منزل ھیں۔ قدیم سماج کی تاریخ میں اس نئی دریافت کی وھی اھمیت ھے جو علم حیات کے لئے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی اور علم اقتصادیات کے لئے مارکس کے قدر زائد کے نظریہ کی۔ اس سے مارگن

پہلی مرتبہ خاندان کی تاریخ کی ایک ایسی روپ ریکھا تیار
کرنے میں کامیاب ہؤا جس میں ارتقا کی کم از کم بنیادی
منزلوں کو مجموعی حیثیت سے عارضی طور پر، اور اس وقت
تک جتنا مواد مل سکا تھا اس کو دیکھتے ہوئے جس حد
تک ممکن تھا، اس حد تک متعین کر دیا گیا تھا ۔ ظاہر
ہے اس سے قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعہ میں ایک نئے
دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اب مادری حق والا گن وہ محور ہے
جس کے گرد یہ پورا علم گھومتا ہے ۔ اس کا پتہ لگنے کے
بعد اب ہمیں معلوم ہے کہ ہماری تحقیق کے کام کا رخ کیا
ہو، کس چیز کی چھان بین کی جائے اور اس چھان بین کے
نتیجوں کو کس طرح ترتیب دیا جائے ۔ چنانچہ مارگن کی
کتاب کے شائع ہونے کے بعد، پہلے کے مقابلہ میں اس شعبہ
میں بہت تیزی سے ترقی ہو رہی ہے ۔

مارگن نے جن باتوں کا پتہ لگایا ہے، انہیں اب انگلینڈ
کے ماقبل تاریخی عہد کے مورخ بھی ماننے لگے ہیں یا یوں
کہئے کہ انہوں نے چپ چاپ ان تمام باتوں کو اپنا لیا ہے ۔
لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی یہ ماننے پر تیار ہو کہ
ہمارے نقطۂ نظر میں جو انقلاب ہؤا ہے، اس کا سہرا مارگن
کے سر ہے ۔ انگلینڈ میں اس کی کتاب کے بارے میں جہاں
تک ہو سکتا ہے لوگ چپ سادھے رہتے ہیں اور خود مارگن
کو بڑی سرپرستی کے انداز میں اس کی پرانی کتابوں کی
تعریف کرکے نبٹا دیا جاتا ہے ۔ اس کی چھوٹی چھوٹی
باتوں پر چن چن کر تنقید کی جاتی ہے اور دراصل جو اس

کی عظیم دریافتیں ہیں ان پر خاموشی کی ایسی مہر لگا دی جاتی ہے جو کبھی ٹوٹنے میں نہیں آتی۔ «قدیم سماج» کا پرانا اڈیشن اب نایاب ہے۔ امریکہ میں اس طرح کی کتابیں چھاپنے میں کوئی نفع نہیں ہے۔ انگلینڈ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارگن کی کتاب کو باقاعدہ جان بوجھ کر دبایا گیا ہے۔ اور اس عہد آفریں کتاب کا واحد اڈیشن جو اس وقت بازار میں مل سکتا ہے، وہ جرمن زبان میں ہے۔

ہمارے ماقبل تاریخی عہد کے مانے ہوئے مورخوں کی اس سردمہری کا کیا سبب ہے؟ اس سردمہری کو ایک سازش کا نتیجہ نہ سمجھنا بہت مشکل ہے — خاص طور پر اس لئے کہ یہ حضرات محض تکلفاً اور اخلاقاً مارگن کی کتابوں سے ان گنت اقتباس اپنی کتابوں میں شامل کرتے ہیں اور طرح طرح سے بھائی چارے کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مارگن امریکی ہے اور ماقبل تاریخی عہد کے انگریز مورخوں کو یہ ماننے میں دقت ہوتی ہے کہ مواد جمع کرنے میں ان کی نہایت قابل تعریف محنت کے باوجود، عام نقطۂ نظر کے لئے، جس پر اس مواد کی ترتیب اور تدوین کا انحصار ہے، انہیں دو بڑے غیرملکی عالموں، باخوفن اور مارگن کا سہارا لینا پڑتا ہے؟ جرمن کو تو وہ کسی طرح برداشت بھی کر سکتے ہیں لیکن امریکی کو کیسے گوارا کر سکتے ہیں؟ کسی امریکی کو دیکھ کر ہر انگریز کو حب الوطنی کا دورہ ہونے لگتا ہے۔ میں جن دنوں امریکہ میں تھا تو مجھے اس کی نہایت مضحکہ خیز مثالیں دیکھنے

کو ملیں ۔ اس کے ساتھہ ایک بات اور ھے ۔ میکلینن کو ایک طرح سے سرکاری طور پر انگلستان کی ماقبل تاریخی تحقیقات کا بانی اور رھنما مان لیا گیا تھا ۔ اور ماقبل تاریخی عہد کے مورخوں میں یہ اخلاق اور شائستگی کا تقاضا سمجھا جاتا تھا کہ میکلینن نے تاریخی نظریہ کی جو بناوٹی عمارت کھڑی کی تھی، اس کا تذکرہ نہایت احترام سے کیا جائے ۔ یہ نظریہ بچوں کے قتل سے لےکر کثرت شوھری، اغوا کے ذریعہ شادی اور مادری حق کے خاندان تک حاوی ھے ۔ ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مختلف، دو قسم کے «قبیلوں»، یعنی گوت باھر شادی کرنے والے اور گوت اندر شادی کرنے والے «قبیلوں» کے بارے میں ذرا سا بھی شک ظاھر کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس لئے جب مارگن نے ان سبھی مقدس خیالات کی جڑ کاٹ دی تو گویا اس نے بہت بڑا گناہ کیا ۔ اور پھر مارگن نے اس مسئلہ کو اس طرح سلجھایا کہ اس کے بارے میں بات کہتے ھی پوری چیز فوراً صاف ھو گئی ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ میکلینن کے وہ پرستار جو ابھی تک اندھوں کی طرح گوت باھر شادی کرنے اور گوت اندر شادی کرنے کے رواجوں کے بیچ میں بھٹک رھے تھے، اب اپنا سر پیٹنے لگے اور چلانے لگے کہ ھم بھی کیسے احمق ھیں کہ اتنی ذرا سی بات کا اتنے دنوں تک خود پتہ نہیں لگا سکے ۔

مارگن کا یہ قصور اس کے لئے کافی تھا کہ سرکاری علما اس کو سردمہری سے نظرانداز کر دیں ۔ لیکن مارگن نے اتنے ھی پر قناعت نہیں کی ۔ اس نے ان کی تلخیوں کا

پیالہ لبریز کر دیا۔ اس نے تہذیب کو، جنس تبادلہ پیدا کرنے والے سماج کو، جو ہمارے موجودہ سماج کی بنیادی صورت ہے، اپنی تنقید کا اس طرح ہدف بنایا جس سے فورئیے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا، اس نے سماج کی آئندہ تبدیلیوں کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا جنہیں کارل مارکس استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے جیسا کیا ویسا پایا۔ میکلینن نے نہایت غصہ میں اس پر یہ الزام لگایا کہ «تاریخی طریقہ سے اس کو عداوت ہے» اور پروفسر ژیرا تیولوں نے جینیوا میں ۱۸۸٤ء میں اس رائے کی حمایت کی۔ کیا یہی وہ موسیو ژیرا تیولوں نہیں تھے جو ۱۸۷٤ء میں (اپنی کتاب «خاندان کا آغاز» میں) میکلینن کے گوت باہر شادی کرنے کے رواج کے گورکھہ دھندے میں بھٹک رہے تھے اور جنہیں مارگن نے ہی اس سے نجات دلائی تھی؟

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم سماج کی تاریخ نے مارگن کی تحقیقات کی بدولت اور کون سی باتوں میں ترقی کی۔ اس کتاب کے دوران میں جہاں کہیں اس کی ضرورت ہوگی تذکرہ کیا جائےگا۔ مارگن کی اہم تصنیف کو شائع ہوئے چودہ برس کا عرصہ گذر گیا۔ اس دوران میں قدیم انسانی سماج کے بارے میں ہمارے پاس بہت سا نیا مواد جمع ہو گیا ہے۔ علم‌الانسان کے عالموں، سیاحوں اور ماقبل تاریخ کے ماہروں کے علاوہ تقابلی قانون کے طالب علموں نے بھی اس شعبہ میں نئے مواد اور نقطۂ ہائے نظر کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ کچھہ خاص باتوں

کے متعلق مارگن کے بعض مفروضے کمزور پڑ گئے ہیں اور کہیں کہیں بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن کہیں بھی نئے مواد نے اس کے بنیادی خیالات کو بدل کر ان کی جگہ نئے تصورات قائم نہیں کئے ہیں۔ قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعہ میں مارگن نے جو ترتیب قائم کی تھی وہ بنیادی طور پر آج بھی صحیح ہے۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے بانی کا نام چھپانے کی جتنی ہی کوشش کی جاتی ہے، اس کی بتائی ہوئی بنیادی باتوں کو لوگ اتنا ہی روز بروز مانتے جاتے ہیں * ۔

فریڈرک اینگلس ۱۶ جون، ۱۸۹۱ء، لندن

---

* ستمبر ۱۸۸۸ء میں نیویارک سے واپسی کے وقت میری ملاقات امریکی کانگرس کے ایک سابق ممبر سے ہوئی جو راچسٹر کے حلقہ سے چنے گئے تھے۔ وہ لیوئس مارگن کو جانتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ مجھے مارگن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکے۔ انہوں نے بتایا کہ مارگن راچسٹر میں خانگی زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنے پڑھنے لکھنے کے علاوہ اسے اور چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا بھائی فوج میں کرنل تھا اور واشنگٹن میں جنگی محکمہ میں کسی عہدہ پر تھا۔ اپنے بھائی کی مدد سے مارگن نے حکومت کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی تحقیقات میں دلچسپی لے اور اس کی کتابوں کو سرکاری خرچ سے چھاپے۔ کانگرس کے ان سابق ممبر کا کہنا تھا کہ جب تک وہ کانگرس کے ممبر تھے خود انہوں نے بھی مارگن کی مدد کی تھی۔ (نوٹ از اینگلس۔)

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

ا

تہذیب کے ماقبل تاریخی ادوار

مارگن پہلا شخص تھا جس نے ماہرفن کی گہری واقفیت کے ساتھہ انسان کے ماقبل تاریخی دور میں ایک مخصوص نظم و ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوائے اس صورت کے جبکہ مزید اہم مواد ملنے کی وجہ سے تبدیلیاں کرنا ضروری ہو جائے، امید کی جا سکتی ہے کہ اس نے جو درجہ بندی کی ہے وہ قائم رہے گی۔

عہد وحشت، عہد بربریت اور عہد تہذیب، ان تین خاص عہدوں میں قدرتاً مارگن کا تعلق محض پہلے دو سے اور اس عبوری دور سے ہے جو تیسرے عہد کی طرف لے جاتا ہے۔ ان دو عہدوں میں سے ہر عہد کو وہ ذرائع زندگی کی پیداوار کی نشو و نما کے مطابق ابتدائی، درمیانی اور آخری ادوار میں تقسیم کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ مارگن کا کہنا ہے: «کرۂ ارض پر انسان کی ساری برتری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ذرائع زندگی کی پیداوار میں اس نے کتنی مہارت حاصل کی ہے۔ انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس

کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے غذا کی پیداوار پر پوری قدرت حاصل کر لی ہے۔ انسانی ترقی کی بڑی منزلوں کا کم و بیش براہ راست تعلق ذرائع زندگی کے وسیلوں کی توسیع کے ساتھہ ہے۔» خاندان کا ارتقا بھی اس کے ساتھہ ساتھہ ہوتا ہے لیکن اس میں ہمیں ایسی کوئی قطعی بنیاد نہیں ملتی جس سے مختلف ادوار کی حدبندی کی جا سکے۔

(۱) عہدِ وحشت

۱ ـ ابتدائی دور ـ یہ نسل انسانی کے بچپن کا دور ہے۔ انسان ابھی تک اپنے ابتدائی مسکن یعنی گرم یا نیم‌گرم علاقوں کے جنگلوں میں رہتا تھا اور کم از کم ایک حد تک درختوں پر بسیرا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے دنوں تک بڑے بڑے شکاری جانوروں اور درندوں سے بچا رہا۔ پھل، گری‌دار میوے اور جڑیں، یہی اس کی غذا تھی۔ اس دور میں اس کا اصلی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بولنا سیکھا۔ تاریخی زمانہ میں ہمیں جن لوگوں کا حال ملتا ہے ان میں سے کوئی بھی اس قدیم حالت میں نہیں تھا۔ اگرچہ یہ زمانہ ہزاروں برس تک رہا ہوگا پھر بھی اس کا کوئی براہ راست ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن جب ایک بار ہم یہ مان لیتے ہیں کہ انسان عالم حیوانی سے پیدا ہوا ہے تو پھر اس عبوری دور کو بھی ماننا ضروری ہے۔

۲ - درمیانی دور - اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب مچھلی (جس میں کیکڑے، گھونگھے اور دوسرے دریائی جانوروں کو بھی شامل کرتے ہیں) غذا میں کام آنے لگی اور آگ کا استعمال ہونے لگا - یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ مچھلی آگ کے استعمال کے بعد ہی اچھی طرح کھانے کے کام آ سکتی ہے - اس نئی غذا نے انسان کو موسم اور مقام کی قید سے آزاد کر دیا - دریاؤں اور ساحلوں کے ساتھہ ساتھہ چل‌کر انسان اپنی اس وحشت کی حالت میں بھی کرۂ زمین کے بڑے حصہ پر پھیل گیا - ابتدائی پتھر کے دور کے بےڈھنگے، کھردرے پتھر کے اوزار — جن کو عہد حجرقدیم کے اوزار کہتے ہیں — جو سبْ کے سب یا زیادہ‌تر اسی دور کے ہیں اور سبھی براعظموں میں بکھرے پڑے ہیں، انسان کی اس نقل و حرکت کا ثبوت ہیں - نئے نئے علاقوں میں جاکر بسنے، برابر نئی چیزوں کی تلاش کی دھن میں لگے رہنے اور اب اس کے ساتھہ رگڑ سے آگ جلانے کے فن پر قدرت پا لینے سے انسان کو کھانے کی نئی نئی چیزیں ملتی رہیں، جیسے غذائی جڑیں اور گنٹھیاں جو گرم راکھہ میں یا زمین میں کھدی ہوئی آگ کی بھٹیوں میں پکا لی جاتی تھیں، اور ابتدائی ہتھیاروں یعنی لاٹھی اور بھالے کی ایجاد کے بعد شکار میں مارے ہوئے جانور بھی غذا میں شامل کئے جانے لگے - محض شکاری قومیں جن کا اکثر کتابوں میں ذکر آتا ہے یعنی ایسی قومیں جو محض شکار پر گذارہ کرتی ہوں، کبھی نہیں رہیں - شکار کا نتیجہ

اتنا غیریقینی ہوتا ہے کہ محض اس کے سہارے زندگی گذارنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کھانے کی چیزوں کا ملنا اب بھی نہایت غیریقینی تھا جس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں آدم خوری کا رواج شروع ہوُا اور بہت دنوں تک جاری رہا۔ آسٹریلیا کے باشندے اور بہت سے پالینیزین آج بھی وحشت کے اس درمیانی دور میں ہیں۔

۳۔ آخری دور۔ اس کی ابتدا تیر کمان کی ایجاد سے ہوئی جس کی وجہ سے جنگلی جانوروں کا گوشت غذا کا باقاعدہ جزو بن گیا اور شکار کا عام رواج ہو گیا۔ تیر، کمان اور اس کی تانت ایک پیچیدہ ہتھیار ہے جس کو ایجاد کرنے کے لئے بہت دنوں کے تجربے، تیزی اور ذہانت کی ضرورت تھی اور اسی لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ساتھ بہت سی دوسری ایجادوں سے بھی واقفیت ہو۔ اگر ہم اِن قوموں کا موازنہ ان سے کریں جو اگرچہ تیر اور کمان سے تو واقف تھیں مگر برتن بنانا نہیں جانتی تھیں (مٹی کے برتن بنانے کے فن سے مارگن کی رائے میں عہد بربریت کی طرف تغیر کی ابتدا ہوتی ہے) تو ہم دیکھیں گے کہ اس ابتدائی دور میں بھی لوگ گاؤں میں بسنے لگے ہیں، ذرائع زندگی کی پیدائش پر کسی حد تک قدرت حاصل ہو چکی ہے، لکڑی کے برتن بھانڈے بنائے جاتے ہیں، انگلیوں سے (کرگھے کے بغیر) درختوں کی چھال کے ریشوں سے طرح طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ درخت کی چھال اور بید کی ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ اور پتھر (حجر جدید) کے پالش کئے ہوئے

چکنے اوزار بنائے جاتے ھیں ۔ پھر بڑی حد تک آگ اور پتھر کی کلھاڑی کی مدد سے درخت کا تنا کھودکر ناؤ اور ڈونگی تیار ھونے لگی اور کہیں کہیں مکان بنانے کی لکڑی اور تختے بھی کاٹے جانے لگے تھے ۔ مثال کے طور پر شمال مغربی امریکہ کے انڈینوں میں یہ سبھی چیزیں پائی جاتی ھیں ۔ وہ تیر کمان سے تو واقف ھیں مگر برتن بنانا بالکل نہیں جانتے ۔ تیر کمان عہد وحشت میں وھی حیثیت رکھتے ھیں جو عہد بربریت میں لوھے کی تلوار اور عہد تہذیب میں بارود کے ھتھیار یعنی توپ بندوق، یعنی وہ فیصلہ کن ھتھیار ھیں ۔

(۲) عہدِ بربریّت

۱ ۔ ابتدائی دور ۔ اس کی ابتدا مٹی کے برتن بنانے سے ھوئی ۔ اس فن کی ابتدا بعض جگہوں میں یقیناً اور شاید سبھی جگہوں میں اس طرح ھوئی کہ ٹوکریوں یا لکڑی کے برتنوں کو آگ سے بچانے کے لئے ان پر مٹی کا لیپ چڑھایا جانے لگا ۔ اس طرح جلد ھی یہ اندازہ ھو گیا کہ اندر کا برتن نکال لینے پر بھی مٹی کے سانچے سے کام چل سکتا ھے ۔

اس نقطہ تک ھم مان سکتے تھے کہ ایک خاص زمانہ تک سبھی قوموں میں خواہ وہ کسی مقام سے تعلق رکھتی ھوں، ارتقا کا راستہ ایک ھی ھے ۔ لیکن بربریت کے ساتھ ھم ایک ایسے دور میں داخل ھوتے ھیں جس میں دو بڑے براعظموں کی قدرتی خصوصیتوں کا فرق اپنا اثر دکھانے لگتا ھے ۔

عہد بربریت کی نمایاں خصوصیت جانور پالنا، ان کی نسل بڑھانا اور پودوں کی کاشت کرنا ہے۔ اب جہاں تک مشرقی براعظم یعنی دنیائے قدیم کا تعلق ہے، یہاں پالنے کے قابل تقریباً سبھی جانور اور ایک کو چھوڑ کر کاشت کے قابل سبھی اناج موجود تھے۔ جبکہ مغربی براعظم یعنی امریکہ میں پالنے کے قابل ایک ہی دودھ پلانے والا جانور تھا جسے لاما کہتے ہیں اور جو صرف جنوب کے ایک حصہ میں پایا جاتا ہے، اور کاشت کے قابل صرف ایک اناج ـــ مکا ـــ تھا مگر وہ تھا سب سے اچھا۔ قدرتی حالات کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہؤا کہ اس زمانہ سے دونوں نیم کرۂ ارض کے باشندے الگ الگ اپنی ڈگر پر چلنے لگے اور ارتقا کے مختلف ادوار کے بیچ کی حد فاصل دونوں جگہ اپنی الگ الگ خصوصیتوں کی حامل ہو گئی۔

۲ ـ درمیانی دور ـ اس کی ابتدا مشرق میں جانور پالنے سے اور مغرب میں آبپاشی کے ذریعہ غذائی پودوں کی کاشت کرنے اور مکان بنانے کے لئے ادوب (دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں) اور پتھر کے استعمال سے ہوتی ہے۔

پہلے ہم مغرب کو لیں گے کیونکہ امریکہ پر یورپ والوں کی فتح کے وقت تک وہاں کے لوگ کہیں بھی اس دور سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

امریکہ میں رہنے والے انڈینوں کا جب پتہ چلا تو اس وقت وہ عہد بربریت کے ابتدائی دور میں تھے (مسی سپی کے مشرق میں رہنے والے سبھی انڈین اسی دور سے گذر رہے

تھے)۔ اس وقت وہ کسی حد تک مکئی اور شاید لوکی، تربوز اور دوسرے پھلوں کی بھی کاشت کرنے لگے تھے۔ اسی سے انہیں اپنی غذا کا بڑا حصہ ملتا تھا۔ یہ لوگ باڑوں سے گھرے ہوئے گاؤں میں لکڑی کے مکانوں میں رہا کرتے تھے۔ شمال مغرب کے قبیلے، خاص کر وہ جو دریائے کولمبیا کے علاقوں میں رہتے تھے، اس وقت بھی عہد وحشت کے آخری دور میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ برتن بنانا جانتے تھے اور نہ کاشت کرنا۔ دوسری طرف نیو میکسیکو کے پوئبلو انڈین کہلانےوالے لوگ، میکسیکی لوگ، وسطی امریکہ اور پیرو کے باشندے، فتح امریکہ کے وقت عہد بربریت کے درمیانی دور میں تھے۔ وہ لوگ دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں یا پتھر کے قلعہ نما مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ ان باغوں میں جن میں مصنوعی ذرائع سے آبپاشی ہوتی تھی، مکئی کی اور موسم اور جگہ کے مطابق اور دوسرے اناجوں کی کاشت کرتے تھے۔ یہی ان کی غذا کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ انہوں نے کچھ جانور بھی پال رکھے تھے — میکسیکو کے باشندوں نے فیل مرغ اور دوسرے پرند پال رکھے تھے، اور پیرو کے باشندوں نے لاما۔ اس کے علاوہ وہ کئی دھاتوں کے استعمال سے واقف تھے مگر لوہے کا استعمال بالکل نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ پتھر کے ہتھیاروں اور اوزاروں سے بےنیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ اسپین والوں نے ان کے ملک کو فتح کرنے کے بعد ان کی آزاد نشو و نما کا سلسلہ روک دیا۔

مشرق میں بربریت کے درمیانی دور کی ابتدا ان جانوروں کے پالنے سے ہوئی جو دودھ دیتے تھے اور جن کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس دور میں بہت دنوں تک پودوں کی کھیتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ مویشی پالنے اور جانوروں کے بڑے بڑے جھنڈ اور ریوڑ بنانے کی وجہ سے ہی آریا اور سامی لوگ عہد بربریت کے باقی لوگوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ یورپ اور ایشیا کے آریوں میں مویشیوں کے نام آج بھی مشترک ہیں لیکن قابل کاشت پودوں کے نام نہیں ملتے۔

عمدہ اور مناسب جگہوں میں جانوروں کے ریوڑ اور جھنڈ بننے سے گلہ بانی کی زندگی کا آغاز ہؤا، سامیوں میں دجلہ اور فرات کے مرغزاروں میں اور آریوں میں ہندوستان کے میدانوں اور آمو دریا اور سیر دریا اور ڈان اور دنیپر کی وادیوں میں۔ مویشی پالنا غالباً انہیں چراگاہوں کی سرحدوں پر شروع ہؤا ہوگا۔ اسی لئے بعد میں آنے والی نسلوں کو ایسا معلوم ہؤا کہ گلہ‌بانی کرنے والی قوموں کا آغاز انہیں جگہوں میں ہؤا ہوگا حالانکہ دراصل یہ علاقے ایسے تھے جو انسانیت کا گہوارہ ہونا تو دور کی بات رہی، ان کے وحشی آباؤاجداد کے لئے اور عہد بربریت کے ابتدائی دور کے لوگوں کے لئے بھی گویا بالکل ناقابل رہائش تھے۔ دوسری طرف یہ بات تھی کہ عہد بربریت کے درمیانی دور کے لوگ ایک بار گلہ بانی کی زندگی اختیار کر لینے کے بعد یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے ان ہرے بھرے سیراب

میدانوں اور چراگاھوں کو چھوڑکر ان جنگلوں میں لوٹ
جائیں جہاں ان کے آباؤاجداد رھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ
جب آریوں اور سامی لوگوں کو اور بھی شمال اور مغرب
کی طرف بڑھنے پر مجبور ھونا پڑا تب بھی مغربی ایشیا
اور یورپ کے جنگلی علاقوں میں بسنا ان کے لئیے ممکن نہیں
ھؤا۔ وھاں وہ صرف اسی وقت آباد ھو سکے جب انہوں نے
اناج کی کھیتی سے ایسی حالت پیدا کر لی کہ ان ناموافق
علاقوں میں بھی اپنے مویشیوں کے لئیے چارہ فراھم کر سکیں
اور خاص کر جاڑوں میں گذارہ کر سکیں۔ بات قرین قیاس
معلوم ھوتی ھے کہ ان لوگوں نے اناج کی کھیتی پہلے پہل
مویشیوں کو کھلانے کے لئیے شروع کی تھی اور انسان کی
خوراک کے لئیے اس کو اھمیت بعد میں حاصل ھوئی۔

آریوں اور سامیوں کو گوشت اور دودھ بہ افراط ملتا
تھا۔ بچوں کی نشو و نما پر ان غذاؤں کا بہت مفید اثر پڑتا
ھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نسلوں نے اوروں سے
زیادہ ترقی کی۔ سچ پوچھئے تو نیومیکسیکو کے پوئبلو انڈین
جن کی غذا صرف ساگ ترکاری رہ گئی ھے ان انڈینوں کے
مقابلہ میں چھوٹے دماغ کے ھوتے ھیں جو بربریت کے ابتدائی
دور میں ھیں اور خوب گوشت اور مچھلی کھاتے ھیں۔
بہر حال، اس دور میں آدم خوری رفتہ رفتہ بند ھو گئی اور اگر
کہیں باقی بھی رھی تو محض ایک مذھبی رسم کی حیثیت
سے یا جادو ٹونے کی شکل میں۔ اور اس دور میں یہ دونوں
قریب قریب ایک ھی چیز ھیں۔

۳- آخری دور- اس کی ابتدا اس زمانے سے ہوئی جب کچے لوہے کو پگھلاکر صاف کیا جانے لگا، اور جب حروف تہجی کے لکھنے کا فن ایجاد ہؤا اور ادبی تحریروں میں اس سے کام لیا جانے لگا تو رفتہ رفتہ یہ دور ختم ہوکر تہذیب کے عہد میں مل گیا- جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اس دور کو آزادی کے ساتھہ صرف مشرقی نیم کرہ کے لوگ ہی پورا کر سکے- اس دور میں پیداوار میں جتنی ترقی ہوئی اتنی پہلے کے تمام ادوار میں کل ملا کر بھی نہیں ہوئی تھی- سورمائی عہد کے یونانی، روم کی تعمیر سے کچھہ پہلے کے اطالوی قبیلے، ٹیسی ٹس کے زمانہ کے جرمن اور وائیکنگ کے زمانہ کے نارمن اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں-

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسی دور میں ہمیں پہلے پہل لوہے کے ہل ملتے ہیں جنہیں جانور چلایا کرتے تھے- اسی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر کھیتی کرنا- کاشت کاری- ممکن ہو سکی- اور اس زمانہ کے نقطۂ نظر سے ذرائع زندگی میں لامحدود اضافہ ہؤا- جنگل صاف کئے گئے- کھیت اور چراگاہیں بنائی گئیں- اور یہ کام لوہے کی کلہاڑی اور پھاوڑے کے بغیر بڑے پیمانے پر نہیں کیا جا سکتا تھا- اسی کے ساتھہ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہؤا- چھوٹے چھوٹے علاقوں میں گنجان بستیاں بس گئیں- کاشتکاری سے پہلے صرف بہت ہی مخصوص حالات پانچ لاکھہ آدمیوں کو ایک مرکزی رہنمائی کے تحت لا سکتے تھے- زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہؤا تھا-

ہومر کی نظموں خصوصاً «ایلیڈ» میں ہمیں بربریت کا آخری دور اپنے عروج پر ملتا ہے۔ لوہے کے اچھے اوزار، دھونکنی، ہاتھ سے چلنے والی چکی، کمہار کا چاک، تیل نکالنا اور شراب بنانا، دھاتوں کے صاف کرنے کا ترقی کرکے فن کی حیثیت اختیار کرنا، گاڑی اور جنگی رتھ، تختوں اور کڑیوں سے پانی میں چلنےوالے جہاز بنانا، فن‌تعمیر کی ابتدا، فصیلوں سے گھرے ہوئے شہر جن میں مینار اور فصیل نما دیواریں ہوتی تھیں، ہومر کی رزمیہ نظمیں اور پوری دیومالا — یہ ہے وہ اہم‌ترین وراثت جس کو لےکر یونانیوں نے بربریت سے تہذیب کے عہد میں قدم رکھا۔ اب ذرا اس کے مقابلہ میں ہم ان جرمنوں کو دیکھیں جن کی تصویر سیزر اور خود ٹیسی‌ٹس نے کھینچی ہے۔ وہ تمدن کی اس منزل کی دہلیز پر کھڑے تھے جہاں سے آگے بڑھ‌کر ہومر کے زمانہ کے یونانی ایک زیادہ اونچی منزل میں داخل ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دونوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ بربریت کے آخری دور میں پیداوار نے بہت ترقی کر لی تھی۔

مارگن کے خاکہ کے مطابق وحشت اور بربریت سے ہوتے ہوئے تہذیب کی ابتدائی منزلوں تک انسانی ارتقا کی جو تصویر میں نے کھینچی ہے، اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں۔ یہ باتیں ناقابل‌تردید بھی ہیں کیونکہ انہیں براہ‌راست پیداوار سے لیا گیا ہے۔ پھر بھی ہماری داستان کے ختم ہونے تک اس تصویر کے جو نقوش ابھریں گے ان کے مقابلہ

میں یہ رنگ بہت ہلکے اور پھیکے ہیں۔ صرف اسی وقت
یہ ممکن ہوگا کہ بربریت سے تہذیب تک کے تغیرات کی
پوری تصویر اور دونوں کے نمایاں فرق کو پیش کیا جائے۔
فی‌الحال مارگن نے ادوار کو جس طرح تقسیم کیا ہے، اسے
عام لفظوں میں ہم یوں پیش کر سکتے ہیں: عہد وحشت
جس میں انسان قدرت کے خزانے سے زیادہ‌تر وہی چیزیں
لیتا تھا جو کھانے پینے کے لئے تیار ملتی تھیں۔ انسان خود
زیادہ‌تر ایسے اوزار تیار کرتا تھا جن سے ان چیزوں کو
لینے میں آسانی ہو۔ عہد بربریت جس میں انسان نے مویشی
پالنا اور کھیتی کرنا یعنی اپنی محنت سے قدرت کی زرخیزی
کو بڑھانے کا طریقہ سیکھا۔ تہذیب کا عہد جس میں انسان
نے قدرت کی نعمتوں سے مزید کام لینا سیکھا اور
صنعت و حرفت اور فنون کی واقفیت حاصل کی۔

۲

خاندان

مارگن نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایراکواس لوگوں میں گذارا، جو آج بھی ریاست نیویارک میں بسے ہوئے ہیں۔ انہیں کے ایک قبیلے (سنیکا) نے اسے اپنا لیا تھا۔ مارگن نے ایک عجیب و غریب چیز یہ دیکھی کہ ان لوگوں میں قرابت داری کا جو نظام قائم ہے اس میں اور ان کے اصلی خاندانی تعلقات میں تضاد ہے۔ ان میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ ایک ایک جوڑا آپس میں شادی کرتا تھا اور فریقین میں سے کوئی بھی آسانی کے ساتھ اس رشتہ کو توڑ سکتا تھا۔ مارگن اس کو «جوڑا خاندان» کہتا تھا۔ ایسے شادی شدہ جوڑے کی اولاد کو سبھی جانتے اور مانتے تھے اور کسی کو اس میں شبہہ نہیں ہو سکتا تھا کہ باپ، ماں، بیٹا، بیٹی، بھائی اور بہن کس کو کہا جائے۔ لیکن حقیقت میں ان اصطلاحوں کا استعمال بالکل الٹے ڈھنگ سے ہوتا تھا۔ ایراکواس لوگ صرف اپنی ہی اولاد کو نہیں بلکہ اپنے بھائیوں کی اولاد کو بھی بیٹا بیٹی کہتے اور وہ انہیں باپ کہتے تھے۔ اس کے

برعکس بہن کی اولاد کو وہ بھانجا بھانجی کہتے اور وہ
انہیں ماموں پکارتی تھی۔ دوسری طرف ایراکواس عورتیں
اپنی اولاد کے ساتھہ ساتھہ اپنی بہن کی اولاد کو بیٹا بیٹی
کہتیں اور وہ انہیں ماں کہتی۔ اس کے برعکس بھائی کی
اولاد کو وہ بھتیجا بھتیجی کہتیں اور وہ انہیں پھوپھی
کہتی۔ بھائیوں کی اولاد آپس میں ایک دوسرے کو بھائی
بہن کہا کرتی اور اسی طرح بہنوں کی اولاد بھی ایک
دوسرے کو یہی کہتی۔ لیکن اس کے برعکس ایک عورت
اور اس کے بھائی کی اولاد ایک دوسرے کو میرے پھوپھیرے
بھائی یا بہن کہہ‌کر پکارتی۔ اور یہ محض کوری اصطلاحیں
نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے خون کے رشتوں کی قربت،
ان کے ہم جد ہونے اور ان کی برابری اور نابرابری کے خیالات
کام کر رہے ہیں اور یہ خیالات قرابت‌داری کے ایک مکمل
نظام کی بنیاد کا کام دیتے ہیں جس میں ایک ایک شخص
کے سینکڑوں مختلف رشتوں کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس
کے علاوہ، یہ نظام نہ صرف امریکہ کے تمام انڈینوں میں پایا
جاتا ہے (جن میں ابھی تک کوئی اس سے مستثنی نہیں ملا)
بلکہ اس کا رواج جوں کا توں، بلا کسی تبدیلی کے ہندوستان
کے قدیم باشندوں میں، دکن کے دراوڑی اور شمالی ہندوستان
کے گورا قبیلوں میں پایا جاتا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے
تاملوں میں اور ریاست نیو یارک میں ایراکواس قبیلہ کے سنیکا
لوگوں میں رشتہ داری کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں، وہ دو
سو سے زیادہ رشتوں میں آج بھی دونوں جگہ ایک ہیں۔

اور امریکہ کے سارے انڈینوں کی طرح ہندوستان کے ان قبیلوں میں بھی خاندان کی مروجہ شکل سے پیدا ہونے والے تعلقات میں اور ہم خاندانی کے نظام میں تضاد ہے۔

اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ عہد وحشت اور عہد بربریت میں سبھی لوگوں کے یہاں سماجی نظام کے اندر قرابت داری کی ایک فیصلہ کن اہمیت ہوتی ہے۔ لہذا ایک ایسے وسیع نظام کی توجیہہ محض الفاظ کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی — ایک ایسا نظام جو عام طور سے سارے امریکہ میں اور اسی طرح ایشیا میں بھی ایک بالکل مختلف نسل کے لوگوں میں پھیلا ہؤا ہے اور جس کی کم و بیش بدلی ہوئی صورتیں سارے افریقہ اور آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں، ایسے نظام کی تاریخی توجیہہ ضروری ہے۔ اس کی توجیہہ اس طرح نہیں کی جا سکتی جس طرح مثال کے طور پر میکلینن نے کرنے کی کوشش کی تھی۔ باپ، بیٹے، بھائی اور بہن کی اصطلاحیں محض رسمی نہیں بلکہ ان کے ساتھ باہمی حقوق اور فرائض کا ایک مخصوص، متعین اور بہت ہی واضح تصور وابستہ ہے جو مجموعی طور پر ان لوگوں کے سماجی آئین کا ایک ضروری حصہ ہوتا ہے۔ اور اب اس کی توجیہہ مل گئی ہے۔ جزیرہ ہائے سینڈویچ (ہوائی) میں موجودہ صدی کے ابتدائی نصف حصے تک خاندان کی ایک ایسی شکل موجود تھی جس میں ٹھیک اسی طرح کے باپ اور ماں، بھائی اور بہن، بیٹے اور بیٹی، چچا اور چچی، بھتیجے اور بھتیجی ہوتے تھے جس طرح کی امریکی اور قدیم ہندوستانی ہم خاندانی کے

نظام کو ضرورت تھی ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم خاندانی کا
جو نظام ہوائی میں رائج تھا، اس میں اور وہاں کے خاندان
کی اصلی صورت میں بھی تضاد تھا ۔ وہاں سبھی چچیرے،
پھوپھیرے، ممیرے اور خلیرے بھائی بہن، حقیقی بھائی بہن
سمجھے جاتے تھے ۔ اور وہ سب صرف اپنی ماں اور اس کی
اپنی بہنوں کی یا اپنے باپ اور اس کے اپنے بھائیوں کی
اولاد نہیں بلکہ اپنے ماں باپ کے سبھی بھائیوں اور بہنوں کی
مشترک اولاد تصور کئے جاتے تھے ۔ چنانچہ اگر ہم خاندانی
کے امریکی نظام کی تہہ میں خاندان کی ایک زیادہ قدیم شکل
تھی جو اب امریکہ میں رائج نہیں رہی لیکن ہوائی میں اب
بھی پائی جاتی ہے تو ہوائی کا ہم خاندانی کا نظام خاندان
کی ایک اور بھی قدیم شکل کی طرف اشارہ کر رہا ہے،
جس کا وجود اگرچہ آج کہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا پھر
بھی کبھی نہ کبھی ضرور رہا ہوگا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو
ہم خاندانی کا وہ نظام جو اس سے مناسبت رکھتا ہے، کبھی
قائم نہ ہوتا ۔ مارگن کا کہنا ہے کہ «خاندان ایک زندہ
اور متحرک چیز ہے ۔ وہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا ۔
جس طرح سماج نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرتا ہے،
اسی طرح خاندان بھی نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرتا
ہے ۔ اس کے برعکس ہم خاندانی کا نظام مجہول اور
غیر متحرک چیز ہے ۔ طویل وقفوں کے بعد خاندان میں جو ترقی
ہوتی ہے، وہ اس کا عکس ہوتا ہے ۔ ہم خاندانی کے نظام
میں کوئی بڑی تبدیلی صرف اسی وقت ہوتی ہے جب خاندان

میں کوئی بڑی تبدیلی ہو چکی ہوتی ہے۔» اس پر مارکس نے یہ اضافہ کیا کہ «یہی بات عام طور سے سیاسی، قانونی، مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں پر بھی صادق آتی ہے۔» خاندان زندہ حالت میں رہتا ہے لیکن ہم خاندانی کا نظام جامد اور بےجان ہو جاتا ہے اور اگرچہ رسمی طور پر اس کا ڈھانچہ باقی رہتا ہے لیکن خاندان ترقی کرکے اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جس طرح پیرس کے قریب ایک ایسے جانور کے ڈھانچہ کی ہڈیوں سے جسکے بچہ رکھنے کی تھیلی ہوتی ہے، کوویئے یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ ڈھانچہ پیٹ کی تھیلی میں بچے کو رکھکر لے جانےوالے کسی جانور کا ہے، اور ایسے جانور اگرچہ اب نہیں ملتے مگر اس علاقہ میں ضرور کبھی رہتے ہونگے، اسی طرح تاریخی طور پر پرانے زمانہ سے ہمیں ہم خاندانی (سگوتری) کا جو نظام ملا ہے، اس سے ہم بھی اتنے ہی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مناسبت رکھنے والی، خاندان کی ایک شکل کبھی رائج ہوگی جو اب مٹ چکی ہے۔

ہم خاندانی کے وہ نظام اور خاندان کی وہ شکلیں جن کا ابھی ذکر ہؤا موجودہ زمانہ کے مروجہ نظاموں اور شکلوں سے مختلف ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان میں ہر بچہ کے کئی کئی باپ اور مائیں ہوتی ہیں۔ ہم خاندانی کے امریکی نظام کے مطابق، جس سے ہوائی خاندان مناسبت رکھتا ہے، بھائی اور بہن ایک ہی بچہ کے باپ اور ماں نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس ہم خاندانی کا ہوائی نظام جس خاندان پر مبنی ہے،

اس میں یہی رواج تھا ـ ہمیں خاندان کی مختلف شکلیں ملتی ہیں اور یہ ان شکلوں سے بالکل مختلف ہیں جو عام طور پر مروج مانی جاتی ہیں ـ خاندان کے روایتی تصور میں صرف یک زوجگی ہے جس میں کچھہ مردوں کے لئے کثرت ازواج اور شاید کچھہ عورتوں کے لئے کثرت شوہری کی بھی گنجائش ہے ـ لیکن اس تصور میں اس حقیقت پر چپ چاپ پردہ ڈال دیا جاتا ہے ــــ جیسا کہ اخلاق پرست کم نظر اکثر کیا کرتے ہیں ــــ کہ سرکاری سماج کی عاید کی ہوئی بندشیں خاموشی اور اتنی ہی بےشرمی کے ساتھہ عمل میں توڑی جاتی ہیں ـ اس کے برعکس قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے جن میں مرد متعدد بیویوں سے شادی کرتے تھے اور ان کی بیویاں متعدد شوہروں سے ـ اور اس لئے ان کی اولاد سبھوں کی مشترک اولاد سمجھی جاتی تھی ـ ان حالات میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ بالکل مٹ گئے اور ان کی جگہ پر ایک مرد اور ایک عورت کے بیاہ کا رواج ہوا ـ ان تبدیلیوں کی نوعیت یہ تھی کہ مشترک شادی کے تعلق کا دائرہ جو شروع میں بہت وسیع تھا اور جس میں بہت سے لوگ آ سکتے تھے، رفتہ رفتہ محدود ہوتا گیا حتی‌کہ آخر میں اس میں محض ایک عورت اور ایک مرد رہ گئے ـ چنانچہ آج کل عام طور پر اسی کا رواج ہے ـ

اس طرح خاندان کی پچھلی تاریخ مرتب کرنے میں حال سے ماضی کی طرف جاتے ہوئے، مارگن اپنے اکثر رفیقوں کی

طرح، ایک ایسی قدیم منزل پر جا پہونچا جبکہ قبیلے کے اندر جنسی تعلقات کی مکمل آزادی تھی ـ ہر عورت ہر مرد کے لئے روا تھی اور اسی طرح ہر مرد ہر عورت کے لئے ـ ایک ایسی قدیم حالت کا تذکرہ گذشتہ صدی سے ہی ہوتا آ رہا ہے لیکن یہ تذکرہ نہایت عام لفظوں میں کیا جاتا تھا ـ باخوفن پہلا آدمی تھا جس نے اس حالت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور تاریخی اور مذہبی روایات میں اس کے آثار ڈھونڈھنے کی کوشش کی ـ باخوفن نے یہ ایک نہایت گراں قدر خدمت انجام دی ہے ـ آج ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اس نے جن آثار کا پتہ لگایا وہ ہمیں آزاد جنسی تعلقات کے سماجی دور تک واپس نہیں لے جاتے بلکہ اس کے بہت بعد کے سماجی دور تک پہونچاتے ہیں جس میں گروہوار شادی کا رواج تھا ـ وہ قدیم سماجی دور اگر سچ مچ کبھی رہا ہوگا تو اس کا تعلق اتنے قدیم زمانہ سے ہے کہ ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ قدیم جاتیوں میں جن کی ترقی رک گئی ہے، یعنی پچھڑے ہوئے وحشیوں میں، اس کے وجود کا کوئی براہ راست ثبوت مل سکے ـ باخوفن کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی تحقیقات میں اس سوال کو پیش پیش رکھا* ـ

---

* باخوفن نے جو کچھ دریافت یا سچ پوچھئے تو قیاس کیا تھا، اس کو وہ خود نہیں سمجھتا تھا ـ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس قدیم حالت کو hetaerism (یعنی داشتہ عورتوں کے رواج ـ مترجم ـ) سے تعبیر کرتا ہے ـ اس لفظ کو پہلے

انسان کی جنسی زندگی کے اس ابتدائی دور کو ماننے سے انکار کرنا آج کل ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ اس کا مقصد انسانیت کو اس «کلنک» سے بچانا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کی کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے حیوانات کی مثال بھی پیش کی جاتی ہے۔ لیتورنیو نے حیوانی دنیا سے بہت سے واقعات جمع کرکے («شادی اور خاندان کا ارتقا»، ۱۸۸۸ء*) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حیوانوں میں بھی پوری طرح آزاد جنسی تعلق ایک ابتدائی اور ادنی سطح کی چیز ہے۔ لیکن

پہل یونانیوں نے استعمال کیا تھا۔ اس سے ان کی مراد وہ جنسی تعلق تھا جو ان مردوں میں جو بن بیاہے تھے یا جن کی ایک بیوی تھی اور بن بیاہی عورتوں میں ہوتا تھا۔ اس کے لئے شادی کی ایک مخصوص صورت ضروری تھی جس کے دائرے کے باہر یہ جنسی تعلق ہؤا کرتا تھا۔ اس میں عصمت فروشی بھی شامل ہے۔ اگر اور کچھ نہیں تو اس کا وجود ممکن تو ہو ہی چکا تھا۔ یہ لفظ کسی اور مفہوم میں کبھی استعمال نہیں ہؤا۔ اور مارگن کی طرح میں بھی اس کو صرف اسی معنی میں استعمال کرتا ہوں۔ باخوفن نے اپنی نہایت اہم دریافتوں کو ہمیشہ نہایت پراسرار اور ناقابل فہم بنا دیا۔ اس کی وجہ اس کا یہ مہمل عقیدہ تھا کہ تاریخی ارتقا کے دوران میں مرد عورت کے درمیان جو تعلق قائم ہوتے ہیں، وہ اس زمانہ کے انسان کے مذہبی خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کے اصلی حالات زندگی کا نہیں۔ (نوٹ از اینگلس۔)

* Letourneau Ch., L'Évolution du Mariage et de la Famille, Paris 1888. (اڈیٹر۔)

ان تمام واقعات سے میں صرف اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جہاں تک انسان اور اس کے ابتدائی حالات زندگی کا تعلق ہے، ان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ ریڑھہ کی ہڈی والے جانوروں میں نر اور مادہ بہت دنوں تک جوڑا بنائے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ جسمانی ہے۔ مثلاً پرندوں میں مادہ کو انڈے سینے کے زمانہ میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن پرندوں میں جوڑوں کی وفاداری کی مثالوں سے انسانوں کے لئے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ انسان پرندوں کی نسل سے نہیں ہے۔ اور اگر ایک نر اور ایک مادہ کا جوڑا ہی تمام خوبیوں کی معراج ہے تو پھر شرافت کا سہرا کینچوے کے سر بندھنا چاہئے۔ اس کے جسم میں پچاس سے دو سو تک حصے ہوتے ہیں اور ہر حصے کے اندر نر اور مادہ کے پورے جنسی اعضا موجود ہوتے ہیں۔ اس کی ساری زندگی ان دو سو میں سے ہر ایک حصے میں خود اپنے ہی ساتھہ جنسی عمل کرنے میں گذر جاتی ہے۔ اگر ہم دودھہ پلانے والے جانوروں کو ہی دیکھیں تو ہمیں ان میں جنسی زندگی کی سبھی شکلیں ملیں گی۔ آزاد جنسی تعلق کے ساتھہ ساتھہ گروہ وار شادی کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں، ایک نر کے لئے کئی مادائیں اور ایک نر اور ایک مادہ کا تعلق بھی ملتا ہے۔ لیکن ان میں ایک مادہ سے کئی نروں کا تعلق نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف انسانوں میں ہی ممکن تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے سب سے قریبی رشتہ‌داروں یعنی چوپایوں میں بھی نر اور مادہ کے ملنے کی زیادہ سے زیادہ ممکن صورتیں پائی جاتی

ھیں اور اگر ھم اس دائرے کو اور بھی محدود کر دیں اور محض چار انسان نما لنگوروں کو لیں تو لیتورنیو ھمیں بتائیےگا کہ ان میں کہیں ایک نر اور ایک مادہ کا تعلق پایا جاتا ھے اور کہیں ایک نر کے ساتھہ کئی مادائیں ھوتی ھیں۔ دوسری طرف سوسورے جس کی رائے ژیرا تیولوں نے نقل کی ھے، کہتا ھے کہ وہ ایک نر اور ایک مادہ کے اصول پر عمل کرتے ھیں۔ اپنی کتاب «انسانی شادی کی تاریخ»* میں وسٹرمارک نے انسان نما لنگوروں میں ایک نر اور ایک مادہ کے ساتھہ رھنے کے متعلق جو حال میں دعوے کئے ھیں اس سے بھی کوئی بات ثابت نہیں ھوتی۔ مختصر یہ کہ سبھی روایتیں کچھہ اس قسم کی ھیں کہ غریب لیتورنیو کو آخر یہ مان لینا پڑا کہ «دودھہ پلانےوالے جانوروں میں ذھنی ارتقا کی سطح اور جنسی تعلق کی شکل میں کوئی خاص ربط نہیں ھے»۔ اور اسپناس اپنی کتاب «حیوانی سماج»** میں صاف کہتا ھے کہ «جانوروں میں سب سے اعلی سماجی گروہ جو دیکھنے میں آتا ھے، جھنڈ یا غول ھے۔ معلوم ھوتا ھے وہ کئی خاندانوں سے مل کر بنتا ھے۔ لیکن خاندان اور غول میں شروع ھی سے تضاد ھوتا ھے۔ ان میں الٹی نسبت ھوتی ھے۔»

---

* Westermarck E. A., The History of Human Marriage. London 1891. (اڈیٹر۔)

** Espinas A., Des Sociétés Animales. Étude de Psychologie Comparée. Paris, 1877, pp. 303—304. (اڈیٹر۔)

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ آدم نما بندروں کے خاندان اور دوسری سماجی گروہ بندیوں کے بارے میں ہمیں یقینی طور پر تقریباً کچھہ نہیں معلوم ہے۔ جو باتیں معلوم بھی ہیں وہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ وحشی انسانوں کے قبیلوں کے بارے میں بھی ہمیں جو کچھہ معلوم ہے وہ باتیں بہت متضاد ہیں اور ان کو تنقیدی نظر سے جانچنے اور چھان بین کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن بندروں کے سماجوں کا مطالعہ انسانی سماج کے مقابلہ میں اور بھی مشکل ہے۔ ان کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ لہذا ان سے جو نتیجے نکالے جاتے ہیں انہیں فی الحال ٹھکرا دینا چاهئے۔

لیکن اسپناس کی کتاب سے جو عبارت ابھی نقل کی گئی اس میں ہمارے لئے ایک بہت اچھا اشارہ موجود ہے۔ اعلی حیوانوں میں غول اور خاندان لازم و ملزوم نہیں بلکہ ان میں آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اسپناس نے بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ جوڑا ملنے کے زمانہ میں نروں کے آپس کے رشک و رقابت کی وجہ سے مل جل کر رهنے والے غولوں کا بھی شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے یا کچھہ عرصہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے۔ «جہاں خاندان کی شیرازہ بندی مضبوط ہے وہاں غول شاذونادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں آزاد جنسی تعلق یا کثرت ازدواج ہے وہاں گویا قدرتی طور پر غول بن جاتے ہیں... غول بننے کے لئے ضروری ہے

کہ خاندان کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی ہوں اور فرد پھر آزاد ہو گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں میں منظم جھنڈ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دودھ پلانے والے جانوروں میں کم و بیش منظم سماج موجود ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرد خاندان کے اندر جذب نہیں ہؤا ہے۔۔۔ چنانچہ ابتدا میں غول کے اجتماعی احساس (ضمیر اجتماعی) کا سب سے بڑا دشمن خاندان کا اجتماعی احساس ہے۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک ایسی سماجی ہیئت قائم ہو سکی ہے جو خاندان سے زیادہ اعلی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر ایسے خاندان شامل تھے جن میں بنیادی تبدیلی ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹھیک اسی وجہ سے یہ خاندان بعد میں اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ موافق حالات میں نئے سرے سے منظم کر سکے۔» (اسپناس۔ ایضاً (پہلا باب)۔ ژیرا تیولوں نے اپنی کتاب «شادی اور خاندان کا آغاز»، ۱۸۸٤ء* میں نقل کیا۔ صفحات ۵۱۸ — ۵۲۰۔)

اس سے یہ ظاہر ہے کہ حیوانی سماجوں سے بلا شک انسانی سماجوں کی بابت کچھ نتیجے نکالے جا سکتے ہیں، لیکن محض منفی اعتبار سے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ریڑھ کی ہڈی والے اعلی حیوانوں میں خاندان کی صرف دو شکلیں پائی جاتی ہیں، ایک نر کی کئی مادائیں یا ایک نر

---

* Giraud—Teulon A., Les origines du mariage et de la famille Genéve. 1884. (اڈیٹر۔)

اور ایک مادہ کے جوڑے۔ دونوں شکلوں میں بالغ نر یا
شوہر ایک ہی ہو سکتا ہے۔ نر کے رشک و رقابت کا
جذبہ جس سے خاندان کا بندھن اور اس کی حدود دونوں
ظاہر ہوتی ہیں، حیوانی خاندان اور غول میں ٹکر پیدا کرتا
ہے۔ غول جوکہ ایک اعلی سماجی شکل ہے، جوڑا ملنے کے
زمانہ میں کہیں بالکل نا ممکن ہو جاتا ہے، کہیں اس کے
بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کہیں اس کا شیرازہ بالکل
منتشر ہو جاتا ہے۔ نر کے رشک و رقابت کی وجہ سے اس
کا مسلسل ارتقا بہرحال مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف یہی یہ
بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ حیوانی سماج اور قدیم
انسانی سماج میں آپس میں تضاد ہے اور قدیم انسان جب
حیوانیت کی منزل سے قدم آگے بڑھا رہا تھا تو اسے خاندان
کی کوئی واقفیت نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو ایک ایسے
خاندان کی جو حیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ وسٹرمارک نے
شکاریوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر کہا ہے کہ گوریلا اور
شمپانزی لنگوروں میں غول پسندی کی سب سے اونچی شکل
ایک نر اور ایک مادہ کا جوڑا ہے۔ اس شکل میں یعنی
اکیلے بھی، وہ نہتا حیوان جو انسانیت کے عالم میں قدم رکھ
رہا تھا، چھوٹی تعداد میں زندہ رہ سکتا تھا۔ حیوانیت کی
منزل سے ترقی کرکے آگے بڑھنے اور فطرت میں ترقی کا
یہ سب سے بڑا قدم اٹھانے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت
تھی۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ دفاع اور بچاؤ کے لئے
فرد کی ناکافی طاقت کی جگہ غول کی متحدہ طاقت اور

مشترکہ کوشش لیے ایے۔ آدم نما بندر آج جن حالات میں رھتے ھیں، اس قسم کے حالات سے نکل کر انسانی منزل میں پہونچنا بالکل نا ممکن ھوگا۔ ان انسان نما بندروں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ کوئی بھٹکی ھوئی شاخ ھے جو رفتہ رفتہ مٹ چلی ھے یا بہر حال جس کا زوال ھونے لگا ھے۔ یہی وجہ بہت کافی ھے کہ ان کے اور قدیم انسان کے خاندان کی شکلوں کا آپس میں موازنہ کرکے جو نتیجے نکالے جاتے ھیں، ان کو قبول نہ کیا جائے۔ حیوانیت سے انسانیت کا ارتقا جن وسیع اور پائدار گروھوں کے ذریعہ ممکن تھا، ان کے بننے کی پہلی شرط یہ تھی کہ بالغ نروں میں ایک دوسرے کے لئے رواداری ھو اور رشک و رقابت کا جذبہ ختم ھو چکا ھو۔ اور سچ پوچھئے تو خاندان کی وہ سب سے ابتدائی شکل کون سی ھے جس کا پکا ثبوت تاریخ میں ملتا ھو اور جو آج بھی کہیں دیکھنے میں آتی ھے؟ وہ گروہ وار شادی ھے جس میں مردوں کا پورا کا پورا گروہ اور عورتوں کا پورا گروہ ایک دوسرے سے تعلق رکھتا ھے، جس میں رشک و رقابت کی گنجائش کم ھی ھوتی ھے۔ اور پھر ارتقا کے ایک اور بعد کے دور میں کثرت شوھری کی مستثنی صورت ملتی ھے جو رشک و رقابت کے جذبہ کے بالکل منافی ھے اور اس لئے جانوروں میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ لیکن گروہ وار شادی کی جو شکلیں ھمیں ملتی ھیں، ان کے ساتھہ ایسے پیچیدہ حالات وابستہ ھوتے ھیں کہ لازمی طور پر ان سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ ان سے پہلے جنسی

تعلق کی کچھہ ان سے بھی زیادہ ابتدائی اور سادہ شکلیں رہی ہونگی۔ اور اس طرح، آخری تجزیہ میں، ہم آزاد جنسی تعلق کے ایک دور میں پہونچ جاتے ہیں جو حیوانیت سے انسانیت کی طرف تغیر کا دور بھی تھا۔ جانوروں میں شادی کی شکلوں کا حوالہ دےکر ہم ایک بار پھر اسی جگہ پہونچ گئے جہاں سے یہ سمجھا گیا تھا کہ ہم ہمیشہ کے لئے آگے بڑھہ چکے ہیں۔

تو پھر آزاد جنسی تعلق کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل جنسی تعلقات پر جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں، یا جو اب سے پہلے کے زمانوں میں لگی ہوئی تھیں، وہ اس وقت نہیں تھیں۔ ہم رشک و رقابت کی دیواروں کو گرتے ہوئے دیکھہ چکے ہیں۔ اگر کوئی بات یقینی ہے تو وہ یہ کہ رشک و رقابت کا جذبہ نسبتاً بعد کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ محرمات کے ساتھہ جنسی تعلق کے تصور پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ نہ صرف شروع میں بھائی بہن شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے بلکہ کئی قوموں میں آج بھی والدین اور اولاد میں جنسی تعلقات جائز سمجھے جاتے ہیں۔ بینکرافٹ نے اپنی کتاب «شمالی امریکہ کی ساحل پیسفک کی ریاستوں کی نسلیں»* میں بتایا ہے کہ آبنائے بیرنگ کے کاویات لوگوں میں، الاسکا کے نزدیک رہنے والے کادیاک لوگوں میں، اور برطانوی

* Bancroft H. H., The native races of the pacific states of North America. Vols. I—V. New York, 1875—1876. (اڈیٹر۔)

شمالی امریکہ کے اندرونی علاقہ کے طینہہ لوگوں میں اس کا رواج اب بھی پایا جاتا ہے۔ لیتورنیو نے بھی بتایا ہے کہ چھپیوا قبیلہ کے انڈین لوگوں میں، چلی کے رہنے والے کوکوس لوگوں میں، ہند چین کے کیرےین اور کرین لوگوں میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ پارتھویوں، ایرانیوں، سکائی تھنوں اور ہنوں وغیرہ کے بارے میں جو روایتیں قدیم یونانیوں اور رومیوں میں ملتی تھیں، ان میں بھی اس چیز کا ذکر ملتا ہے۔ اس اصول کے اختراع سے پہلے کہ محرمات میں جنسی تعلق معیوب ہے (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اختراع ہے اور نہایت مفید اور اہم ہے) والدین اور ان کی اولاد کے درمیان جنسی تعلقات، الگ الگ پشتوں کے مختلف افراد کے جنسی تعلقات سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہو سکتے تھے۔ دو مختلف پیڑھیوں کے افراد کے درمیان جنسی تعلق تو آج انتہائی تنگ نظر، اخلاق پرست ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس پر کسی خاص نفرت کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ساٹھہ برس سے اوپر کی «دوشیزائیں» بھی، اگر کافی دولت مند ہوں تو تیس برس کے قریب کے نوجوانوں سے شادی کرتی ہیں۔ لیکن خاندان کی ان قدیم ترین شکلوں سے جو ہمیں معلوم ہیں، اگر ہم محرمات کے ساتھہ جنسی تعلق کے تصور کو جو ان سے وابستہ ہیں — جو تصور ہمارے اپنے تصورات سے بالکل مختلف اور اکثر صورتوں میں بالکل متضاد ہیں — الگ کر دیں، تو جنسی تعلق کی ایک ایسی شکل رہ جاتی ہے

جس کو آزاد جنسی تعلق کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ آزاد جنسی تعلق اس لئے کہ رسم و رواج نے آگے چل کر جو پابندیاں لگائیں ان کا اس وقت کوئی وجود نہیں تھا۔ لیکن اس سے یہ کوئی لازمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ روز انںھادھند آزاد جنسی تعلق کا بازار گرم رہتا تھا۔ ایک محدود مدت کے لئے الگ الگ جوڑے بناکر رہنے کا رواج قطعی بھی خارج از ممکنات نہیں تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گروہ وار شادی میں بھی اب زیادہ تر ایسے ہی جوڑے دیکھنے میں آتے تھے۔ وسٹرمارک نے سب سے بعد میں خاندان کی اس قدیم شکل کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اگر اس کی تعریف کے مطابق ہر وہ تعلق شادی ہے جس میں مرد اور عورت بچہ پیدا ہونے تک ساتھہ رہتے ہیں، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی شادی آزاد جنسی تعلق کی حالتوں میں بھی ہو سکتی تھی، اور وہ آزاد جنسی تعلق، یعنی جنسی تعلق پر رسم و رواج کی لگائی ہوئی پابندیوں کے نہ ہونے کی ضد، نہیں تھی۔ وسٹرمارک بلا شبہ یہ نقطۂ نظر لےکر چلا ہے کہ «آزاد جنسی تعلق کا مطلب ہے کہ انفرادی رجحانات کو دبانا پڑتا ہے» اور اس لئے «اس کی سب سے سچی شکل عصمت‌فروشی ہے»۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم قدیم حالات کو چکلہ‌گھروں کی عینک سے دیکھنا بند نہیں کریں گے، تب تک ہم انہیں بالکل نہیں سمجھہ سکیں گے۔ گروہ وار شادی پر غور کرتے وقت ہم اس بات کا پھر ذکر کریں گے۔

مارگن کی رائے میں آزاد جنسی تعلق کی اس ابتدائی حالت سے، شاید بہت شروع میں ہی، یہ شکلیں پیدا ہوئیں:

۱- سگوتر یا یک جدی خاندان ۔ یہ خاندان کی پہلی منزل ہے۔ یہاں شادی پیڑھیوں کے مطابق گروہوں میں ہوتی ہے۔ خاندان کے دائرے کے اندر سبھی دادا اور دادیاں ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے ہیں۔ ان کے بچوں کی یعنی ماؤں اور باپوں کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ اور ان کے بچوں سے پھر مشترک شوہروں اور بیویوں کا ایک تیسرا دائرہ تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے بچے یعنی پہلی پیڑھی کے پڑپوتے اور پڑپوتیاں، چوتھے دائرے کے شوہر اور بیویاں بن جاتے ہیں۔ اس طرح خاندان کی اس شکل میں صرف سلف اور خلف، ماں باپ اور ان کے بچے (ہماری آج کل کی زبان میں) ایک دوسرے کے ساتھہ شادی کے حقوق اور ذمہ داریاں نہیں قبول کر سکتے۔ بھائی بہن، دور اور نزدیک کے چچیرے، ممیرے، پھوپھیرے بھائی بہن سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہوتے ہیں اور ٹھیک اسی لئے وہ سب ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے ہیں۔ اس منزل پر بھائی بہن کے رشتہ میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھہ جنسی تعلق رکھتے ہیں اور یہ عام چلن ہوتا ہے*۔

---

* واگنر کی «نی بے لنگ» (Nibelung) کے متن میں قدیم زمانہ کی جو بالکل جھوٹی تصویر کھینچی گئی ہے، اس کے بارے میں مارکس نے ایک خط میں بہت ہی سخت الفاظ

ٹھیٹھہ صورت میں ایسے خاندان میں ایک جوڑے کی اولاد ہوگی اور پھر ان میں ہر پیڑھی کی اولاد، سب کی سب. ایک دوسرے کی بھائی بہن ہوگی اور ٹھیک اسی وجہ سے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے شوہر بیوی ہونگے۔

میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ خط اس نے ۱۸۸۲ء کے موسم بہار میں لکھا تھا۔ «یہ بھلا کسی نے کبھی کاہے کو سنا ہوگا کہ بھائی بہن کو اپنی دلہن بناکر سینہ سے لگا لیے؟» واگنر کے ان «شہوت پرست خداؤں» کو، جو بالکل نئے ڈھنگ سے اپنے معاملات عشق میں محرمات کے ساتھہ جنسی تعلق کا نمک مرچ بھی لگا لیا کرتے تھے، مارکس نے یہ جواب دیا کہ «قدیم زمانہ میں بہن ہی بیوی ہوتی تھی اور یہی اخلاقاً جائز سمجھا جاتا تھا»۔ (نوٹ از اینگلس۔)

واگنر کے ایک فرانسیسی دوست اور مداح اس نوٹ سے متفق نہیں ہیں۔ وہ اس بات کا حوالہ دیتے ہیں کہ، زیادہ قدیم «اڈا» (Edda) میں بھی، جسے واگنر نے اپنا نمونہ بنایا تھا، «آگسدریکا» (Ögisdrecka) میں لوکی، فریےیا کو الزام دیتا ہے کہ «تیرا اپنا بھائی دیوتاؤں کے سامنے تجھہ سے ہم‌آغوش ہؤا ہے»۔ ان دوست کا دعوی ہے کہ اس وقت تک بھائی اور بہن کی شادی کی ممانعت ہو چکی تھی۔ «آگسدریکا» اس زمانہ کی ترجمان ہے جب پرانی دیومالا میں لوگوں کا عقیدہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ دیوتاؤں پر سچ مچ لوسیان کے طرز کا طنز ہے۔ اگر لوکی Mephistopheles (ورغلانے والے شیطان ۔ مترجم ۔) کی صورت میں اس طرح فریےیا کو الزام دیتا ہے، تو یہ بات واگنر کے خلاف پڑتی ہے۔ چند بندوں کے بعد لوکی، نیورد سے بھی کہتا ہے: «اپنی

سگوتر خاندان بالکل مٹ چکا ہے۔ سب سے کم مہذب قوموں میں بھی، جن کا حال تاریخ میں ملتا ہے، خاندان کی اس شکل کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی جانچ کی جا سکے۔ لیکن ہوائی میں سگوتری یا ہم خاندانی کا جو نظام ملتا ہے، اور جو آج بھی پولینیزیا کے سبھی جزیروں میں پھیلا ہؤا ہے، وہ ہمیں اس نتیجہ پر پہونچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ خاندان کی یہ شکل کسی زمانہ میں ضرور رہی

بہن سے تمہارے (ایسا) ایک لڑکا ہؤا» (vidh systur thinni gaztu slikan mög) ۔ یہ صحیح ہے کہ نیورد آسا نسل کا نہیں بلکہ وانا نسل کا تھا اور انگلنگ کی رزمیہ داستان میں کہتا ہے کہ وانا دیش میں بھائیوں اور بہنوں کی شادی کا رواج ہے لیکن آساؤں میں ایسا نہیں ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وانا آسا سے زیادہ پرانے دیوتا تھے۔ بہرحال نیورد آساؤں کے درمیان اس طرح رہتا تھا جس طرح اپنے برابر والوں کے درمیان رہا جاتا ہے۔ اس لئے «آگسدریکا» سے اصل میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں ناروپائی دیوتاؤں کی رزمیہ داستان (Saga) کا آغاز ہؤا، اس زمانہ میں بھائیوں اور بہنوں کی شادی، کم سے کم دیوتاؤں میں، مکروہ نہیں مانی جاتی تھی۔ اگر واگنر کی غلطی کو درگذر ہی کرنا ہے تو شاید «اڈا» کے بجائے گیئٹے کا حوالہ دینا بہتر ہوگا کیونکہ گیئٹے نے «اللہ اور حور کے گیت» میں عورتوں کی مذہبی سپردگی کے بارے میں ایسی ہی غلطی کی تھی اور اسے آج کل کی عصمت فروشی سے بہت زیادہ ملتا جلتا قرار دیا ہے۔» (چوتھے اڈیشن میں اینگلس کا نوٹ۔)

ہوگی۔ اس میں سگوتری یا ہم خاندانی کے ایسے درجے ملتے ہیں جو خاندان کی اس شکل کے اندر ہی پیدا ہو سکتے تھے۔ اور خاندان کا بعد کا تمام تر ارتقا بھی، جو کہ اس شکل کو ایک ضروری ابتدائی منزل کی حیثیت سے لازمی بنا دیتا ہے، ہمیں اسی نتیجے پر پہونچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

۲۔ پونالوان خاندان۔ اگر تنظیم میں ترقی کا پہلا قدم یہ تھا کہ والدین اور بچوں میں آپس میں جنسی تعلق کا سلسلہ بند ہؤا، تو اس کا دوسرا قدم یہ تھا کہ بھائی بہنوں میں بھی اس تعلق کو ختم کیا گیا۔ چونکہ بھائی بہنوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا اس لئے یہ قدم، پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ مشکل تھا۔ یہ قدم رفتہ رفتہ ہی اٹھایا گیا تھا۔ پہلے شاید سگے بھائی بہنوں میں (یعنی جو ایک ماں سے ہوں) جنسی تعلق کو بند کیا گیا ہوگا۔ وہ بھی شاید شروع میں اکا دکا معاملے میں ایسا کیا گیا ہوگا اور بعد میں یہ عام اصول بن گیا ہوگا۔ (ہوائی میں موجودہ صدی میں بھی اس عام اصول کے مستثنی ملتے تھے)۔ اور آخر میں بڑھتے بڑھتے رشتے کے بھائی بہنوں، یا ہماری آج کل کی اصطلاح میں قریب یا دور کے چچیرے، ممیرے، خلیرے اور پھوپھیرے بھائی بہنوں کی شادی پر پابندی لگی ہوگی۔ مارگن کے الفاظ میں «قدرتی انتخاب کے اصول پر عمل‌درآمد کی یہ ایک اچھی مثال ہے»۔ اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ جن قبیلوں میں یہ قدم اٹھاکر قریبی رشتہ‌داروں سے جنسی تعلق قائم کرنا اور بچے

پیدا کرنا روک دیا گیا، انہوں نے ان قبیلوں کے مقابلہ میں کہیں جلدی اور زیادہ مکمل ترقی کی جن میں بھائی بہنوں کی شادی کا رواج تھا اور اسے ضروری فرض سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ اور اس قدم کا بڑا زبردست اثر پڑا۔ اس کا ایک ثبوت گنوں کا ادارہ ہے جو براہ راست اسی قدم کا نتیجہ تھا اور اس سے بہت دور نکل گیا تھا۔ گن کا ادارہ بربریت کے عہد میں اگر دنیا کی سب نہیں تو زیادہ تر قوموں میں سماجی نظام کی بنیاد تھا اور یونان و روما میں تو ہم اس سے براہ راست تمدن کے عہد میں داخل ہوتے ہیں۔

ہر قدیم خاندان حد سے حد چند پشتوں کے بعد بٹ جاتا تھا۔ بربریت کے درمیانی دور کے آخری حصہ تک بھی، ہر جگہ بلااستثنی قدیم کمیونسٹی مشترک گھرانے میں رہنے کا رواج تھا۔ اور اس کی وجہ سے خاندانی برادری کی ایک آخری حد متعین ہو جاتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی بڑی ہوسکتی ہے۔ اس میں حالات کے مطابق ردوبدل ہو سکتا تھا لیکن ہر جگہ یہ بات بڑی حد تک متعین ہوتی تھی۔ جب ایک ماں کی اولاد میں جنسی تعلق معیوب سمجھا جانے لگا تو لازم تھا کہ پرانی خاندانی برادریوں کی تقسیم پر اور نئی خاندانی برادری (Hausgemeinden) کی بنیاد پر اس نئے تصور کا اثر پڑے۔ (یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ خاندانی برادری اور خاندانی گروہ ایک ہی چیز ہو)۔ بہنوں کا ایک یا ایک سے زیادہ گروہ ایک گھرانے کے بنیادی مرکز بن جاتے تھے اور ان کے سگے بھائی دوسرے گھرانے کے۔ اس طریقہ

سے یا اس سے ملتے جلتے کسی اور طریقہ سے، سگوتری یعنی
یک‌جدی خاندان سے ترقی کرکے خاندان کی وہ شکل پیدا
ہوئی جس کو مارگن پونالوان خاندان کہتا ہے۔ جزیرۂ ہوائی
کے رواج کے مطابق بہت سی بہنوں کے ــــ خواہ وہ سگی بہنیں
ہوں یا دو تین درجہ تک کی ہم جدی بہنیں ــــ مشترک شوہر
ہوتے تھے جن کی وہ مشترک بیویاں ہوتی تھیں۔ لیکن ان
کے بھائیوں کو اس رشتہ سے الگ رکھا جاتا تھا۔ وہ اب ان
کے شوہر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ شوہر لوگ اب ایک
دوسرے کو بھائی نہیں کہتے تھے اور سچ پوچھئے تو اب
ان کا آپس میں بھائی ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ وہ ایک
دوسرے کو «پونالوا» کہتے تھے جس کا مطلب ہے یارغار یا
ساجھےدار۔ اسی طرح سگے یا رشتے کے بھائیوں کے ایک
گروہ کی شادی مشترکہ طور پر عورتوں کے ایک گروہ سے
ہوتی تھی۔ لیکن یہ عورتیں ان کی بہنیں نہیں ہوتی تھیں
اور یہ عورتیں ایک دوسرے کو «پونالوا» یعنی سکھی کہا
کرتی تھیں۔ خاندان کی بناوٹ کی یہی قدیم کلاسیکی صورت
(Familienformation) تھی جس میں آگے چل کر متعدد تبدیلیاں
ہوئیں۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ خاندان کے ایک
مخصوص دائرے کے اندر سبھی شوہر اور سبھی بیویاں مشترک
ہوتی تھیں لیکن بیویوں کے بھائی ــــ ابتدا میں سگے بھائی اور
آگے چل کر ہم جدی بھائی بھی ــــ اس دائرے سے الگ رکھے
جاتے تھے۔ اور اسی طرح دوسری طرف شوہروں کی بہنیں
بھی اس دائرے سے الگ رکھی جاتی تھیں۔

رشتے ناتوں کے وہ سبھی مدارج جن کا اظہار امریکی نظام میں ہوتا ہے، خاندان کی اس شکل میں ہمیں پوری صحت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ میری ماں کی بہنوں کے بچے اب تک اس کے بھی بچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح میرے باپ کے بھائیوں کے بچے میرے باپ کے بھی بچے ہوتے ہیں۔ اور وہ سب میرے بھائی بہن ہوتے ہیں۔ لیکن میری ماں کے بھائیوں کے بچے اب اس کے بھتیجے بھتیجیاں کہلاتے ہیں اور میرے باپ کی بہنوں کے بچے، اس کے بھانجے بھانجیاں۔ اور وہ سب میرے ممیرے پھوپھیرے بھائی بہن ہیں۔ کیونکہ میری ماں کی بہنوں کے شوہر اس کے بھی شوہر ہوتے ہیں اور میرے باپ کے بھائیوں کی بیویاں اس کی بھی بیویاں ہیں — اگر عملاً ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تو اصولاً تو اس کو مانا جاتا ہی ہے — بھائیوں اور بہنوں میں جنسی تعلق کی سماجی ممانعت کی وجہ سے اب رشتے کے بھائی بہن جو اب تک بلا امتیاز اپنے بھائی بہن سمجھے جاتے تھے، اب دو درجوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کچھ تو پہلے کی طرح ہم جدی بھائی بہن رہتے ہیں۔ باقی کو یعنی ایک طرف بھائیوں کی اولاد کو اور دوسری طرف بہنوں کی اولاد کو اب آپس میں بھائی بہن نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے والدین یا ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں مشترک نہیں ہو سکتے اور اس لئے پہلی بار یہ ضروری ہؤا کہ بھانجے بھانجیوں، بھتیجے بھتیجیوں اور ممیرے، پھوپھیرے بھائی بہنوں کا امتیاز قائم کیا جائے جو پہلے کے خاندانی نظام میں بےمعنی ہوتا۔ سگوتری

یا ہم خاندانی کا امریکی نظام، خاندان کی ہر اس شکل میں جس کی بنیاد انفرادی شادی پر ہو، نہایت مہمل اور بےمعنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پونالوان خاندان کی بنیاد پر اس نظام کی ایک ایک بات معقول اور فطری ثابت ہوتی ہے۔ جس حد تک سگوتری یا ہم خاندانی کے اس نظام کا رواج تھا، کم سے کم اسی حد تک، پونالوان خاندان کا یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل کا رواج رہا ہوگا۔

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خاندان کی یہ شکل ہوائی میں موجود تھی اور اگر امریکہ میں اسپین سے گئے ہوئے سابقہ ہسپانوی راہبوں کی طرح کے دھرماتما پادری ان غیرمسیحی رشتوں کو صرف «بدکاری» * نہ سمجھتے تو غالباً سارے پولینیزیا میں خاندان کی یہ شکل نظر آ سکتی۔ سیزر کے زمانہ میں برطانیہ والے بربریت کی درمیانی منزل سے گذر

---

* اب اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ بلا فرق و امتیاز جنسی تعلق کے وہ آثار، اس کے نام نہاد «Sumpfzeugung»، جن کو باخوفن سمجھتا تھا کہ اسی نے سب سے پہلے دریافت کیا ہے، گروہ وار شادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ «اگر باخوفن ان «پونالوان» شادیوں کو «غیرقانونی» سمجھتا ہے تو اسی طرح اس زمانہ کا آدمی آج کل کی، قریب یا دور کے رشتے کے بھائی بہنوں کی آپس کی، شادیوں میں سے زیادہ تر کو بدکاری یعنی سگوتر بھائیوں اور بہنوں کی شادی سمجھےگا» (مارکس)۔ (نوٹ از اینگلس۔)

رهے تھے ۔ اور جب سیزر ان کے بارے میں کہتا ہے کہ «دس دس اور بارہ بارہ کے گروہوں میں وہ لوگ مشترک بیویاں رکھتے تھے اور زیادہ‌تر بھائی بھائی مشترک بیویاں رکھتے تھے اور باپ اور بیٹے ساتھ ساتھ ۔» تو ظاہر ہے کہ یہ بات گروہ وار شادی پر ہی صادق آ سکتی ہے ۔ عہد بربریت کی ماؤں کے دس یا بارہ بیٹے اتنے بڑے نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ مشترک بیویاں رکھہ سکیں ۔ لیکن امریکہ میں پائے جانے والے سگوتری نظام میں جو کہ پونالوان خاندان سے مطابقت رکھتا ہے، بھائیوں کی تعداد بہت بڑی ہوتی ہے کیونکہ ایک آدمی کے دور و نزدیک کے رشتے کے سبھی بھائی اپنے بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ سیزر کا یہ فقرہ «باپ اور بیٹے ساتھ ساتھ» شاید غلط فہمی کا نتیجہ ہے ۔ لیکن اس نظام میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ باپ اور بیٹے یا ماں اور بیٹی شادی کے ایک ہی گروہ میں ہوں، اگرچہ باپ اور بیٹی یا ماں اور بیٹے ایک ہی گروہ میں نہیں ہو سکتے تھے ۔ اسی طرح ہیروڈوٹس اور دوسرے قدیم مصنفوں نے وحشی اور بربر لوگوں میں بیویوں کے مشترک ہونے کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ بھی گروہ وار شادی کی اس شکل یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل کی بنیاد پر ہی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہیں ۔ واٹسن اور کئے نے اپنی کتاب «ہندوستان کے باشندے»* میں دریائے گنگا کے شمال میں

* Watson J. F. and Kaye J. W., People of India. Vols. I–VI. London, 1868—1872, (اڈیٹر ۔)

رهنےوالے اودھ کے ٹھاکروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ «وہ بڑی تعداد میں تقریباً بغیر کسی فرق اور امتیاز کے (یعنی جنسی مفہوم میں) ساتھ رهتے هیں اور جب دو آدمیوں کی شادی هوتی هے تو یہ رشتہ محض برائے نام هوتا هے۔»

زیادہ تر صورتوں میں ایسا معلوم هوتا هے کہ گن کے ادارے کی ابتدا براہ راست پونالوان خاندان سے هوئی۔ اس میں شک نہیں کہ آسٹریلیا کا طبقاتی نظام بھی اس کا نقطۂ آغاز هو سکتا تھا * ۔ آسٹریلیا کے باشندوں میں گن موجود هیں لیکن ان میں پونالوان خاندان کا وجود نہیں هے۔ ان کے یہاں گروہ وار شادی کی ایک اور زیادہ بھونڈی شکل ملتی هے۔

گروہ وار خاندان کی سبھی شکلوں میں جہاں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی هے کہ بچے کی ماں کون هے وهاں کہیں بھی اس کا یقین نہیں هوتا کہ اس کا باپ کون هے۔ اگرچہ عورت اپنے پورے خاندان کے سبھی بچوں کو اپنا کہتی هے اور سب کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی هے، پھر بھی وہ یہ جانتی هے کہ کون اس کے اپنے بطن سے هے اور کون نہیں۔ اس لئے ظاهر هے کہ جہاں کہیں

---

* یہاں اور اس کے آگے مصنف نے آسٹریلیا کے آدی باسیوں یا قدیم باشندوں میں بڑے بڑے گروهوں کی مشترک شادی کا ذکر کیا هے۔ (اڈیٹر۔)

گروہ وار شادیوں کا رواج ہوتا ہے وہاں صرف ماں کی اولاد کا پتہ چلتا ہے اس لئیے نسل صرف ماں سے چلتی ہے۔ سبھی وحشی قوموں میں اور ان قوموں میں بھی جو بربریت کے ابتدائی دور میں ہیں، یہی بات پائی جاتی ہے۔ باخوفن کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی نے پہلے پہل یہ بات دریافت کی۔ محض ماں کی جانب سے نسل کا سلسلہ اور وقت کے ساتھہ ساتھہ اس کی بنیاد پر وراثت کے جو رشتے قائم ہوئیے، ان کو وہ مادری حق کا نام دیتا ہے۔ اختصار کی خاطر میں اسی اصطلاح کو برقرار رکھنا چاھتا ہوں حالانکہ یہ لفظ کوئی بہت موزوں نہیں ہے کیونکہ سماج کی ترقی کے اس منزل پر قانونی مفہوم میں حقوق کا کوئی سوال ھی نہیں تھا۔

اگر پونالوان خاندان کے دو مخصوص گروہوں میں سے ہم ایک گروہ کو لے لیں یعنی اس گروہ کو جس میں متعدد ماں جائی اور رشتے کی بہنیں ہوتی ہیں (یعنی وہ جو سگی بہنوں کی اولاد ہیں، پہلی، دوسری وغیرہ پشت تک) اور جس میں ان کے ساتھہ ان کے بچے اور ماں کی طرف سے ان کے سگے اور رشتے کے بھائی بھی شامل ہوتے ہیں (جو ہمارے مفروضہ کے مطابق ان کے شوہر نہیں ہو سکتے) تو یہ انہیں اشخاص کا دائرہ ہوگا جو گن کی ابتدائی شکل میں اس ادارے کے رکن ہوتے ہیں۔ ان سبھوں کی مشترک مورث اعلی ایک عورت ہوتی ہے۔ اس کے کنبہ کی لڑکیاں اس کی اولاد ہونے کی وجہ سے ہر پشت میں ایک دوسرے

کی بہنیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان بہنوں کے شوہر اب ان کے بھائی نہیں ہو سکتے یعنی وہ اس مورث اعلیٰ عورت کی اولاد نہیں ہو سکتے اور اس لئے وہ اس سگوتری گروہ میں جو آگے چل کر گن بنا، شامل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کے بچے اس گروہ میں شامل ہیں کیونکہ ماں کی نسل ہی فیصلہ‌کن ہے اور یہ اس لئے کہ صرف اسی کا یقین ہے۔ جب ایک مرتبہ سبھی ماں جائے بھائیوں اور بہنوں میں اور ان میں بھی جو ماں کی طرف سے دور کے رشتے کے بھائی بہن ہیں، جنسی تعلقات پر روک لگا دی جاتی ہے تو یہی گروہ گن میں بدل جاتا ہے — یعنی ماں کی جانب سے رشتہ داروں کا ایک نہایت محدود حلقہ بن جاتا ہے جنہیں آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور اس وقت سے یہ دوسرے عام سماجی اور مذہبی اداروں سے اپنے آپ کو برابر تقویت پہونچاتا رہتا ہے اور اپنے قبیلے کے دوسرے گنوں سے اپنے کو علیحدہ کرتا جاتا ہے۔ آگے چل کر ہم اس پر زیادہ تفصیل سے غور کریں گے۔ لیکن جب ہم پاتے ہیں کہ پونالوان خاندان سے گن کا ارتقا محض منطقی ضرورت کے طور پر ہی ثابت نہیں بلکہ ظاہر بھی ہے تو پھر تقریباً پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے کی بنیاد مل جاتی ہے کہ ان تمام قوموں میں جن میں گن کا سراغ ملتا ہے یعنی تقریباً سبھی بربری اور متمدن قوموں میں پہلے خاندان کی یہ شکل موجود تھی۔

جس وقت مارگن نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت تک گروہ وار شادی کے بارے میں ہماری واقفیت بہت کم تھی۔ اس وقت آسٹریلیا کے باشندوں میں، جو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، گروہ وار شادی کے رواج کے بارے میں کچھہ باتیں معلوم تھیں۔ اس کے علاوہ مارگن نے ۱۸۷۱ء میں وہ ساری چیزیں شائع کر دی تھیں جو اسے ہوائی کے پونالوان خاندان کے بارے میں معلوم تھیں۔ پونالوان خاندان سے ایک طرف تو امریکی انڈینوں میں پایا جانے والا سگوتری یا ہم خاندانی کا نظام پوری طرح سمجھہ میں آ جاتا تھا اور اسی نظام سے مارگن کی تمام چھان بین کی ابتدا ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس سے مادری حق والے گن کے ارتقا کی پہلی کڑی مل جاتی تھی۔ اور آخر میں، وہ آسٹریلیا کے طبقوں کے مقابلہ میں ارتقا کی زیادہ اونچی منزل کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ مارگن نے کیوں پونالوان خاندان کو، جوڑا خاندان سے پہلے کی، ارتقا کی ایک ضروری منزل قرار دیا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ پہلے زمانہ میں اس کا عام رواج تھا۔ اس کے بعد ہمیں گروہ وار شادی کی اور بھی کئی شکلوں کا پتہ چلا ہے اور اب ہم جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں مارگن حد سے زیادہ آگے بڑھہ گیا تھا۔ پھر بھی خوش‌قسمتی سے اس کو اپنے پونالوان خاندان میں گروہ وار شادی کی اعلیٰ‌ترین اور بنیادی (کلاسیکی) شکل مل گئی جس سے ایک زیادہ اونچی منزل کی طرف خاندان کے ارتقا کو زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

گروہ وار شادی کے متعلق ہم اپنی معلومات میں سب سے زیادہ بنیادی اضافہ کے لئے ایک انگریز پادری لاریمر فیسون کے احسان مند ہیں۔ اس نے شادی کی اس شکل کا مطالعہ برسوں اس کے اصلی وطن آسٹریلیا میں رہ کر کیا تھا۔ جنوبی آسٹریلیا میں ماؤنٹ گمبیر کے علاقے میں رہنے والے حبشیوں میں اسے اس کے ارتقا کا سب سے ابتدائی دور ملا تھا۔ وہاں پورا قبیلہ دو بڑے طبقوں میں بٹا ہؤا تھا۔ ایک کا نام تھا کروکی اور دوسرے کا کومائٹ۔ ان میں سے ہر طبقہ کے اندر آپس میں جنسی تعلقات کی سخت ممانعت تھی۔ اس کے برعکس ایک طبقہ کا ہر مرد دوسرے طبقہ کی ہر عورت کا پیدائشی شوہر اور وہ اس کی پیدائشی بیوی ہوتی تھی۔ افراد کا نہیں بلکہ پوری کی پوری جماعت کا، پورے کے پورے طبقہ کا، ایک دوسرے کے ساتھ بیاہ ہوتا تھا۔ اور یہ خیال رہے کہ یہاں عمر کے فرق یا کسی خاص خونی رشتہ کی وجہ سے کوئی پابندی نہیں لگتی تھی۔ پابندی صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ اپنے طبقہ کے اندر کسی کے ساتھ جنسی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ کومائٹ طبقہ کی ہر عورت کروکی طبقہ کے ہر مرد کی بیوی تھی اور چونکہ مادری حق کی رو سے کومائٹ عورت کے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی بھی کومائٹ تھی، اس لئے وہ لڑکی بھی کروکی طبقہ کے ہر مرد کی، جس میں اس کا باپ بھی شامل تھا، پیدائشی بیوی تھی۔ بہرحال اس طبقاتی تنظیم نے، جیسا کہ ہم اس کو جانتے ہیں، یہاں اس پر کوئی

پابندی نہیں لگائی۔ اس لئے یہ تنظیم یا تو ایک ایسے زمانہ میں قائم ہوئی ہوگی جبکہ بہت قریبی رشتہ داروں کے ساتھ جنسی تعلق پر پابندی لگانے کی تمام تر دھندلی خواہشات کے باوجود ماں باپ اور بچوں کے جنسی تعلق کو بہت زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا ـــ اور ایسی صورت میں یہ طبقاتی نظام براہ راست آزاد جنسی تعلق کی حالت سے پیدا ہؤا ہوگا ـــ اور یا پھر طبقوں کے قائم ہونے سے پہلے ہی ماں باپ اور بچوں کے جنسی تعلق پر رسم و رواج نے پابندی لگا رکھی ہوگی اور ایسی صورت میں موجودہ حالت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سگوتر خاندان قائم تھا اور یہ موجودہ حالت اس کے بعد ارتقا کی پہلی منزل تھی۔ یہ دوسرا مفروضہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آسٹریلیا میں والدین اور اولاد کے درمیان جنسی تعلق کی کوئی مثال نہیں ملی ہے۔ عام طور پر گوت باہر شادی کی بعد کی شکل، یعنی مادری حق والے گن کے وجود کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ ایسے تعلقات کی جو ممانعت تھی وہ اس کے قائم ہونے سے پہلے سے موجود ہو۔

جنوبی آسٹریلیا کے ماؤنٹ گمبیر کے علاوہ یہ دو طبقہ والا نظام اس سے اور زیادہ مشرق میں دریائے ڈارلنگ کے کنارے اور شمال مشرق میں کوئنس لینڈ میں بھی پایا جاتا ہے۔ غرضکہ یہ نظام دور دور تک پھیلا ہؤا تھا۔ اس نظام میں صرف ماں جائے بھائی بہنوں میں، بھائیوں کی اولاد میں

اور ماں کی طرف سے بہنوں کی اولاد میں شادی کرنا منع
ہے کیونکہ یہ سب ایک ہی طبقہ میں شامل ہیں۔ اس کے
برعکس بھائی بہن کے بچوں میں شادی کی اجازت ہے۔ بہت
قریبی رشتہ داروں میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے پر
پابندی لگانے کے لئے، دریائے ڈارلنگ کے ساحل پر نیو
ساؤتھ ویلس میں کمیلاروئی قبیلہ میں اور بھی کئی قدم
اٹھائے گئے تھے۔ وہاں پرانے دو طبقے بٹ کر چار ہو گئے
تھے اور ان چار طبقوں میں سے ہر طبقہ کی شادی دوسرے
کسی ایک طبقہ کے ساتھ ہوتی تھی۔ پہلے دو طبقے پیدائشی
طور پر ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے تھے۔ ان
کے بچے تیسرے یا چوتھے طبقہ میں شامل ہو جاتے جس کا
انحصار اس بات پر تھا کہ ماں کا تعلق پہلے طبقہ سے ہے
یا دوسرے سے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے طبقہ کی
شادی ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی تھی اور ان کی اولاد
پھر پہلے یا دوسرے طبقے میں شامل ہوتی۔ اس طرح ایک
پشت کے لوگ ہمیشہ پہلے اور دوسرے طبقہ میں ہوتے تھے
اور دوسری پشت کے لوگ ہمیشہ تیسرے اور چوتھے میں۔
اور اس کے بعد کی پشت کے لوگ پھر پہلے یا دوسرے
طبقہ میں ہوتے تھے۔ اس نظام میں ماں کی جانب سے
(یعنی ممیرے، خلیرے) بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے بیٹیوں
میں شادی نہیں ہو سکتی لیکن ان کے پوتے پوتیوں میں ہو
سکتی ہے۔ یہ ایک عجیب پیچیدہ نظام ہے جس کی پیچیدگی
اس وجہ سے اور بڑھہ جاتی ہے کہ اس پر، بہر صورت آگے

چل کر، مادری حق والے گن کا پیوند لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس میں نہیں جائیں گے۔ مختصر یہ کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت قریبی رشتہ داروں میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے رواج پر پابندی لگانے کا جذبہ بار بار اثر انداز ہوتا رہا ہے لیکن مقصد کا واضح احساس نہ ہونے کی وجہ سے وہ آپ ہی آپ گویا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

گروہ وار شادی آسٹریلیا میں اب بھی طبقہ وار شادی ہے، جس میں مردوں کے پورے طبقہ کی جو اکثر اس براعظم کے طول و عرض میں بکھرا ہؤا ہوتا ہے، عورتوں کے ایک پورے طبقے سے جو اسی طرح بکھرا ہوتا ہے، شادی ہوتی ہے۔ یہ گروہ وار شادی زیادہ نزدیک سے دیکھنے پر اتنی بھیانک اور قابلِ‌نفرت نہیں معلوم ہوگی جتنی ان کم‌ظرفوں کو معلوم ہوتی ہے جن کے خیالات چکلہ گھروں کے تصور سے داغدار ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس کتنے ہی برس گذر گئے تھے مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گروہ وار شادی جیسی کوئی چیز ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ابھی حال میں پھر اس کے وجود کو ماننے سے انکار کیا گیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی یک زوجگی ہے اور کہیں کہیں کثرت ازواج ہے جس میں کبھی کبھار بے وفائی بھی کی جاتی ہے۔ ان ازدواجی تعلقات کو متعین کرنے والے قانون کا پتہ لگانے کے لئے برسوں مطالعہ کرنے

کی ضرورت ہے جیسا کہ فیسون اور ہاوٹ نے کیا تھا۔ اپنی عملی شکل میں تو ان تعلقات میں ایک عام یورپین کو وہی چیز نظر آتی ہے جو خود اس کے اپنے ملک میں رائج ہے — جس قانون کے مطابق آسٹریلیا کا ایک حبشی جب ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں اور ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں گھومتا ہؤا اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، اجنبی لوگوں میں پہونچ جاتا ہے، جن کی زبان بھی وہ نہیں سمجھ سکتا تو وہاں اسے اکثر ایسی عورتیں مل جاتی ہیں جو نہایت معصومیت کے ساتھ اور بلا کسی جبر و اکراہ کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہیں۔ اور جس قانون کے مطابق ایک شخص جس کی کئی بیویاں ہوں، اپنی ایک بیوی کو رات میں اپنے مہمان کے پاس بھیج دیتا ہے۔ جہاں یورپ والوں کو محض بدکرداری اور بے راہ روی اور بے قانونی نظر آتی ہے، وہاں دراصل قانون کی پوری فرماں روائی ہے۔ وہ عورتیں اس اجنبی مرد کے ازدواجی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لئے اس کی پیدائشی بیویاں ہیں۔ وہی اخلاقی قانون جو ان کو ایک دوسرے کے لئے جائز کرتا ہے وہی قانون ازدواجی طبقہ سے باہر جنسی تعلقات پر پابندی لگاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر ذات برادری اور قبیلے سے باہر کرنے کی سزا دیتا ہے۔ جب کبھی عورتوں کو اغوا کیا جاتا ہے — جیسا بعض جگہ اکثر ہوتا ہے اور بعض علاقوں میں ہمیشہ ہی ہوتا ہے — تو اس میں بھی سختی کے ساتھ اس طبقہ واری قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

یہاں عورتوں کے اغوا سے ابھی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انفرادی شادی کی طرف قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ کم سے کم جوڑا شادی کی صورت میں تو یہاں اس کی ایک جھلک ملتی ہی ہے۔ ایک نوجوان مرد جب خود یا اپنے دوستوں کی مدد سے لڑکی کو اغوا کر لے جاتا ہے تو یکے بعد دیگرے وہ سب اس کے ساتھہ ہم بستری کرتے ہیں۔ لیکن بیوی وہ اسی نوجوان کی سمجھی جاتی ہے جس نے اس کو اغوا کیا ہے۔ اور اس کے برعکس اگر وہ اغوا کی ہوئی عورت اس مرد کے پاس سے بھاگ جائے اور دوسرے مرد کے ہاتھوں میں پڑ جائے تو وہ اس دوسرے کی بیوی ہو جائے گی اور پہلے مرد کا حق ختم ہو جائے گا۔ غرضکہ گروہ وار شادی کے نظام میں، جو عام طور پر ابھی تک قائم ہے، اس کے پہلو بہ پہلو اور اس کے اندر انفرادی رشتے، زیادہ یا کم عرصہ کے لئے جوڑا بناکر رہنے اور کئی کئی بیویاں رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ گروہ وار شادی کا نظام یہاں بھی رفتہ رفتہ مٹ رہا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یورپ کے اثر کی وجہ سے پہلے کون مٹے گا ــ گروہ وار شادی کا نظام یا آسٹریلیا کے حبشیوں کی یہ نسل جس میں اس کا رواج ہے۔

بہرحال، پورے کے پورے طبقوں کی شادی، جس کا رواج آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے، گروہ وار شادی کی سب سے ادنی اور ابتدائی شکل ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے پونالوان خاندان اس کے ارتقا کی سب سے اعلی شکل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی شکل کا تعلق خانہ بدوش و حشیوں کی سماجی حالت سے ہے اور دوسری کے لئے قدیم کمیونسٹی برادریوں کی کم و بیش مستقل بستیاں ضروری تھیں۔ اور س کے بعد ہم براہ راست ارتقا کی دوسری اور اس سے اعلی منزل میں پہنچ جاتے ہیں۔ بلا شک ان دونوں کے بیچ میں ارتقا کی چند درمیانی منزلیں بھی ملیں گی لیکن ابھی تو ہم نے تحقیق و تفتیش کا دروازہ کھولا ہی ہے۔

۳۔ جوڑا خاندان۔ کم یا زیادہ عرصہ کے لئے جوڑا بناکر رہنے کا رواج گروہ وار شادی کے دنوں میں ہی یا اس سے کچھ پہلے بھی شروع ہو چکا تھا۔ مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں جن میں ایک خاص بیوی ہوتی تھی (جس کو سب سے چہیتی بیوی کہنا ابھی غلط ہوگا) اور عورت کے متعدد شوہروں میں وہ اس کا خاص شوہر ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی جس سے پادریوں کو بڑی الجھن ہوئی۔ انہیں گروہ وار شادی میں کبھی بیویوں کی عام ساجھےداری اور آزاد جنسی تعلق دکھائی دیا اور کبھی محض زناکاری نظر آئی۔ لیکن جیسے جیسے گن کی ترقی ہوئی اور ایسے «بھائیوں» اور «بہنوں» کے طبقے بڑھتے گئے جن میں شادی نہیں ہو سکتی تھی ویسے ویسے لوگوں کی جوڑوں میں رہنے کی عادت بھی لازمی طور پر بڑھتی گئی۔ گن نے خون کے رشتہ داروں میں شادی کو روکنے کے رجحان کو تقویت دے کر، اس چیز کو اور آگے بڑھایا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایراکواس اور امریکہ کے اکثر دوسرے انڈین

قبیلوں میں جو بربریت کے ابتدائی دور میں ہیں، ان سبھی رشتہ داروں میں شادی کی ممانعت ہے جن کو ان کا نظام رشتہ‌دار مانتا ہے اور ایسے رشتہ داروں کی کئی سو قسمیں ہیں۔ شادی پر پابندیوں کی اس بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے گروہ وار شادی کو زیادہ سے زیادہ ناممکن بنا دیا۔ اس کی جگہ جوڑا بناکر رہنے والا خاندان آیا۔ اس میں ایک مرد اور ایک عورت ساتھہ رہتے ہیں۔ لیکن مرد کو کئی بیویاں کرنے اور گاھے بگاھے بےوفائی کرنے کا حق رہتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ اقتصادی وجہوں سے کئی شادیوں کے حق سے بہت کم مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف عورت جب تک ساتھہ رہتی ہے، اس سے پوری وفاداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسے زناکاری کی نہایت سخت سزا دی جاتی ہے۔ لیکن مرد عورت جب چاہیں آسانی سے شادی کے اس رشتہ کو توڑ سکتے ہیں اور بچے پہلے کی طرح اب بھی صرف ماں کے ہونگے۔

خون کے رشتہ داروں میں آپس میں شادی پر پابندیاں برابر بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور اس میں قدرتی انتخاب کا اصول بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ مارگن کے لفظوں میں «غیرسگوتری گنوں میں شادی کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے زیادہ تنومند اور قوی نسل پیدا ہوئی۔ جب دو ترقی پذیر قبیلے مل کر ایک ہوتے ہیں تو... ایک نئی کھوپری اور دماغ کی نشو و نما ہوتی ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی دونوں کی صلاحیتوں کے برابر ہوتی ہے»۔ چنانچہ گن کی

بنیاد پر جو قبیلے قائم ہوئے انہوں نے اپنے سے زیادہ پسماندہ قبیلوں پر فوقیت حاصل کر لی یا اپنی مثال کے زور سے انہیں اپنے نقش قدم پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا۔

غرضکہ ماقبل تاریخی زمانہ میں خاندان کے ارتقا کی صورت یہ تھی کہ وہ دائرہ جس کے اندر مرد اور عورت کو آپس میں شادی کرنے کی آزادی تھی، روز بروز محدود ہوتا جا رہا تھا۔ شروع میں پورا قبیلہ اس دائرے میں آ جاتا تھا۔ لیکن آگے چل کر پہلے قریبی اور پھر دور کے رشتہ‌دار اس دائرے سے نکال دئیے گئے اور آخر میں تو وہ لوگ بھی اس دائرے سے خارج کر دئیے گئے جن سے محض شادی کا رشتہ تھا، یہاں تک کہ عملاً ہر قسم کی گروہ وار شادی ناممکن ہو گئی۔ اور آخر میں صرف ایک چیز رہ گئی، ایک عورت اور ایک مرد کا جوڑا بنا کر رہنا۔ ان میں اس وقت بہت ہی ڈھیلا ڈھالا تعلق ہوتا تھا۔ یہ گویا کہ ایک سالمہ رہ گیا تھا جس کے منتشر ہونے پر سرے سے شادی ہی مٹ جاتی۔ اسی ایک بات سے یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ جب یک‌زوجگی کی ابتدا ہوئی تو موجودہ مفہوم میں انفرادی جنسی محبت کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس دور کے لوگوں کا رویہ دیکھئے تو یہ بات اور بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے۔ خاندان کی پہلے کی شکلوں میں مردوں کو کبھی عورتوں کی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ عورتیں ہوتی تھیں۔ لیکن اب اس کے برعکس عورتوں کی کمی ہو گئی اور ان کی جستجو

ہونے لگی۔ اس لئے جوڑا بنانے کے رواج کے ساتھہ ساتھہ عورتوں کو اغوا کرنے اور ان کو خریدنے کا سلسلہ شروع ہؤا۔ یہ باتیں اپنے سے کہیں زیادہ گہری تبدیلی کا پتہ دے رہی تھیں۔ لیکن اس علامت سے زیادہ ان کی اور کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن ان علامتوں کو، عورتوں کو حاصل کرنے کے ان مختلف طریقوں کو، اسکاٹلینڈ کے ایک کٹھہ ملا میکلینن نے مختلف قسم کے خاندانوں کی حیثیت دے دی۔ ان کو اس نے «اغوا کے ذریعہ شادی» اور «خرید و فروخت کے ذریعہ شادی» کا نام دیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کے انڈینوں اور کچھہ اور قبیلوں میں بھی (جو ارتقاء کے اسی دور میں ہیں) شادی طے کرنا ان دونوں فریق کا کام نہیں جن کی شادی ہوتی ہے بلکہ ان کی رائے تو اکثر پوچھی تک نہیں جاتی۔ یہ کام ان دونوں کی ماؤں کا ہے۔ چنانچہ اس طرح اکثر ایسے لوگوں کی منگنی کر دی جاتی ہے جو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہیں اور جنہیں اپنی شادی کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب اس کے دن نزدیک آ جاتے ہیں۔ شادی سے پہلے دولہا کی طرف سے دلہن کے رشتہ داروں کو (یعنی اس کی ماں کی طرف کے رشتہ داروں کو، اس کے باپ یا اس کے رشتہ داروں کو نہیں) تحفے دئے جاتے ہیں۔ یہ تحفے دراصل اس لڑکی کی قیمت ہوتی ہے۔ شوہر اور بیوی دونوں میں سے کوئی بھی اپنی مرضی سے شادی کو توڑ سکتا ہے۔ لیکن متعدد قبیلوں میں، مثال کے طور پر ایراکواس قبیلوں میں لوگ عام طور پر

شادی کے بعد علیحدگی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے تو گن کی بنیاد پر جو فریقین کے رشتہ دار ہوتے ہیں وہ بیچ بچاؤ کرتے اور دونوں کو پھر سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب ان کوششوں میں کسی طرح کامیابی نہیں ہوتی تب کہیں شادی کا رشتہ توڑا جاتا ہے۔ ایسا ہونے پر بچے ماں کے ساتھہ رہتے ہیں اور فریقین میں سے ہر ایک کو دوبارہ شادی کی اجازت ہوتی ہے۔

جوڑا بناکر رہنے والا خاندان اتنا کمزور اور غیرمستقل ہوتا تھا کہ الگ خانہ داری کی اس کو کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اس کے لئے کوئی مفید چیز بھی نہیں تھی۔ لہذا قدیم زمانہ سے جو کمیونسٹی گھرانہ چلا آ رہا تھا، وہ اس جوڑا خاندان کی وجہ سے ٹوٹا نہیں۔ لیکن کمیونسٹی گھرانے میں گھر کے اندر عورت کا بول بالا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے محض سگی ماں کا پتہ ہونے اور باپ کے بارے میں یقین کے ساتھہ کچھہ نہ کہہ سکنے کی وجہ سے عورت یعنی ماں کی قدر اور عزت بہت زیادہ کی جاتی تھی۔ یہ بالکل بےبنیاد خیال ہے کہ جب سماج کی ابتدا ہوئی اس وقت عورت مرد کی غلام تھی۔ یہ خیال ہمیں اٹھارھویں صدی کے «عہد روشن خیالی» سے وراثت میں ملا ہے۔ عہد وحشت اور عہد بربریت کے ابتدائی اور درمیانی دور کے اور ایک حد تک آخری دور کے لوگوں میں بھی عورتیں نہ صرف یہ کہ آزاد تھیں بلکہ ان کو ایک بڑی باعزت حیثیت حاصل

تھی۔ آرتھر رائٹ نے، جو کئی برس تک ایراکواس لوگوں کے سنیکا قبیلہ میں پادری تھا، اس بات کی تصدیق کی ھے کہ اس وقت تک جوڑا خاندان میں عورت کا رتبہ بہت اونچا تھا۔ «جہاں تک ان کے خاندانی نظام کا تعلق ھے. جب یہ لوگ پرانے لمبے گھروں میں رھتے تھے (یہ کمیونسٹی گھرانے تھے جن میں متعدد خاندان شامل تھے)... تو غالباً ان میں کسی ایک جرگہ (گن) کا غلبہ ھوتا تھا۔ عورتیں دوسرے جرگوں (گنوں) کے لوگوں کو شوھر بناتی تھیں۔ گھر میں عموماً عورتوں کی حکمرانی تھی۔ مال اسباب مشترک ھوتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بدنصیب شوھر یا عاشق اتنا نالایق ھوتا کہ اپنے حصہ کا کام نہ کر سکتا تو اس بےچارے کی شامت آ جاتی تھی۔ پھر چاھے اس کے کتنے ھی بچے ھوں اور گھر میں اس کا کتنا ھی سامان پڑا ھو، اس کو کسی وقت بھی بوریا بستر باندھکر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ اور ایک مرتبہ حکم مل جانے پر اس کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ گھر اس کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا اور اسے مجبور ھوکر خود اپنے جرگے (گن) میں واپس ھو جانا پڑتا تھا یا ــــ جیسا کہ اکثر ھوتا تھا ــــ کسی اور جرگہ میں جاکر پھر شادی کی کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور سبھی جگہوں کی طرح جرگوں (گنوں) کے اندر بھی عورتوں کا بڑا اقتدار تھا۔ جب کبھی ضرورت ھوتی وہ بلا پس و پیش سردار کو معزول کرکے عام سپاھیوں کی صف میں بھیج دیتی تھیں، یا اس

زمانہ کی اصطلاح میں، اس کے سینگ توڑ دیتی تھیں۔»
قدیم زمانہ میں عام طور پر عورتوں کا بول بالا تھا۔ اس کی
مادی بنیاد یہی کمیونسٹی گھرانے تھے جس کی زیادہ‌تر عورتیں
اور کبھی کبھی تو سبھی عورتیں ایک گن کی ہوتی تھیں اور
مرد دوسرے مختلف گنوں کے ہوتے تھے۔ اس چیز کی
دریافت کا سہرا بھی باخوفن کے سر ہے۔ یہ اس کا تیسرا
بڑا کارنامہ ہے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہہ دوں کہ
سیاحوں اور پادریوں نے جو رپورٹیں دی ہیں کہ وحشی اور
بربر قوموں میں عورتوں کو بڑی محنت مشقت کرنی پڑتی
ہے تو اس سے مذکورہ بالا باتوں کی تردید نہیں ہوتی۔
جن اسباب کی بنیاد پر عورتوں اور مردوں میں کام کی
تقسیم ہوتی ہے وہ ان اسباب سے بالکل مختلف ہیں جن سے
سماج میں عورتوں کا رتبہ طے ہوتا ہے۔ ان قوموں میں،
جن کی عورتیں اس سے کہیں زیادہ محنت مشقت کرتی
ہیں جتنی ہم یورپ والے مناسب سمجھتے ہیں، عورتوں کی
کہیں زیادہ سچی عزت ہوتی ہے۔ تمدن کے عہد کی وہ
نازپروردہ خواتین جن کی زندگی جھوٹی نازبرداری کے ماحول
میں بسر ہوتی ہے اور جنہیں سچ مچ کے کام کاج سے
کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کا سماجی رتبہ عہد بربریت کی
سخت محنت مشقت کرنے والی عورتوں کے رتبہ سے بہت
نیچا ہوتا ہے۔ عہد بربریت کی عورتوں کو ان کی جاتیوں
کے مرد سچ مچ مالکن (مالکن — lady, frowa, Frau) سمجھتے تھے
اور سماج میں دراصل یہی ان کی حیثیت بھی تھی۔

امریکه میں اب گروہ وار شادی کی جگه جوڑا بیاہ مکمل طور پر رائج ہو چکا ہے یا نہیں، اس کا فیصله کرنے کے لئے شمال مغربی اور خاص کر جنوبی امریکه کی قوموں کے حالات کا زیادہ گہرا مطالعه کرنے کی ضرورت ہے۔ یه سب قومیں ابھی تک عہد وحشت کے آخری دور میں ہیں۔ جنوبی امریکه کی قوموں میں جنسی آزادی کی اتنی مثالیں ملتی ہیں که ان کو دیکھتے ہوئے ہم یه نہیں کہه سکتے که گروہ وار شادی بالکل مٹ چکی ہے۔ اس کے سارے اثرات تو یقیناً نہیں مٹے ہیں۔ شمالی امریکه کے کم سے کم چالیس قبیلوں میں یه رواج ہے که جو شخص کسی خاندان کی سب سے بڑی لڑکی سے شادی کرتا ہے اس کا حق سبھی بہنوں پر ہو جاتا ہے۔ بالغ ہونے پر انہیں بھی وہ اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ یه اس دور کی بچی کھچی نشانی ہے جب سبھی بہنوں کے شوہر مشترک ہوتے تھے۔ اور بینکرافٹ بتاتا ہے که جزیرہ نما کیلیفورنیا کے قبیلوں میں (جو عہد وحشت کے آخری دور سے گذر رہے ہیں) کچھه ایسے تیوہار منائے جاتے ہیں جن کے موقع پر متعدد «قبیلے» بلاکسی تفریق و امتیاز کے جنسی مجامعت کی غرض سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے که یه دراصل وہ گن ہیں جن کے یه تیوہار ان بھولے بسرے دنوں کی یاد دلاتے ہیں جب که ایک گن کی سبھی عورتیں دوسرے گن کے سبھی مردوں کی مشترک بیویاں اور ایک گن کے سبھی مرد دوسرے گن کی عورتوں کے مشترک شوہر ہؤا کرتے تھے۔ آسٹریلیا میں آج بھی اس کا رواج ہے۔

کچھہ قوموں میں یہ ہوتا ہے کہ بڑے بوڑھے، سردار اور کاہن پجاری مشترک بیویوں کی رسم سے فائدہ اٹھا کر خود اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور زیادہ‌تر عورتوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کو بھی بعض خاص تیوہاروں اور تقریبوں کے موقع پر پرانی جنسی ساجھےداری کو وقتی طور پر زندہ کرنے کی اجازت دینی پڑتی ہے اور اپنی بیویوں کو یہ موقع دینا ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کے ساتھہ داد عیش دیں۔ وسٹرمارک نے (اپنی کتاب کے صفحہ ۲۸۔۲۹ پر) عیش و نشاط کی ایسی تقریبوں (Saturnalia *) کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جبکہ مختصر عرصہ کے لئے پھر جنسی مباشرت کی پرانی آزادی قائم ہو جاتی ہے۔ مثال کے لئے اس نے بتایا ہے کہ ایسی تقریبیں ہندوستان کی «ہو» جاتی کے لوگوں میں، سنتھالوں میں، بنجا اور کوتار جاتیوں کے لوگوں میں اور افریقہ کی کچھہ قوموں میں ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وسٹرمارک ان تقریبوں کو گروہ وار شادی کی بچی‌کھچی نشانی نہیں مانتا۔ اس خیال کو تو وہ سرے سے ٹھکرا دیتا ہے۔ ان کو وہ جوڑا ملنے کے موسم کا اثر مانتا ہے جو قدیم انسان اور دوسرے حیوانوں دونوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

---

*Saturnalia – (رومن دیوتا ساتورنا کے نام پر)۔ رومائے قدیم میں کھیتی باڑی کا کام ختم ہونے کی خوشی میں جو عام تقریب ہوتی تھی اسے کہتے ہیں۔ اس میں عیش وطرب اور رنگ رلیوں کا بازار گرم ہوتا تھا۔ (اڈیٹر۔)

اب ہم باخوفن کی چوتھی بڑی دریافت کو لیتے ہیں اور وہ ہے گروہ وار شادی سے جوڑا بیاہ کے تغیر کی عام صورت۔ جس چیز کو باخوفن دیوتاؤں کے قدیم احکام کی خلاف ورزی کرنے کا کفارہ یا پرائشچت بتاتا ہے، جو عورت نے اپنی عفت و عصمت کا حق حاصل کرنے کے لئے ادا کیا تھا، وہ دراصل اس کفارے کی ڈھکی چھپی صورت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جس کی قیمت ادا کرکے عورت نے مشترک شوہروں کے پرانے رواج سے چھٹکارا پایا اور اپنے آپ کو صرف ایک ہی مرد کے سپرد کرنے کا حق حاصل کیا تھا۔ یہ کفارہ محدود سپردگی کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ بابل کی عورتوں کو سال میں ایک مرتبہ میلٹا کے مندر میں اپنے آپ کو دینا پڑتا تھا۔ مشرق قریب کی دوسری قوموں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو کئی برس کے لئے اناٹیطس کے مندر میں بھیج دیا کرتے تھے جہاں انہیں اپنی پسند کے مردوں سے آزاد جنسی محبت کا سودا کرنا ہوتا تھا اور اس کے بعد ہی انہیں شادی کرنے کی اجازت مل سکتی تھی۔ بحیرۂ روم سے لے کر دریائے گنگا تک تقریباً سبھی ایشیائی قوموں میں اس طرح کے ریت رواج پائے جاتے ہیں جن پر مذہب کا پردہ پڑا ہؤا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا نجات کے لئے کفارہ کی قربانی ہلکی ہوتی گئی۔ جیسا کہ باخوفن لکھتا ہے: «پہلے ہر سال قربانی دینی پڑتی تھی۔ اب ایک ہی مرتبہ یہ رسم ادا کرنے سے کام چل جاتا ہے۔ پہلے بیاہی عورتوں سے عام جنسی تعلق کا رواج تھا، اب صرف کنواریوں کے ساتھ

ایسا کیا جاتا ہے۔ پہلے ازدواجی زندگی کے دوران میں یہ کرنا پڑتا تھا، اب شادی کے پہلے تک اس پر عمل کرنا کافی ہوتا ہے۔ پہلے بلا فرق و امتیاز ہر کسی کی آغوش میں اپنے آپ کو دینا پڑتا تھا، اب صرف چند مخصوص لوگوں کی آغوش میں دینا پڑتا ہے» («مادری حق»*، صفحہ ۱۹) ۔ دوسری قوموں میں تو یہ مذہبی پردہ بھی نہیں۔ مثلاً قدیم زمانہ میں تھریشیا کے باشندوں میں، کیلٹ لوگوں میں اور ہندوستان کے بہت سے آدی‌باسیوں میں، ملایا کے باشندوں میں، بحیرۂ جنوبی کے جزیروں کے لوگوں میں اور بہت سے امریکی انڈینوں میں تو آج بھی لڑکیوں کو شادی سے پہلے پوری جنسی آزادی ہوتی ہے۔ خاص‌کر جنوبی امریکہ کے تقریباً ہر علاقہ میں یہی صورت ہے۔ اگر کوئی شخص ملک کے اندرونی حصہ میں کسی حد تک بھی گیا ہے تو وہ اس کی تصدیق کرے گا۔ مثال کے طور پر اگاسیز نے («برازیل کی سیاحت»، مطبوعہ بوسٹن اور نیویارک۔ ۱۸۸۶ء **، صفحہ ۲۶۶) انڈین نسل کے ایک دولتمند خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب خاندان کی ایک لڑکی سے اس کا تعارف کرایا گیا اور اس نے اس لڑکی کے باپ کے بارے میں پوچھا جو اس کے خیال میں لڑکی کی ماں کا شوہر تھا اور پیراگوئے کے خلاف جنگ میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے حصہ لے رہا تھا، تو لڑکی کی

* Bachofen J. J., Das Mutterrecht. Stuttgart, 1861. (اڈیٹر۔)

** Agassiz L., A journey in Brasil. Boston, 1886. (اڈیٹر۔)

ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ــ
یہ ایک اتفاق کی پیدائش ہے (naô tem pai, è filha da fortuna) ــ
«انڈین یا دوغلی نسل کی عورتیں اپنے ناجائز بچوں کا ذکر
ہمیشہ اسی طرح کرتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں احساس
تک نہیں ہوتا کہ یہ کوئی غلط یا شرم کی بات ہے ــ اور یہ
کوئی غیرمعمولی بات نہیں بلکہ معاملہ اس کا الٹ ہے ــ (اکثر) بچے
(صرف) اپنی ماؤں کو جانتے ہیں کیونکہ ان کی پرورش کی
ساری ذمہ داری ماں پر ہوتی ہے ــ وہ اپنے باپ کو بالکل نہیں
جانتے اور شاید عورت کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس
کی یا اس کے بچوں کی کوئی ذمہ داری باپ پر ہے ــ» ایک
متمدن آدمی کو جو بات اتنی عجیب معلوم ہوگی وہ دراصل
مادری حق اور گروہ وار شادی کا ایک عام قاعدہ ہے ــ

کچھ اور قوموں میں یہ رواج ہے کہ شادی کے موقع پر
دولہا کے دوست اور رشتہ دار یا شادی میں آئے ہوئے دوسرے
مہمان پرانے روایتی حق کے مطابق پہلے دلہن کے ساتھ
ہمبستری کرتے ہیں اور دولہا کی باری سب سے آخر میں آتی
ہے ــ مثال کے طور پر قدیم زمانہ میں بالیری جزیروں میں
اور افریقہ کے آگیلا لوگوں میں اور موجودہ زمانہ میں حبشہ
کے باریا لوگوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے ــ ان کے
علاوہ دوسری قوموں میں یہ رواج ہے کہ ایک سرکاری آدمی،
قبیلے یا گن کا سردار، کاسیک، شمان، پروہت، پرنس یا جو
بھی اس کا خطاب ہو، پوری برادری کی نمائندگی کرتا ہے اور
دلہن کے ساتھ پہلی رات کا حق ادا کرتا ہے ــ اس رواج

کو کتنے ھی خوش‌رنگ پردوں سے ڈھانکنے کی کوشش کی جائے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی شب کا حق (jus primae noctis) الاسکا علاقہ کے زیادہ‌تر باشندوں میں (دیکھئے بینکرافٹ کی کتاب «دیسی نسلیں»، پہلا حصہ، صفحہ ۸۱)، شمالی میکسیکو کے طاھو لوگوں میں (ایضاً، صفحہ ۵۸٤) اور کچھہ اور جاتیوں میں گروہ وار شادی کی ایک بچی کھچی نشانی کے طور پر آج تک چلا آتا ھے۔ اور زمانہ وسطی میں کم از کم ان ملکوں میں جہاں قدیم کیلٹ جاتی کے لوگ رھتے تھے، اس کا برابر رواج رھا۔ ان میں یہ رسم براہ راست گروہ وار شادی سے نکلی تھی۔ اس کی ایک مثال آراگاں کا علاقہ ھے۔ کیسٹیل میں کسان کبھی زرعی غلام نہیں رھے مگر آراگاں میں بدترین قسم کی زرعی غلامی قائم تھی اور وہ اس وقت تک رھی جب تک کہ ۱٤۸٦ء میں فرڈیننڈ کیتھولک نے ایک فرمان کے ذریعہ اس کو ختم نہ کر دیا۔ اس فرمان میں کہا گیا ھے کہ «ھم فیصلہ دیتے اور اعلان کرتے ھیں کہ اگر کوئی کسان شادی کرتا ھے تو... اوپر جن لارڈوں (senyors, barons) کا ذکر کیا گیا، وہ پہلی رات اس کی دلہن کے ساتھہ نہیں سوئیں گے اور نہ شادی کی رات کو جب عورت سو رھی ھو تو اپنے اقتدار کی نشانی کے طور پر اس عورت اور اس کے بستر کو روندیں گے۔ اور نہ ھی یہ لارڈ کسانوں کے بیٹے اور بیٹیوں سے ان کی مرضی کے خلاف اجرت پر یا اجرت کے بغیر کام لیں گے»۔ (سوگن‌ھائم کی کتاب «زرعی

غلامی» میں اصلی کیٹے لونین زبان ھی میں اقتباس دیا گیا ھے۔ سنٹ پیٹرزبرگ، ۱۸۶۱ء، صفحہ ۳۵*)۔

باخوفن نے برابر یہ کہا ھے کہ اس نظام کو جس کو وہ «ھیتائرازم» یا «Sumpfzeugung» (مشترک شادی کا رواج) کے نام سے یاد کرتا ھے، بدلنے میں عورتوں کا بڑا دخل رھا ھے۔ اس نظام کے بدلے یک زوجگی یعنی ایک مرد ایک عورت کی شادی کا رواج اصل میں عورتوں کی کوششوں سے ھوا۔ اور اس کی یہ رائے بالکل صحیح ھے۔ زندگی کی اقتصادی حالتوں کی نشو و نما کی وجہ سے یعنی قدیم کمیونزم کے زوال اور آبادی کے زیادہ سے زیادہ گنجان ھونے کے ساتھہ ساتھہ پرانے روایتی جنسی تعلقات کی ابتدائی سادگی اور بھولاپن اور اس کا قدیم جنگلی کردار مٹتا گیا اور اتنا ھی زیادہ وہ جنسی تعلق عورتوں کو ھتک آمیز اور ظالمانہ معلوم ھونے لگا۔ قدرتاً ان کے دل میں اس خواھش نے زور پکڑا ھوگا کہ کسی طرح انہیں عفت اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرنے کا حق ملے، کوئی ایسی صورت پیدا ھو کہ وہ اس مصیبت سے نجات پائیں اور ایک وقت میں صرف ایک مرد سے عارضی یا مستقل شادی کر سکیں۔ مردوں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی

---

* ایس۔ سوگن هائم۔ «انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں زرعی غلامی اور بیگاری کے خاتمہ کی تاریخ»۔ یہ کتاب سنٹ پیٹرزبرگ میں ۱۸۶۱ء میں شایع ھوئی تھی۔
(Sugenheim S., Geschichte der Aufhebung der Leibeigenschaft und Hörigkeit in Europa bis an die Mitte des neunzehnten Jahrhunderts. St. Petersburg, 1861.) (اڈیٹر۔)

که وہ اس تبدیلی کو لانے میں پیش قدمی سے کام لیں گے۔ اگر اور باتوں سے ہم آنکھیں بند بھی کر لیں تو بھی مردوں کے ایسا نہ کر سکنے کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ آج تک وہ عملاً گروہ وار شادی کی لذتوں سے دست بردار ہونے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکے ہیں۔ جب عورتوں نے تبدیلی کرا کے جوڑا بیاہ کو رواج دے دیا تب ہی مردوں نے سختی سے یک زوجگی کے اصول پر عمل شروع کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اصول کو انہوں نے محض عورتوں پر ہی لاگو کیا۔

جوڑا خاندان کی ابتدا اس زمانہ میں ہوئی جب عہد وحشت اور عہد بربریت مل رہے تھے یعنی اس کی ابتدا عہد وحشت کے آخری دور میں اور کہیں کہیں تو بربریت کے پہلے دور میں ہوئی۔ خاندان کی یہ شکل عہد بربریت کی خصوصیت ہے اسی طرح جیسے گروہ وار شادی عہد وحشت کی اور یک زوجگی کا اصول تمدن کے عہد کی خصوصیت ہے۔ اس جوڑا خاندان کو ترقی کر کے پائدار یک زوجگی تک پہونچنا تھا۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ ابھی تک جو اسباب کام کر رہے تھے، ان سے مختلف اسباب میدان میں آئیں۔ جوڑا بیاہ میں گروہ گھٹتے گھٹتے اپنی آخری اکائی تک یعنی ایک مرد اور ایک عورت ان دو جوہروں سے مرکب ایک سالمہ تک پہونچ گیا تھا۔ قدرتی انتخاب کے اصول نے گروہ وار شادی کے دائرے کو محدود کرتے کرتے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔ اب اس سلسلہ میں اس کو کچھہ اور نہیں کرنا تھا۔ اب اگر

نئی سماجی قوتیں روح رواں بن کر میدان میں نہ آتیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ جوڑا خاندان سے خاندان کی کوئی نئی شکل جنم لیتی۔ لیکن ان سماجی قوتوں کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

اب ہم جوڑا خاندان کے کلاسیکی وطن امریکہ سے رخصت ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس یہ سوچنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ امریکہ میں خاندان کی اس کے علاوہ کوئی اور ترقی یافتہ شکل قائم ہوئی تھی یا یہ کہ امریکہ کی دریافت سے اور اس پر یورپ والوں کے قبضہ سے پہلے وہاں کسی جگہ بھی سخت قسم کی یک زوجگی قائم ہوئی تھی۔ لیکن پرانی دنیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

وہاں جانور پال کر اور مویشیوں کی نسل بڑھا کر دولت کا ایک نیا سوتا کھول دیا گیا تھا جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے بالکل نئے سماجی رشتے قائم ہونے لگے تھے۔ عہد بربریت کے ابتدائی دور تک غیرمنقولہ دولت میں صرف مکان، کپڑے، بھدے قسم کے زیور اور غذا حاصل کرنے اور پکانے کے سامان، کشتیاں، ہتھیار اور بہت معمولی قسم کے گھر کے برتن تھے۔ غذا ہر روز نئے سرے سے حاصل کرنی ہوتی تھی۔ لیکن اب گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں، بیلوں، بھیڑ بکریوں اور سوروں کی شکل میں گلہ بانی کی زندگی بسر کرنے والی ترقی‌پذیر قوموں کو۔۔۔ پنجاب اور وادیٔ گنگا کے آریوں کو، اس زمانے کے نسبتاً بہت زیادہ سیراب، آمو دریا اور سیر دریا کے ہرے بھرے گھاس کے میدانوں میں رہنے والے آریوں کو اور دجلہ و فرات کے

کنارے رھنے والے سامیوں کو، اتنی کثیر دولت مل گئی تھی جس کی محض دیکھہ بھال اور معمولی نگرانی سے کام چل جاتا تھا ـ یہ دولت دن‌دونی رات چوگنی ہو رہی تھی اور اس سے انہیں دودھہ اور گوشت کی صورت میں نہایت عمدہ اور صحت بخش غذا مل رہی تھی ـ غذا حاصل کرنے کے پہلے کے سبھی طریقے اب پیچھے چھوٹ گئے تھے ـ شکار کرنا جو پہلے ایک ضروری کام تھا اب محض شوق کی چیز رہ گیا ـ

لیکن یہ نئی دولت کس کی تھی؟ ظاھر ھے کہ شروع میں اس پر پورے گن کا قبضہ تھا ـ لیکن مویشیوں کے ریوڑوں پر بہت پرانے زمانہ میں ھی ذاتی ملکیت قائم ھو چکی تھی ـ یہ کہنا مشکل ھے کہ موسی کے نام سے جو پہلی کتاب موسوم ھے اس کے مصنف نے بابا ابراھیم کو جب اپنے گلوں اور مویشیوں کے مالک کی حیثیت سے دیکھا تو وہ اپنے کنبہ کے بزرگ ھونے کے ناتے اپنی ذاتی حیثیت سے اس کے مالک تھے یا ایک گن کے موروثی سردار کی حیثیت سے ـ لیکن ایک بات صاف ھے اور وہ یہ کہ ھم ابراھیم کو موجودہ زمانہ کے مفھوم میں ملکیت کا مالک نہیں کہہ سکتے ـ اسی کے ساتھہ یہ بھی یقینی ھے کہ مستند تاریخ کی ابتدا میں ھمیں ھر جگہ یہی دیکھنے میں آتا ھے کہ مویشیوں کے ریوڑ خاندان کے سرداروں کی اسی طرح علیحدہ ملکیت ھوتے تھے جس طرح بربریت کے عہد کی فنی پیداوار، دھات کے برتن، عیش وعشرت کے سامان اور آخر میں انسانی مویشی یعنی غلام، خاندان کے سرداروں کی الگ الگ ملکیت ھوتے تھے ـ

کیونکہ اب غلامی کا بھی رواج ہو چکا تھا۔ عہد بربریت کے ابتدائی دور کے لوگوں کے لئے غلام کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ کے انڈین لوگ اپنے جنگ کے دشمنوں سے جو سلوک کرتے تھے وہ اس سے بہت مختلف تھا جو بربریت کے آخری دور میں ان سے کیا جاتا تھا۔ مرد یا تو قتل کر دئیے جاتے یا بھائی بناکر فاتحوں کے قبیلے میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ عورتوں سے یا تو شادی کر لی جاتی تھی یا انہیں ان کے بچوں سمیت جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے، قبیلے میں شامل کر لیا جاتا تھا ۔ اس دور میں ابھی انسان کی طاقت محنت سے اتنا نہیں پیدا ہوتا تھا کہ محنت کرنے والے کا اپنا خرچ پورا کرنے کے بعد اس میں سے کچھ بچ سکے۔ لیکن جب مویشی پالے جانے لگے اور ان کی نسل بڑھائی جانے لگی، دھاتوں سے کام لیا جانے لگا، کپڑے کی کتائی بنائی ہونے لگی اور پھر جب کھیت بناکر کھیتی کی جانے لگی تو یہ حالت بدل گئی۔ جس طرح پہلے بیویاں بڑی آسانی سے مل جاتی تھیں مگر بعد میں ان میں قدرتبادلہ پیدا ہو گئی تھی اور وہ خریدی جانے لگی تھیں، اسی طرح بعد میں، خاص کر جانوروں کے ریوڑوں کے خاندانی ملکیت بن جانے کے بعد، انسان کی طاقت محنت بھی خریدی جانے لگی۔ خاندان اتنی تیزی سے نہیں بڑھتا تھا جتنی تیزی سے مویشی کے ریوڑ بڑھتے تھے۔ ریوڑ کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہونے لگی تھی۔ جنگ کے قیدیوں سے یہ کام بہت اچھی طرح لیا جا سکتا تھا۔ اور پھر سب

سے بڑھ‌کر یہ کہ مویشی کی طرح خود ان کی نسل بھی بڑھائی جا سکتی تھی۔

اس طرح کی دولت جب ایک مرتبہ خاندانوں کی نجی ملکیت بن گئی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہؤا تو اس نے اس سماج پر جو جوڑا خاندان اور مادری حق والے گن کی بنیاد پر قائم تھا، کاری چوٹ لگائی۔ جوڑا بیاہ سے خاندان میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سگی ماں کے ساتھ ساتھ اب ایک مستند سگا باپ بھی موجود تھا جو آج کل کے کتنے ہی «باپوں» سے زیادہ مستند تھا۔ خاندان کے اندر اس زمانہ میں جو تقسیم محنت رائج ہو چکی تھی، اس کے مطابق غذا حاصل کرنا اور اس کے لئے ضروری اوزار تیار کرنا مرد کا کام تھا اور اس لئے ان پر ملکیت بھی مرد کی تھی۔ میاں بیوی الگ ہوتے تو جس طرح گھرداری کا سامان عورت کے پاس رہ جاتا، اسی طرح مرد ان اوزاروں کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ چنانچہ اس زمانہ کے سماجی رسم و رواج کے مطابق مرد غذا حاصل کرنے کے لئے نئے ذرائع یعنی مویشیوں کا اور کچھ دنوں کے بعد محنت کے نئے آلات یعنی غلاموں کا بھی مالک ہو گیا۔ لیکن اسی سماج کے رسم و رواج کے مطابق اس کا ترکہ اس کی اولاد کو نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اس معاملہ میں اصل صورت حال یوں تھی:

مادری حق کی رو سے، یعنی جب تک نسل محض عورت سے چلتی تھی اس وقت تک اور گنوں میں وراثت کے ابتدائی رسم و رواج کے مطابق، گن کے کسی رکن کے مرنے پر اس

کا ترکہ پہلے اس کے گن کے رشتہ داروں کو ملتا تھا۔ اصول یہ تھا کہ جائداد گن کے اندر رہے۔ شروع میں، زیربحث اشیائے منقولہ کی کوئی خاص اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ عملاً وہ گن کے سب سے قریبی رشتہداروں کو یعنی ماں کی جانب سے خون کے رشتہ داروں کو مل جاتی ہو۔ لیکن مرنے والے کے بچے اس کے گن کے بچے نہیں بلکہ اپنی ماں کے گن کے بچے ہوتے تھے۔ شروع میں ماں کے اور سبھی رشتہ داروں کے ساتھہ بچوں کو بھی ماں کی جائداد کا ترکہ ملتا تھا اور شاید آگے چل‌کر اس پر ان کا سب سے پہلا حق مان لیا گیا تھا۔ لیکن انہیں اپنے باپ سے کوئی ترکہ نہیں ملتا تھا کیونکہ وہ اس کے گن کے نہیں تھے اور باپ کی ساری دولت کا اس کے گن میں رہنا ضروری تھا۔ لہذا مویشیوں کے گلے کے مالک کے مرنے پر اس کا گلہ سب سے پہلے اس کے بھائیوں اور بہنوں کو اور اس کی بہنوں کی اولاد کو یا اس کی ماں کی بہنوں کی اولاد کو ملتا تھا۔ اس کی اپنی اولاد اس سے محروم رہتی تھی۔

اس طرح جیسے جیسے دولت بڑھتی گئی، ویسے ویسے اس کی وجہ سے ایک طرف خاندان کے اندر عورت کے مقابلہ میں مرد کی اہمیت اور اس کا رتبہ زیادہ اونچا ہوتا گیا اور دوسری طرف مرد کے دل میں یہ خواہش زور پکڑتی گئی کہ وہ اپنی طاقت سے فائدہ اٹھاکر وراثت کے پرانے طریقے کو الٹ دے تاکہ اس کے اپنے بچے حق دار ہو سکیں۔ لیکن جب تک نسل ماں سے چلتی تھی تب تک یہ ناممکن تھا۔ اس لئے

ضرورت تھی کہ مادری حق کو ختم کر دیا جائے۔ اور یہی کیا گیا۔ اور اس میں اتنی مشکل نہیں ہوئی جتنی آج معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس انقلاب سے جو کہ بنی‌نوع انسان کے لئے ایک نہایت ہی فیصلہ‌کن انقلاب تھا، گن کے کسی ایک بھی زندہ رکن کی زندگی میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ سبھی لوگ جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہے۔ صرف اتنا فیصلہ کافی تھا کہ آئندہ گن کے مردوں کی اولاد گن میں رہےگی اور عورتوں کی اولاد اس گن سے الگ کرکے اپنے باپ کے گن میں شامل کر دی جائےگی۔ اس طرح عورتوں سے نسل کا سلسلہ اور ماں سے وراثت پانے کا حق ختم ہو گیا۔ اور اس کے بدلے مردوں سے نسل کا سلسلہ اور باپ سے وراثت پانے کا حق قائم ہوا۔ متمدن قوموں میں یہ انقلاب کب اور کس طرح ہوا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ بالکل ماقبل تاریخ کے زمانہ کی بات ہے۔ لیکن یہ انقلاب ہوا ضرور تھا۔ اور اس کا بہت کافی ثبوت موجود ہے۔ ہمیں جگہ جگہ مادری حق کے کتنے ہی بچے بچائے آثار ملے ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ وہ قابل‌ذکر ہیں جنہیں باخوفن نے جمع کیا ہے۔ یہ انقلاب کتنی آسانی سے ہو جاتا تھا، یہ بات امریکہ کے متعدد انڈین قبیلوں سے ظاہر ہو جاتی ہے، جن کے درمیان یہ انقلاب ابھی حال میں ہوا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ یہاں یہ انقلاب کسی حد تک بڑھتی ہوئی دولت اور زندگی کے بدلے ہوئے حالات (جنگلوں سے آکر میدانوں میں بس جانے) کے زیراثر، اور کسی حد تک تمدن اور پادریوں کے اخلاقی

اثر کے تحت ہو رہا ہے۔ مسوری کے آٹھ قبیلوں میں سے
چھ میں مردوں کی طرف سے نسل اور وراثت کا سلسلہ قائم
ہو گیا ہے۔ لیکن دو میں آج بھی عورتوں سے نسل چلتی
ہے اور ترکہ ماں سے ملتا ہے۔ شانی، میامی اور دلاوری قبیلوں
میں یہ رسم ہے کہ اولاد کو باپ کے گن کے ناموں میں سے
کوئی ایک نام دے کر اس گن میں شامل کر دیا جاتا ہے تاکہ
انہیں اپنے باپ کی وراثت مل سکے۔ «یہ انسان کی پیدائشی
سوفسطائیت ہے کہ چیزوں کا نام بدل کر وہ سمجھتا ہے کہ
اس نے ان کی خاصیت بدل دی اور جب کبھی اپنی کسی غرض
کو پورا کرنے کے لئے مصلحت کا تقاضا ہؤا تو اس نے رسم
و رواج کی بندشوں کو توڑ کر باہر نکلنے کا بہانہ خود اسی
رسم و رواج کے اندر ڈھونڈھ نکالا!» (مارکس۔) اس کا
نتیجہ یہ ہؤا کہ سخت افراتفری اور گڑبڑی کی حالت پیدا
ہو گئی۔ حالات کو سدھارنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا
تھا کہ مادری حق کی جگہ پدری حق کا رواج ہو اور اسی
طرح کسی حد تک یہ افراتفری دور بھی کی گئی۔ «بحیثیت
مجموعی یہ ایک نہایت ہی قدرتی تبدیلی معلوم ہوتی ہے»
(مارکس)۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ تبدیلی قدیم دنیا کی
متمدن قوموں میں کس طرح اور کن ذریعوں سے عمل میں آئی
اور اس کے بارے میں تقابلی قانون کے ماہروں کی رائے،
جو کہ تقریباً محض مفروضات پر مبنی ہے، کیا ہے تو کوالیفسکی
کی کتاب «خاندان اور ملکیت کے آغاز اور ارتقا کا ایک

خاکہ»* پڑھنی چاہئیے۔ یہ کتاب اسٹاک‌ہوم میں ۱۸۹۰ء میں چھپی تھی۔

مادری حق کا خاتمہ عورتوں کی ایک عالمگیر تاریخی شکست تھی۔ مرد نے گھر کے اندر بھی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ عورت اپنے رتبہ سے گر گئی۔ اس کے ہاتھہ پیر باندھہ دئیے گئیے۔ اسے مرد کی شہوت کا غلام بنا لیا گیا اور محض بچے پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھہ لیا گیا۔ عورت کا یہ گرا ہؤا مرتبہ سورمائی عہد کے اور اس سے بھی زیادہ کلاسیکی عہد کے یونانیوں میں خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے طرح طرح کے خوش‌نما پردوں سے ڈھانک‌کر اور سجاکر اور ایک حد تک اس کی سختی کو کم کرکے پیش کیا گیا۔ لیکن اسے مٹایا کبھی نہیں گیا۔

اب محض مردوں کی جو حکومت قائم ہوئی اس کا پہلا اثر خاندان کی ایک درمیانی شکل میں ظاہر ہؤا۔ یعنی پدری خاندان کا جنم ہؤا۔ اس کی اصلی خصوصیت یہ نہیں تھی کہ ایک ایک مرد کی بہت سی بیویاں ہوتی تھیں۔ اس کا ذکر ہم آگے چل‌کر کریں‌گے۔ پدری خاندان کی اصلی خصوصیت یہ تھی کہ «متعدد افراد جن میں غلام بھی ہوتے تھے اور آزاد لوگ بھی، خاندان کے بزرگ کے پدرانہ اقتدار کے سایہ میں منظم ہوتے تھے۔ سامی لوگوں میں اس بزرگ خاندان کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں۔ غلام کی ایک بیوی اور بچے

* Kovalevsky M., Tableau des origines et de l'évolution de la famille et de la propriètè. Stockholm, 1890. (اڈیٹر۔)

ہوتے تھے۔ اور ساری تنظیم کا مقصد ایک محدود علاقہ میں مویشیوں کے گلوں اور ریوڑوں کی دیکھہ بھال کرنا تھا»۔ خاندان کی اس شکل کی اصلی خصوصیت یہ تھی کہ غلاموں کو خاندان میں شامل کر لیا گیا تھا اور بزرگ خاندان کا اقتدار مانا جاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح کے خاندان کا مکمل نمونہ رومن خاندان میں ملتا ھے۔ لفظ familia کا مطلب ابتدا میں وہ نہیں تھا جو آج کل کے کم نظروں کا آدرش ھے اور جوکہ جذباتیت اور گھریلو کشیدگی سے مرکب ہوتا ھے۔ رومنوں میں شروع میں یہ لفظ شادی شدہ جوڑے اور ان کے بچوں کے لئیے استعمال ھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کا اطلاق صرف غلاموں پر ہوتا تھا۔ Famulus کا مطلب تھا گھریلو غلام۔ اور familia کا لفظ مجموعی طور پر ایک شخص کے سبھی غلاموں کے لئیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گیوس کے زمانہ میں بھی لوگ، familia, id est patrimonium (یعنی بطور ترکہ) اپنے وارثوں کے لئیے چھوڑ جایا کرتے تھے۔ رومنوں نے ایک نئیے سماجی ادارے کے لئیے یہ اصطلاح گھڑی تھی۔ اس ادارے میں اس کے سردار کے تحت اس کی بیوی اور بچے اور متعدد غلام ہوتے تھے اور رومن پدری اقتدار کے تحت سردار کو ان کی زندگی اور موت پر اختیار ہوتا تھا۔ «لہذا یہ اصطلاح لاطینی قبلیوں کے اس آهنی خاندانی نظام سے زیادہ پرانی نہیں تھی جو کھیت بناکر کھیتی کرنے کا طریقہ شروع ہونے، غلامی کے قانونی ہو جانے اور ساتھہ ھی یونانیوں اور (آریائی) لاطینیوں کے علیحدہ ہونے کے بھی بعد قائم ہوا

تھا۔» مارکس نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے: «موجودہ خاندان میں ایک ادھوری شکل میں نہ صرف غلامی (servitus) بلکہ زرعی غلامی بھی شامل ہے کیونکہ خاندان کا تعلق شروع ہی سے کھیتی باڑی کے کام سے رہا ہے۔ بہت چھوٹے پیمانہ پر اس کے اندر وہ سارے تضاد موجود ہیں جو آگے چل کر سماج اور اس کی ریاست کے اندر بڑے پیمانہ پر پھیل جاتے ہیں۔»

خاندان کی اس طرح کی شکل اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ جوڑا خاندان یک زوجگی میں تبدیل ہو گیا۔ بیوی کی عصمت یعنی بچوں کی ولایت کا تحفظ کرنے کے لئے عورت کو مرد کے مطلق اقتدار کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر وہ اس کو قتل بھی کرتا ہے تو اپنے حق سے کام لیتا ہے۔

پدری خاندان کے ساتھ ہم لکھی ہوئی تاریخ کے دور میں قدم رکھتے ہیں، یہ ایک ایسا دور ہے جس میں تقابلی قانون کا علم ہماری بہت مدد کرتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کی مدد سے ہم بہت کچھ آگے بڑھے ہیں۔ ہم میکسم کوالیفسکی کے احسان مند ہیں کہ اس نے (اپنی کتاب «خاندان اور ملکیت کے آغاز اور ارتقا کا ایک خاکہ» میں جو ۱۸۹۰ء میں اسٹاک ہوم سے شائع ہوئی تھی، دیکھئے صفحہ ٦٠ تا ١٠٠) یہ ثابت کر دیا کہ پدری گھرانے کی برادری — (patriarchalische Hausgenossenschaft) — جس کی مثال ہمیں آج بھی سربیا اور بلغاریہ کے باشندوں میں «زدروگا» (جس کا مطلب برادری سے ملتا جلتا ہے) یا «براتستوا» (برادری) کے نام سے ملتی ہے

اور جو کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں مشرق کی قوموں میں بھی پائی جاتی ہے—وہ برادری اس تغیری دور کی چیز ہے جو گروہ وار شادی سے ترقی کرکے قائم ہونے والے مادری حق کے خاندان اور موجودہ زمانہ کے انفرادی خاندان کے درمیان کا دور تھا۔ کم از کم جہاں تک دنیائے قدیم کی متمدن قوموں، آریوں اور سامیوں، کا تعلق ہے یہ بات ثابت معلوم ہوتی ہے۔

اس طرح کی خاندانی برادری کی سب سے عمدہ مثال ہمیں آج کل جنوبی سلاف لوگوں کے «زدروگا» میں ملتی ہے۔ اس کے اندر ایک باپ کی اولاد کی کئی پشتیں اور ان سب کی بیویاں شامل ہوتی ہیں۔ اور یہ سب لوگ ساتھہ ایک گھر میں رہتے ہیں، مل جل کر کھیتی کرتے ہیں، ایک مشترک ذخیرے سے اپنی کھانے اور کپڑے کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور استعمال کے بعد جو کچھہ بچ رہتا ہے اس کے سب اجتماعی مالک ہوتے ہیں۔ اس برادری کا انتظام گھر کے مالک، دوماچن (domácin) کے ہاتھہ میں ہوتا ہے۔ بیرونی معاملوں میں وہی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ چھوٹی موٹی چیزیں الگ کرتا ہے۔ گھر کی آمد و خرچ کا انتظام کرتا ہے۔ گھر کے حساب کتاب کی اور کام کاج کو ٹھیک سے چلانے کی ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے۔ گھر کے مالک کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ عمر میں سب سے بڑا ہو۔ گھر کی عورتوں اور ان کے کام کی نگرانی گھر کی مالکہ، دوماچیتسا (domácica) کرتی ہے۔ وہ عموماً دوماچین

کی بیوی ہوتی ہے۔ برادری کی لڑکیوں کے لئے شوہر چننے میں اس کی رائے اہم اور اکثر فیصلہ‌کن سمجھی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی آخری فیصلہ کا اختیار خاندانی کاؤنسل کو ہے جس میں تمام بالغ مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ گھر کا مالک اپنا حساب اسی کاؤنسل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسی کاؤنسل میں سارے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں۔ وہی خاندان کے افراد کے درمیان انصاف کرتی ہے۔ اسی میں اہم چیزوں کا، خاص‌کر زمین کی خرید و فروخت وغیرہ کا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔

ابھی صرف دس برس پہلے کی بات ہے کہ اتنی بڑی بڑی خاندانی برادریوں کا وجود روس میں بھی ثابت ہوا۔ اب یہ بات عام طور سے مان لی گئی ہے کہ روسیوں کے عام رسم و رواج میں اس کی جڑیں اتنی ہی مضبوطی سے پیوست ہیں جتنی «آبش‌چینا» یعنی دیہی برادری کی۔ روس کے سب سے پرانے مجموعۂ قوانین — یاروسلاو کے «پراودا» — میں ان برادریوں کا ذکر اسی نام (ویرو) سے آتا ہے جس نام سے دال میشین قوانین میں۔ پولستانی اور چک لوگوں کی تاریخی دستاویزوں میں بھی ان برادریوں کا ذکر ملتا ہے۔

ہیوزلر کے کہنے کے مطابق (دیکھئے اس کی کتاب «جرمن نظام اختیارات»*) جرمنوں میں بھی اقتصادی اکائی، موجودہ مفہوم میں انفرادی خاندان نہیں تھا بلکہ گھریلو برادری

* Heusler A., Institutionen des deutschen Rechts. Bd. I-II. Leipzig, 1885—1886 (اڈیٹر۔)

(Hausgenossenschaft) تھی جس میں کئی پشت کے لوگ یا کئی انفرادی خاندان اور اکثر بہت سے غلام بھی شامل ہوتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ رومن خاندان کی جڑیں بھی اسی نوع کی گھریلو برادری سے جا ملتی ہیں اور اس وجہ سے آج کل بڑے زوروں پر یہ سوال اٹھہ کھڑا ہوا ہے کہ کیا خاندان میں اقتدارمطلق ہمیشہ گھر کے مالک کے ہاتھہ میں تھا اور ایک اس کے مقابلہ میں خاندان کے باقی افراد حقوق سے بالکل محروم ہوتے تھے۔ کچھہ لوگوں کا خیال ہے کہ آئرلینڈ کے کیلٹ لوگوں میں بھی اس قسم کی خاندانی برادریاں موجود تھیں۔ فرانس کے نیویرنائی علاقہ میں پارسون نیری (parçonneries) کے نام سے انقلاب فرانس تک ان کا وجود قائم تھا۔ اور فرانشےکومٹ میں تو وہ آج تک نہیں مٹیں۔ لوہان (ساونے اے لوار) کے ضلع میں اب تک کسانوں کے بڑے بڑے گھر دیکھنے میں آتے ہیں جن میں ایک نہایت اونچا سا مشترک ہال ہوتا ہے جس کی دیواریں سب سے اوپری چھت تک جا پہنچتی ہیں، جس کے چاروں طرف سونے کے کمرے ہوتے ہیں اور جن تک پہونچنے کے لئے چھہ سے آٹھہ تک سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔ ان میں ایک خاندان کی کئی کئی پشت کے لوگ رہتے ہیں۔

ہندوستان میں سکندر اعظم کے زمانہ میں ہی نیارکس نے گھریلو برادریوں کا ذکر کیا ہے جو مشترک کھیتی کرتے تھے اور اس علاقہ میں یعنی پنجاب میں اور ہندوستان کے سارے شمال مغربی حصہ میں اس طرح کی گھریلو

برادریاں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ کوالفسکی خود بھی قفقاز میں اس طرح کی برادریوں کے وجود کی شہادت دے سکا ہے۔الجیریا کے قبیلوں میں یہ آج تک پائی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں بھی ان کا وجود تھا۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ زوریتا نے قدیم میکسیکو میں کالپولیس (calpullis) * کا جو ذکر کیا ہے وہ اسی قسم کی گھریلو برادری تھی۔ دوسری طرف کونوف نے («Ausland»، ۱۸۹۰ء کے ۴۲ سے ۴۴ تک کے شماروں میں) کافی وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس زمانہ میں یورپ والوں نے پیرو کو فتح کیا تو وہاں قدیم جرمن لوگوں کے مارک نظام سے ملتا جلتا ایک دستور موجود تھا (اور عجیب بات یہ ہے کہ جرمنوں کی طرح پیرو کے لوگ بھی دیہاتی برادری کی زمین مارک کو marca کہتے ہیں)۔ ان میں کھیتی کی زمین کو وقتاً فوقتاً برادری کے لوگوں میں نئے سرے سے بانٹ دیا جاتا تھا یعنی لوگ کھیتی الگ الگ کرتے تھے۔

بہرحال اتنی بات تو ظاہر ہے کہ پدری گھرانے کی برادری جو زمین کی مشترکہ ملکیت اور مشترکہ کھیتی کی بنیاد پر قائم تھی، اب پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ پرانی دنیا کی متمدن اور دوسری قوموں میں اس پدری

---

* Calpullis — اتستک خاندانی برادری۔ (اڈیٹر۔)

(Hausgenossenschaft) تھی جس میں کئی پشت کے لوگ یا کئی انفرادی خاندان اور اکثر بہت سے غلام بھی شامل ہوتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ رومن خاندان کی جڑیں بھی اسی نوع کی گھریلو برادری سے جا ملتی ہیں اور اس وجہ سے آج کل بڑے زوروں پر یہ سوال اٹھہ کھڑا ہؤا ہے کہ کیا خاندان میں اقتدارمطلق ہمیشہ گھر کے مالک کے ہاتھہ میں تھا اور ایک اس کے مقابلہ میں خاندان کے باقی افراد حقوق سے بالکل محروم ہوتے تھے۔ کچھہ لوگوں کا خیال ہے کہ آئرلینڈ کے کیلٹ لوگوں میں بھی اس قسم کی خاندانی برادریاں موجود تھیں۔ فرانس کے نیویرنائی علاقہ میں پارسوں نیری (parçonneries) کے نام سے انقلاب فرانس تک ان کا وجود قائم تھا۔ اور فرانشےکومٹ میں تو وہ آج تک نہیں مٹیں۔ لوھان (ساونے اے لوار) کے ضلع میں اب تک کسانوں کے بڑے بڑے گھر دیکھنے میں آتے ہیں جن میں ایک نہایت اونچا سا مشترک ہال ہوتا ہے جس کی دیواریں سب سے اوپری چھت تک جا پہنچتی ہیں، جس کے چاروں طرف سونے کے کمرے ہوتے ہیں اور جن تک پہونچنے کے لئے چھہ سے آٹھہ تک سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔ ان میں ایک خاندان کی کئی کئی پشت کے لوگ رہتے ہیں۔

ہندوستان میں سکندر اعظم کے زمانہ میں ہی نیارکس نے گھریلو برادریوں کا ذکر کیا ہے جو مشترک کھیتی کرتے تھے اور اس علاقہ میں یعنی پنجاب میں اور ہندوستان کے سارے شمال مغربی حصہ میں اس طرح کی گھریلو

برادریاں آج بھی پائی جاتی ہیں - کوالفسکی خود بھی قفقاز میں اس طرح کی برادریوں کے وجود کی شہادت دے سکا ہے -الجیریا کے قبیلوں میں یہ آج تک پائی جاتی ہیں - کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں بھی ان کا وجود تھا - یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ زوریتا نے قدیم میکسیکو میں کالپولیس (calpullis) * کا جو ذکر کیا ہے وہ اسی قسم کی گھریلو برادری تھی - دوسری طرف کونوف نے («Ausland»، ۱۸۹۰ء کے ۴۲ سے ۴۴ تک کے شماروں میں) کافی وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس زمانہ میں یورپ والوں نے پیرو کو فتح کیا تو وہاں قدیم جرمن لوگوں کے مارک نظام سے ملتا جلتا ایک دستور موجود تھا (اور عجیب بات یہ ہے کہ جرمنوں کی طرح پیرو کے لوگ بھی دیہاتی برادری کی زمین مارک کو marca کہتے ہیں) - ان میں کھیتی کی زمین کو وقتاً فوقتاً برادری کے لوگوں میں نئے سرے سے بانٹ دیا جاتا تھا یعنی لوگ کھیتی الگ الگ کرتے تھے -

بہرحال اتنی بات تو ظاہر ہے کہ پدری گھرانے کی برادری جو زمین کی مشترکہ ملکیت اور مشترکہ کھیتی کی بنیاد پر قائم تھی، اب پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہے - اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ پرانی دنیا کی متمدن اور دوسری قوموں میں اس پدری

---

* Calpullis — ازتسک خاندانی برادری - (اڈیٹر -)

گھرانے کی برادری نے مادری حق والے خاندان سے یک زوجگی کے خاندان تک ایک درمیانی عبوری منزل کی حیثیت سے اہم تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ کوالفسکی نے اس سے مزید جو نتیجہ نکالا اس کی طرف ہم بعد میں لوٹیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسی عبوری منزل سے اس دیہی یا مارک برادری کا ارتقا بھی ہوُا تھا جس میں لوگ کھیتی الگ الگ کرتے تھے اور قابل کاشت اور چراگاہ کی زمینیں پہلے وقتاً فوقتاً اور پھر مستقل طور پر لوگوں میں بانٹ دی جاتی تھیں۔

جہاں تک ان گھرانوں کے اندر خاندانی زندگی کا تعلق ہے ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ کم از کم روس میں گھر کے مالک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نوجوان عورتوں اور خاص کر اپنی بہوؤں کے سلسلہ میں اپنی حیثیت سے بہت ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا، اور اکثر وہ انہیں ایک حرم کی سی شکل دے دیتا تھا۔ روس کے عوامی گیتوں میں ان حالتوں کی بڑی پرزور ترجمانی کی گئی ہے۔

مادری حق کے خاتمہ کے بعد یک زوجگی کے نظام نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم شادی کی ان شکلوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جس میں ایک شوہر کی کئی بیویاں یا ایک بیوی کے کئی شوہر ہوتے تھے۔ شادی کی یہ دونوں شکلیں اگر کسی ملک میں ساتھ ساتھ ملیں تو اور بات ہے — گو جیسا کہ سب کو معلوم ہے وہ ساتھ ساتھ نہیں ملتیں — ورنہ ظاہر ہے کہ وہ صرف

گویا مستثنی حیثیت سے تاریخ کی تفریحی پیداوار کی حیثیت سے، ہی پائی جاتی ہیں۔ سماجی اداروں سے قطع نظر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد بحیثیت مجموعی ہمیشہ برابر رہی ہے۔ اور اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کثرت ازواج یعنی ایک شوہر کی متعدد بیویوں کے نظام میں جو مرد اکیلے بچ رہے ہوں وہ ان عورتوں سے مطمئن ہو جائیں جو کثرت شوہری یعنی ایک عورت کے متعدد شوہروں کے نظام میں اکیلی بچ رہی ہوں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ شادی کی ان دونوں شکلوں میں سے کسی کا بھی عام رواج نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے مرد کی متعدد بیویوں کا دستور دراصل غلامی کے نظام کی پیداوار تھی اور محض ایک مستثنی حیثیت رکھتی تھی۔ سامیوں کے پدری خاندان میں محض سردار خاندان اور زیادہ سے زیادہ اس کے دو ایک بیٹوں کی متعدد بیویاں ہوتی تھیں۔ خاندان کے باقی لوگوں کو ایک ہی بیوی پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ آج بھی تمام مشرقی ملکوں میں یہی حال ہے۔ کئی کئی بیویاں رکھنا دولتمندوں اور کچھ نوابوں کے ٹھاٹ کی بات ہے۔ وہ باندیاں خرید کر گھر میں ڈال لیا کرتے ہیں۔ عام لوگ ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان اور تبت میں ایک عورت کے متعدد شوہروں کا دستور مستثنی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ یقیناً ایک دلچسپ سوال ہے کہ گروہ وار شادی سے اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ لیکن ابھی اس موضوع کا اور زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت

ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ چیز مسلمانوں کے حرم کے مقابلہ میں جہاں رشک و رقابت کا دوردورہ تھا، کہیں زیادہ قابل برداشت تھی۔ کم از کم ہندوستان کے نائر لوگوں میں تو یقیناً تین، چار یا زیادہ مردوں میں ایک بیوی مشترک ہوتی ہے۔ لیکن ساتھہ ہی ان میں سے ہر مرد کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو دوسرے تین چار مردوں کے ساتھہ ایک اور بیوی رکھے اور اسی طرح اوروں کے ساتھہ مل کر تیسری اور پھر چوتھی بیوی رکھے اور اس طرح اپنی بیویوں کی تعداد بڑھاتا رہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان شادی کلبوں یا بیاہ منڈلیوں کو دیکھہ کر جن میں ایک مرد بیک وقت کئی منڈلیوں کا رکن ہو سکتا تھا، اور جن کا حال خود میکلینن نے بیان کیا ہے، میکلینن نے ایک نئی قسم کی شادی ـــ کلب شادی ـــ نہیں دریافت کر لی۔ لیکن یہ کلب شادی صحیح معنی میں کثرت شوہری نہیں ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ ژیرا تیولوں نے لکھا ہے یہ گروہ وار شادی کی ایک مخصوص (spezialisierte) شکل ہے جس میں مرد بھی کئی شادیاں کرتے ہیں اور عورتیں بھی۔

٤ ـ یک زوجگی کا خاندان۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ خاندان بربریت کے درمیانی اور آخری دور کے بیچ کے عبوری زمانہ میں جوڑا خاندان سے پیدا ہؤا۔ اور اس کی مکمل فتح اس بات کی علامت تھی کہ تمدن کا عہد شروع ہو چکا ہے۔ یک زوجگی کی بنیاد مرد کی فوقیت پر ہے۔ اس کا علانیہ مقصد ایسے بچے پیدا کرنا ہے جن کی ولایت

کے بارے میں کوئی شبہہ نہ ہو۔ اس کی ضرورت اس لئے
ہوتی ہے کہ وقت آنے پر بچے اپنے باپ کے اصلی وارث
کی حیثیت سے اس کی دولت کا ترکہ پائیں ۔ یک زوجگی
اور جوڑا بیاہ میں فرق ہے ۔ یک زوجگی میں شادی کا رشتہ
کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور فریقین میں سے کوئی
بھی جب چاہے اس کو توڑ نہیں سکتا ۔ عام طور سے اب
صرف مرد ہی کو اس رشتہ کو منقطع کرنے اور بیوی کو
چھوڑنے کا اختیار ہوتا ہے ۔ اب بھی اس کو اپنی بیوی
سے بے وفائی کرنے کا حق حاصل ہے ۔ کم از کم رسم و رواج نے
تو اس پر اپنی مہر لگا ہی دی ہے ۔ (آئین نپولین میں
علی الاعلان شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو
داشتہ رکھہ سکتا ہے بشرطیکہ اسے گھر کے اندر نہ لائے ۔)
جیسے جیسے سماج کی نشو و نما ہوتی ہے مرد اس حق سے
زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ لیکن اگر بیوی پرانے جنسی رواج
کو یاد کرکے ان پر عمل کرنا چاہے تو اسے پہلے سے بھی
زیادہ سخت سزا ملتی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یونانیوں میں خاندان کی اس نئی
شکل پر بڑی سختی کے ساتھہ عمل کیا جاتا تھا ۔ جیسا کہ
مارکس نے بتایا ہے یونانی دیومالا میں دیویوں کی جو حیثیت
ہے، وہ ایک پرانے دور کی ترجمانی کرتی ہے جب عورتوں
کو زیادہ آزادی حاصل تھی اور ان کی زیادہ عزت کی جاتی
تھی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سورمائی عہد میں مردوں
کے غلبہ اور غلام عورتوں کے مقابلہ کی وجہ سے عورتیں

اپنے بلند مرتبہ سے گر گئیں۔ «اوڈیسی» میں آپ پڑھیں گے
کہ ٹیلی ماکس اپنی ماں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیتا ہے۔
ہومر کی نظموں میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب کبھی جنگ
میں نوجوان عورتیں پکڑی گئیں، ان کو جنسی لذت کشی کا
ذریعہ بنایا گیا۔ فوج کے افسر اپنے اپنے درجہ کے مطابق
ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور سب سے خوبصورت عورتوں
کو اپنے اپنے لئے چن لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ «ایلیڈ»
کی پوری داستان اس ایک واقعہ کے گرد گھومتی ہے کہ
ایکیلیز اور ایگاممنون میں ایک ایسی ہی غلام لڑکی کے
بارے میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ ہومر کی نظموں میں ہر
اہم ہیرو کے ساتھ ایک غلام لڑکی ضرور ہوتی ہے جو
اس کے خیمہ میں رہتی ہے اور جس کے ساتھ وہ ہمبستر
ہوتا ہے۔ ان لڑکیوں کو ان کے مالک اپنے ساتھ گھر لے
جاتے ہیں جہاں ان کی بیویاں ہوتی ہیں۔ ایسکیلس کے
یہاں اسی طرح ایگاممنون کیسنڈرا کو اپنے گھر لے گیا تھا۔
ان باندیوں سے جو بیٹے پیدا ہوتے ہیں انہیں باپ کی
جائداد کا چھوٹا سا حصہ ملتا ہے اور انہیں آزاد سمجھا جاتا
ہے۔ تیلاموں کا ایک ایسا ہی ناجائز بیٹا تیوکراس تھا
جسے اپنے باپ کا نام اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی
تھی۔ بیاہتا بیوی سے امید کی جاتی تھی کہ وہ یہ سب
کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کر لے گی اور خود شوہر
کی پوری طرح وفادار رہے گی۔ یہ صحیح ہے کہ تمدن کے
عہد کے مقابلہ میں سورمائی دور میں یونانی بیوی کی زیادہ

عزت کی جاتی تھی۔ لیکن شوہر کی نظروں میں اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ وہ اس کے جائز وارثوں کی ماں ہے، اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کی باندیوں کی نگرانی کرتی ہے جنہیں وہ جب چاہے داشتہ بنا سکتا ہے۔ اور اکثر وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ یک زوجگی کے ساتھ چونکہ برابر غلامی کا رواج رہا اور خوبصورت نوجوان باندیوں کا وجود رہا جو ہمیشہ مردوں کی پوری پوری ملکیت ہوتی تھیں، اس لئے شروع ہی سے یک زوجگی پر اس کا اثر پڑا۔ اور اس کی وجہ سے یک زوجگی کا یہ مخصوص کردار ہو گیا کہ عورتوں کے لئے تو ایک شوہر کی پابندی ہے مگر مردوں کے لئے یک زوجگی نہیں ہے۔ اور آج بھی یہی حالت چلی آرہی ہے۔

جہاں تک سورمائی عہد کے بعد کے یونانیوں کا تعلق ہے ہمیں ڈورین اور آیونین لوگوں میں فرق کرنا چاہئے۔ ڈورین لوگوں کی سب سے اچھی اور نمایاں مثال اسپارٹا میں ملتی ہے۔ ان میں شادی کے ایسے رشتے ملتے ہیں جو کئی باتوں میں ہومر کے بتائے ہوئے رشتوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اسپارٹا میں ہمیں جوڑا بیاہ کی ایک شکل بھی ملتی ہے جسے وہاں کی ریاست نے مروجہ خیالات کے مطابق کسی قدر بدل دیا تھا۔ جوڑا بیاہ کی یہ ایک ایسی شکل تھی جس میں اس وقت تک گروہ وار شادی کے اثرات بھی موجود تھے۔ جس شادی سے بچے نہیں ہوتے تھے، اسے منقطع کر دیا جاتا تھا۔ بادشاہ انکسندریدس (تقریباً ۶۵۰ ق۔ م۔) کی پہلی بیوی

لاولد تھی۔ اس لئے اس نے دوسری شادی کی اور دو گھر بسائے۔ اسی زمانہ کا ایک اور بادشاہ ارستونس ہے ــ اس کی دو بیویاں لاولد تھیں ــ اس نے ایک کو چھوڑ دیا اور تیسری شادی کی۔ دوسری طرف کئی بھائی مل کر ایک بیوی رکھہ سکتے تھے۔ اگر کسی شخص کو اپنے دوست کی بیوی پسند آ جاتی تو وہ اس کا حصہ دار بن سکتا تھا۔ اور جیسا کہ بسمارک کہیگا، اگر کہیں کوئی مضبوط «سانڈ» ہو، چاہے وہ شخص شہری نہ ہو، تو بھی اپنی بیوی کو اس کے سپرد کرنا مناسب سمجھا جاتا تھا۔ پلوٹارک کی ایک کتاب میں ایک جگہ یہ تذکرہ ہے کہ ایک اسپارٹن عورت نے اپنے ایک عاشق کو، جو بہت دنوں سے اس کے پیچھے پڑا ہؤا تھا، اپنے شوھر کے پاس بھیج دیا۔ شومان نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان دنوں جنسی آزادی زیادہ تھی۔ زناکاری یعنی شوھر کے پیٹھہ پیچھے بیوی کا اس سے بیوفائی کرنا، ان دنوں سننے میں بھی نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف، اسپارٹا میں، کم از کم اس کے عروج کے زمانہ میں گھریلو غلامی نہیں تھی۔ زرعی غلام ہیلوٹ، الگ جاگیروں پر رہتے تھے اور اس لئے اسپارٹیاٹیز * کو ان کی

---

* اسپارٹیاٹیز۔ قدیم اسپارٹا کے شہریوں کا طبقہ تھا جنہیں پورے شہری حقوق حاصل ہوتے تھے۔ جبکہ ان کے مقابلہ میں ہیلوٹ ــ زرعی غلام ــ ان حقوق سے محروم تھے۔ (اڈیٹر۔)

عورتوں سے ھمبستری کی ترغیب کم ھی ملتی تھی۔ ان حالات میں یہ قدرتی بات تھی کہ دوسری تمام یونانی عورتوں کے مقابلہ میں اسپارٹا کی عورتوں کی زیادہ عزت ھوتی تھی۔ قدیم زمانہ کے مصنفوں نے یونانی عورتوں میں صرف اسپارٹا کی عورتوں اور ایتھنز کی ھیتاڑی* عورتوں کے سب سے اونچے حصہ کا ذکر ادب اور احترام کے ساتھہ کیا ھے اور ان کے اقوال کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ھے۔

آیونین لوگوں میں جن کی نمایاں مثال ایتھنز کے لوگ ھیں، حالات کچھہ اور تھے۔ وھاں لڑکیاں صرف چرخہ کاتنا، کپڑا بننا اور سینا پرونا سیکھتی تھیں۔ بہت ھؤا تو کچھہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھہ لیا۔ مردوں سے انھیں بالکل الگ رکھا جاتا تھا۔ وہ صرف عورتوں سے ھی مل سکتی تھیں۔ عورتیں گھر کے ایک علیحدہ حصے یعنی خلوت میں رھتی تھیں۔ یہ حصہ عام طور پر اوپر کی منزل پر یا مکان کے پیچھے کی طرف ھوتا تھا، جہاں مردوں کا اور خاص کر کسی اجنبی مرد کا گذر آسانی سے نہیں ھو سکتا تھا اور مرد مہمانوں کے آنے پر بی بیاں وھاں چلی جاتی تھیں۔ بی بیاں صرف کسی باندی کو ساتھہ لےکر ھی باھر جا سکتی تھیں ورنہ نہیں، گھر کے اندر ان پر پہرہ سا رھتا تھا۔ اریسطوفینس لکھتا ھے کہ بدکاروں کو دور رکھنے کے لئے مولوسین کتے پالے جاتے تھے۔ ایشیائی شہروں میں

---

* داشتہ عورتیں یا طوائفیں۔ (اڈیٹر۔)

عورتوں پر پہرہ دینے کے لئے خواجہ سرا رکھے جاتے تھے۔ هیروڈوٹس کے زمانہ میں بھی جزیرہ کیوس میں غلاموں کو آختہ کرکے خواجہ سرا تیار کئے جاتے تھے اور ان کا بیوپار کیا جاتا تھا۔ اور واکس متھہ کا کہنا ہے کہ وہ صرف بربریوں کے لئے نہیں ہوتے تھے۔ یورپیڈیز کے ڈراموں میں بیوی کو اوئیکوریما (oikurema) کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں گھر کی نگہداشت کرنے والی چیز (یہ لفظ بےجنس کا ہے) اور ایتھنز کے لوگوں کی نظر میں بیوی کا کام بچے پیدا کرنے کے علاوہ اگر کچھ تھا تو صرف یہ کہ وہ گھر کی سب سے بڑی ملازمہ تھی۔ شوہر اکھاڑے میں کسرت اور ورزش کرتا تھا، شہری معاملات میں حصہ لیتا تھا۔ بیوی کو ان سب سے علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شوہر کے پاس اکثر لونڈیاں باندیاں ہوتی تھیں اور ایتھنز کے عروج کے زمانہ میں کثرت سے طوائفیں تھیں، بڑے پیمانہ پر عصمت فروشی ہوتی تھی اور حکومت اگر کچھ اور نہیں تو اس کو پسندیدگی کی نظر سے تو دیکھتی ہی تھی۔ یونان میں جتنی عورتوں نے بھی امتیاز حاصل کیا وہ اسی عصمت فروشی کی بنیاد پر۔ وہ اپنی زندہ دلی اور خوش گوئی اور فنون لطیفہ کے اعلی ذوق کی بدولت قدیم نسائیت کی عام سطح سے اسی قدر بلند تھیں جس قدر اسپارٹا کی عورتیں اپنے کردار کی بدولت۔ ایتھنز کے خاندانی نظام کی پستی کا اس سے بڑا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ عورت کو اپنا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے پہلے طوائف بننا پڑتا تھا۔

رفتہ رفتہ ایتھنز کا یہ خاندان ایک نمونہ بن گیا اور صرف آیونیا کے باقی لوگ ہی نہیں بلکہ خاص یونان اور اس کی نوآبادیات کے سارے یونانی لوگ بھی اپنے خاندانی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ اسی سانچے میں ڈھالنے لگے۔ لیکن اس تمام علیحدگی اور نگرانی کے باوجود یونان کی عورتیں اکثر اپنے شوہروں کو دھوکہ دینے کے موقع نکال ہی لیتی تھیں۔ ان کے شوہر جنہیں اپنی بیوی سے محبت کا اظہار کرنے میں شرم محسوس ہوتی تھی، طوائفوں اور داشتہ عورتوں کے ساتھہ جی کھول کر داد عیش دیا کرتے اور طرح طرح سے محبت کے مزے لوٹتے تھے۔ لیکن عورتوں کی یہ گراوٹ مردوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہی۔ اس نے انہیں بھی اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرا دیا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکوں سے محبت کے جنسی مرض میں مبتلا ہو گئے اور گینی میڈ کا قصہ گھڑ کر انہوں نے اپنے آپ اور اپنے خداؤں دونوں کو رسوا کیا۔

قدیم زمانہ کی سب سے متمدن اور ترقی یافتہ قوم میں جہاں تک ہم پتہ لگا سکے ہیں، یک زوجگی کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ کسی اعتبار سے بھی یہ انفرادی جنسی محبت کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ شادیاں پہلے کی طرح اب بھی مصلحت کی بنا پر کی جاتی تھیں۔ یہ خاندان کی وہ پہلی شکل تھی جس کی بنیاد قدرتی نہیں بلکہ اقتصادی حالات پر تھی۔ یعنی ابتدائی مشترکہ ملکیت پر، جس کی نشو و نما قدرتی طور پر

ہوئی تھی۔ ذاتی ملکیت کی فتح، یہی اس کی بنیاد تھی۔ یونان والے علانیہ کہتے تھے کہ یک‌زوجگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ خاندان کے اندر مرد کی حکمرانی ہو، ایسے بچے پیدا ہوں جو صرف اس کے نطفہ سے ہوں اور جو اس کے وارث بنیں۔ ان باتوں سے قطع نظر، شادی ایک بار تھی، خدا، ریاست اور اپنے آباؤاجداد کا عائد کیا ہؤا فریضہ تھی جس کو کسی طرح ادا کرنا تھا۔ ایتھنز میں قانون نے شادی کو لازمی قرار دیا تھا۔ اور اتنا ھی نہیں۔ مرد پر کم از کم کچھہ فرائض شوہری بھی عائد کر دئے گئے تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ تاریخ میں یک‌زوجگی نہ تو مرد اور عورت کی کسی مصالحت کا نتیجہ تھی اور نہ شادی کی کوئی اعلی شکل۔ اس کے برعکس وہ عورتوں پر مردوں کے تسلط کا اظہار تھا۔ دونوں جنسوں کے درمیان ایک ایسے تضاد اور اختلاف کا اعلان تھا جس کی مثال ماقبل تاریخی زمانہ میں کہیں نہیں ملتی۔ میں نے اور مارکس نے مل‌کر ۱۸۴۶ء میں ایک کتاب لکھی تھی جو ابھی تک غیرمطبوعہ* ھے۔ اس پرانے غیرمطبوعہ مسودے میں مجھے ایک فقرہ ملا کہ «محنت کی سب سے پہلی تقسیم مردوں اور عورتوں میں بچہ پالنے کے لئے ہوئی»۔ اور آج میں اس پر یہ اضافہ کر سکتا ہوں کہ تاریخ میں پہلا طبقاتی اختلاف یک‌زوجگی کے

---

* یہ اشارہ «جرمن آئیڈیالوجی» (فکریات) کی طرف ھے۔ (اڈیٹر۔)

نظام کے اندر مردوں اور عورتوں کے اختلاف کے ابھرنے کے ساتھ ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور پہلا طبقاتی ظلم عورتوں پر مردوں کے ظلم کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یک زوجگی کا نظام تاریخی حیثیت سے ترقی کا ایک بڑا قدم تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک ایسا قدم تھا جس نے غلامی اور انفرادی دولت کے ساتھ اس دور کا آغاز کیا جو آج تک قائم ہے اور جس میں ہر قدم جو اٹھتا ہے وہ ایک اعتبار سے پیچھے بھی لے جاتا ہے، جس میں ایک گروہ کی خوش حالی اور ترقی دوسرے گروہ پر مصیبت اور ظلم ڈھاکر حاصل کی جاتی ہے۔ یک زوجگی متمدن سماج کی وہ بالکل ابتدائی صورت ہے جس کے اندر ہم ابھی سے ان تمام اختلافوں اور تضادوں کی نوعیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو متمدن سماج میں پوری طرح بڑھ کر سامنے آتے ہیں۔

جوڑا خاندان یا خود یک زوجگی کے بعد بھی جنسی تعلق کی پرانی نسبتی آزادی کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا۔ «ترقی پذیر خاندان کو اب بھی شادی کا وہی پرانا نظام گھیرے ہوئے تھا جو پونالوان گروہوں کے رفتہ رفتہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اب ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محدود ہو گیا تھا اور اول الذکر کے پیچھے پیچھے وہ نظام تمدن کے دور تک جا پہونچتا ہے... آخر میں وہ ہیتائرازم کے نئے نظام میں گم ہو جاتا ہے جو آج بھی تمدن کے دور میں خاندان کے ساتھ لگے ہوئے ایک تاریک سایہ کی طرح انسانیت کا پیچھا کر رہی ہے»۔ ہیتائرازم سے مارگن کی

مراد شادی کے رشتہ کے باہر مردوں اور بن بیاہی عورتوں کا وہ جنسی تعلق ہے جو یک زوجگی کے نظام کے ساتھہ ساتھہ قائم رہتا ہے اور جیسا کہ سبھی جانتے ہیں تمدن کے پورے عہد میں مختلف صورتوں میں پھلتا پھولتا رہا ہے اور برابر علانیہ عصمت فروشی کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ ہیتائرازم کا براہ راست تعلق گروہ وار شادی سے ہے۔ اس کا تعلق قربانی کے طور پر عورتوں کی سپردگی کی رسم سے ہے جو یہ قیمت ادا کرکے اپنی عفت و پاک‌دامنی کا حق خریدا کرتی تھیں۔ روپیہ لےکر اپنے آپ کو مردوں کی آغوش میں دے دینا شروع میں ایک مذہبی کام تھا جس کو محبت کی دیوی کے مندر میں انجام دیا جاتا تھا اور وہ روپیہ مندر کے خزانہ میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ ارمینیا میں انائیطس کے مندر اور کورنتھہ میں ایفروڈائٹ کے مندر کی ہائروڈیول* اور ہندوستان کے مندروں کی دیو داسیاں، جنہیں بیادیر بھی کہا جاتا ہے (یہ پرتگالی زبان کے لفظ «bailadeira» کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ناچنےوالی لڑکی ہوتا ہے) — یہ تاریخ کی پہلی طوائفیں تھیں۔ قربانی کے طور پر سپردگی کی یہ رسم ادا کرنا پہلے سبھی عورتوں کے لئے ضروری تھا۔ بعد میں مندروں کی یہ پجارنیں ہی سب عورتوں کی طرف سے یہ خدمت انجام دینے لگیں۔ دوسری قوموں میں ہیتائرازم کی ابتدا جنسی تعلق کی اس

---

* ہائروڈیول ـ مندروں میں رہنے والی داسیاں ـ (اڈیٹر ـ)

آزادی سے ہوئی جو لڑکیوں کو شادی سے پہلے حاصل تھی۔
یہ بھی گروہ وار شادی کے اثرات میں سے ہے جو ہم تک ایک دوسرے راستہ سے ہوکر پہونچی ہے۔ ملکیت کے اختلاف اور امتیاز کے پیدا ہونے پر — جو بربریت کے آخری دور میں ہی ہو چکا تھا — غلاموں کی محنت کے علاوہ کہیں کہیں مزدوری پر بھی کام ہونے لگا تھا۔ اور اسی کے ساتھہ اس کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے لونڈیوں باندیوں کے ساتھہ زبردستی زناکاری کے علاوہ آزاد عورتوں کی پیشہ ور عصمت فروشی کا بھی آغاز ہوُا۔ جس طرح تمدن سے پیدا ہونے والی ہر چیز دو مونہی اور دو رخی ہوتی ہے اور اس کے اندر تضاد اور اختلاف کے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی طرح گروہ وار شادی سے تمدن کو جو وراثت ملی، اس کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں، ایک طرف یک زوجگی ہے اور دوسری طرف ہیتائرازم، جس میں اس کی انتہائی صورت عصمت فروشی بھی شامل ہے۔ دوسرے اداروں کی طرح، ہیتائرازم، بھی ایک سماجی ادارہ ہے۔ یہ قدیم جنسی آزادی کی ہی ایک صورت ہے مگر اب یہ آزادی صرف مردوں کے لئے رہ گئی ہے اور اگرچہ حقیقت میں لوگ نہ صرف یہ کہ اس کو برداشت کرتے ہیں بلکہ بڑے جوش و خروش سے اس پر عمل کرتے ہیں، لیکن زبان سے، خاص طور پر حکمراں طبقے کے لوگ، اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ہیتائری نظام کی اس لعنت ملامت سے مردوں کو، جو اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، دراصل کوئی نقصان نہیں

پہونچتا۔ اس کی چوٹ صرف عورتوں پر پڑتی ہے۔ ان سے سماجی طور پر قطع تعلق سا کرکے انہیں سماج باہر کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک بار پھر عورت پر مردوں کے کامل اقتدار کا اعلان کیا جا سکے اور یہ بتایا جا سکے کہ یہی سماج کا بنیادی قانون ہے۔

لیکن اس سے خود یک زوجگی کے اندر ایک اور تضاد نمودار ہوتا ہے۔ شوہر تو ہیتائرازم کے مزے لوٹ کر اپنی زندگی کو رنگین بنا لیتا ہے لیکن بیوی اکیلی پڑی اپنی قسمت کو روتی ہے اور جس طرح آدھا سیب کھا لینے کے بعد ہاتھہ میں پورا سیب نہیں رہےگا، اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تضاد کا ایک پہلو ہو اور دوسرا نہ ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو جب تک اپنی بیویوں سے سبق نہیں ملا، وہ یہ نہیں سوچتے تھے۔ یک زوجگی کے ساتھہ دو نئی شخصیتیں مستقل طور پر سماج کے پردے پر ابھر آتی ہیں، جن کا پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ ایک تو بیوی کا آشنا اور دوسرا قرمساق یعنی غیر مردوں سے آشنائی کرنے والی عورت کا شوہر۔ مردوں نے عورتوں پر فتح پا لی تھی مگر فاتح کے سر پر تاج پہنانے کا کام مفتوح نے نہایت فراخ دلی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یک زوجگی اور ہیتائرازم کے ساتھہ ساتھہ زناکاری بھی سماج کا ایک ناگزیر دستور بن گئی۔ اسے ناجائز قرار دیا گیا، اس کے لئے سخت سزائیں دی گئیں، مگر اس کو دبایا نہیں جا سکا۔ اپنے بچوں کی ولدیت کے بارے میں باپ کا یقین

پہلے کی طرح اب بھی محض اخلاقی اعتماد پر مبنی تھا اور یہ تضاد جو کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا، اس کو حل کرنے کی غرض سے آئین نپولینی کی دفعہ ۳۱۲ میں اعلان کیا گیا: «L'enfant conçu pendant le mariage a pour père le mari» یعنی «شادی شدہ زندگی کے دوران میں جس بچے کا حمل قرار پائے گا، اس کا باپ شوہر کو سمجھا جائے گا۔» تین ہزار برس میں یک زوجگی کے نظام کا ماحصل بس اتنا ہی ہے۔

غرضکہ یک زوجگی کے خاندان کے اندر، اس کی ان شکلوں میں جن میں اس کی تاریخی ابتدا کی صحیح تصویر ملتی ہے اور جو مرد اور عورت کی اس شدید کشمکش کو جو مردوں کے واحد غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، صاف طور پر سامنے لے آتی ہیں، ہمیں مختصر پیمانے پر وہی اختلاف اور تضاد دکھائی دیتا ہے جن میں سے ہوکر یہ سماج جو تمدن کی ابتدا سے ہی مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے، آگے بڑھتا ہے اور جن تضادوں کو وہ نہ تو حل کر سکتا ہے اور نہ دور کر پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں یہاں یک زوجگی کی صرف ان صورتوں کا ذکر کر رہا ہوں جن میں شادی شدہ زندگی صحیح معنی میں ان اصولوں پر چلتی ہے جن سے اس پورے رواج کی ابتدائی نوعیت متعین ہوتی تھی، لیکن جن میں بیوی شوہر کے غلبہ کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہو جاتی ہے۔ لیکن سبھی شادیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اور یہ بات جرمنی کے ان کم نظروں سے زیادہ بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے جو نہ گھر میں حکومت کرنے کی

صلاحیت رکھتے ھیں اور نہ ملک میں اور اس لئے جن کی بیویاں پورے جواز کے ساتھہ اس منصب کو قبول کرتی ھیں جس کے لئے ان کے شوھر نااھل ثابت ھو چکے ھیں۔ لیکن وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ھیں کہ اپنی مصیبت کے فرانسیسی ساتھیوں سے ان کی حالت کہیں زیادہ اچھی ھے۔ ان بےچاروں کی مصیبت تو اور بھی بدتر ھوتی ھے۔

لیکن یک زوجگی کا خاندان ھمیشہ اور ھر جگہ اتنی سخت صورت لےکر نہیں آیا جتنی سخت صورت میں وہ یونان میں ظاھر ھؤا تھا۔ رومنوں میں، جوکہ دنیا کے آئندہ فاتحوں کی حیثیت سے اگر یونانیوں سے شائستگی میں کم تھے تو دوراندیشی میں بڑھے ھوئے تھے، عورت کو زیادہ آزادی تھی اور اس کی زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ رومن مرد یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ اسے اپنی بیوی پر زندگی اور موت کا اختیار حاصل ھے، اس لئے اس کی عصمت پوری طرح محفوظ ھے۔ اس کے علاوہ شوھر کی طرح بیوی کو بھی اختیار تھا کہ جب چاھے اپنی مرضی سے شادی کا رشتہ توڑ دے۔ لیکن یک زوجگی کے نظام میں سب سے بڑی ترقی اس وقت ھوئی جب جرمنوں نے تاریخ کے دائرے میں قدم رکھا کیونکہ غالباً ان کے افلاس کی وجہ سے ان میں اس وقت تک جوڑا بیاہ سے یک زوجگی پوری طرح ابھرنے نہیں پائی تھی۔ ھم اس نتیجہ پر تین باتوں سے پہونچتے ھیں جن کا تذکرہ ٹیسی ٹس نے کیا ھے۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ انہیں

شادی کے تقدس کا پورا احترام تھا—«ہر مرد ایک بیوی سے مطمئن ہے اور عورتیں عفت و پاکدامنی کے بندھنوں سے بندھی رہتی ہیں»—اونچے درجہ کے مردوں اور قبیلوں کے سرداروں میں کئی بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ یعنی یہاں بھی امریکنوں کی سی حالت تھی، جن میں جوڑا بیاہ کا رواج تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں میں مادری حق کی جگہ پدری حق کچھ ہی دن پہلے قائم ہؤا تھا کیونکہ ماں کے بھائی کو، جوکہ مادری حق کے مطابق گن کے اندر سب سے قریبی رشتہ دار ہوتا تھا، اب بھی باپ کے مقابلہ میں زیادہ قریبی رشتہ دار سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی امریکی انڈینوں کے نقطۂ نظر سے ملتی ہے جن میں مارکس نے، جیسا کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا، ہمارے ماضی کے ماقبل تاریخی زمانہ کو سمجھنے کی کنجی پائی تھی۔ اور تیسری بات یہ کہ جرمنوں میں عورتوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور امورعامہ میں بھی ان کا اثر تھا۔ یہ بات بھی مرد کے غلبہ کے خلاف ہے جو یک‌زوجگی کی خصوصیت ہے۔ تقریباً یہ سبھی باتیں ایسی ہیں جن پر جرمنوں اور اسپارٹا والوں میں اتفاق ہے۔ جرمنوں کی طرح ان میں بھی جوڑا بیاہ پوری طرح نہیں مٹا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی جرمنوں کے عروج کے ساتھ ایک بالکل نئی چیز نے عالمگیر غلبہ حاصل کر لیا۔ رومنوں کی دنیا کے کھنڈروں پر مختلف نسلوں کی آمیزش سے یک‌زوجگی کا جو نیا نظام رائج ہؤا اس نے مردوں کے تسلط کو کسی قدر نرم شکل میں پیش کیا اور

عورت کو باھری دکھاوے کے لئے ھی سہی، کلاسیکی قدیم زمانہ سے کہیں زیادہ آزادی اور عزت عطا کی۔ اس کی وجہ سے پہلی بار یہ ممکن ھؤا کہ اخلاقی ترقی کا وہ سب سے بڑا قدم اٹھایا جائے جو یک زوجگی کی بنیاد پر اور اس کی بدولت آج تک اٹھایا جا سکا ھے۔ یہ ترقی کہیں یک زوجگی کے اندر ھے، کہیں اس کے متوازی ھے اور کہیں اس کے خلاف بھی ھے ــــ اور وہ ھے جدید انفرادی جنسی محبت، جو اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں دیکھی گئی تھی۔

لیکن یہ ترقی یقیناً اس بات کا نتیجہ تھی کہ جرمنی کے لوگ اس وقت تک جوڑا بناکر رھتے تھے اور اس میں عورت کی جو حیثیت تھی، اسی کو انھوں نے یک زوجگی کے نظام پر چسپاں کر دیا۔ اور یہ سمجھنا بالکل غلط ھے کہ جرمنوں کے مزاج کی شہرۂ آفاق اور حیرت انگیز اخلاقی پاکیزگی اس ترقی کا باعث ھوئی۔ جرمنوں کی اخلاقی پاکیزگی بس اسی قدر تھی کہ جوڑا خاندان میں عملاً وہ نمایاں اخلاقی مخالفتیں نہیں ابھری تھیں جو یک زوجگی میں نمودار ھوئیں۔ واقعہ دراصل یہ ھے کہ جرمن لوگ اپنی خانہ بدوشی میں اور خاص کر جنوب مشرق میں بحیرۂ اسود کے ساحلوں پر گھاس کے میدانوں میں رھنے والے خانہ بدوشوں کے پاس پہونچ کر، اخلاقی اعتبار سے بہت گر گئے تھے۔ انھوں نے ان خانہ بدوشوں سے گھوڑ سواری کے علاوہ ان کی غیرفطری اخلاقی برائیاں بھی سیکھہ لی تھیں۔ اس کی

تصدیق امیانس نے ڈائفالی کے بارے میں اور پروکوپیئس نے ہیرولی کے بارے میں پوری صفائی کے ساتھہ کر دی ہے۔

اگرچہ یک‌زوجگی ہی خاندان کی ایک ایسی شکل ہے جس سے جدید جنسی محبت کو فروغ ہو سکتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس خاندان کے اندر یہ محبت محض یا بڑی حد تک شوہر اور بیوی کی باہمی محبت بن کر بڑھی۔ مرد کے غلبہ کے تحت یک‌زوجگی کے سخت اور بےلوچ نظام کی فطرت ہی کچھہ ایسی تھی کہ اس محبت کی نشو و نما کا امکان نہیں رہا تھا۔ ان سبھی طبقوں میں جو تاریخی طور پر سرگرم عمل رہے ہیں، یعنی سبھی حکمران طبقوں میں شادی کی وہی حیثیت تھی جو جوڑا بیاہ کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی — یعنی یہ مصلحت کا معاملہ تھا جس کو والدین طے کیا کرتے تھے۔ اور جنسی محبت کی پہلی صورت جو عشق بن‌کر اٹھی، ایک ایسا عشق جس میں مبتلا ہونے کا حق ہر شخص کو (کم از کم حکمران طبقہ کے ہر شخص کو) تھا اور جو جذبۂ جنسی کی اعلیٰ‌ترین شکل سمجھی جاتی تھی — اور یہی اس کی اصلی خصوصیت بھی تھی — یہ پہلی صورت، عہد وسطی کے سورماؤں کی یہ فداکارانہ محبت ازدواجی محبت ہرگز نہیں تھی۔ اس کے برعکس فرانس کے پرووونسال لوگوں میں جہاں سورماؤں کے اس عشق کی اصلی شکل ملتی ہے، یہ عشق بیاہتا عورت کے ساتھہ علانیہ زناکاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے

شاعر اسی کے گیت گاتے تھے۔ آلبا گیت (albas)، جرمن میں ٹاگیلیڈر (Tagelieder) (یعنی نغمات سحر) پرووِنسال لوگوں کی عشقیہ شاعری کا سب سے شاداب پھول ہے۔ ان گیتوں میں بڑی رنگینی کے ساتھہ یہ داستان سنائی گئی ہے کہ عاشق اپنی محبوبہ کے ساتھہ جو کسی اور کی بیوی ہے، سو رہا ہے اور دربان جو باہر کھڑا پہرہ دے رہا ہے،سحر کی پہلی مدھم کرن (alba) کے پھوٹتے ہی عاشق کو آواز دیتا ہے کہ وہ چپ چاپ نکل چلے۔ اور تب جدائی کی گھڑی آتی ہے جو پورے قصہ کا نقطۂ اوج ہے۔ شمالی فرانس کے لوگوں نے اور قابل قدر جرمنوں نے بھی سورماؤں کے عشق کے ان طور طریقوں کے ساتھہ ساتھہ شاعری کا یہ طرز بھی جو اس عشق کے لئے بہت موزوں تھا، اختیار کر لیا۔ اور ہمارے اپنے والفرام فان‌اشن باخ نے اس موضوع پر تین نغمات سحر لکھے ہیں جو بہت خوبصورت ہیں اور جو مجھے اس کی تینوں طویل رجزیہ نظموں سے زیادہ پسند ہیں۔

خود ہمارے زمانہ کی بورژوا شادی دو طرح کی ہوتی ہے۔ کیتھولک ملکوں میں والدین پہلے کی طرح اب بھی اپنے نوجوان بورژوا بیٹے کے لئے موزوں سی بیوی ڈھونڈ لاتے ہیں اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یک‌زوجگی میں جو تضاد موجود ہے وہ کھل‌کر سامنے آ جاتا ہے۔ شوہر ہیتائرازم کا راستہ لیتا ہے اور بیوی دل کھول‌کر زناکاری کرتی ہے۔ کیتھولک کلیسا نے بلاشبہہ طلاق کو صرف اس لئے مٹایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ موت کی

طرح زناکاری کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے برعکس
پروٹسٹنٹ ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ بورژوا بیٹے کو اپنے
طبقہ کے اندر سے کم وبیش آزادی کے ساتھہ اپنے لئے بیوی
چن لانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لئے ان ملکوں میں
شادی کی بنیاد کسی حد تک محبت پر ہو سکتی ہے۔ اور
پروٹسٹنٹ منافقت کے مطابق دکھاوے کے لئے ہمیشہ یہ فرض
کر ہی لیا جاتا ہے کہ میاں بیوی میں محبت ہے۔ یہاں مرد
کسبیوں اور داشتہ عورتوں کے پیچھے اتنا زیادہ نہیں دوڑتے
اور نہ عورتوں میں زناکاری کا اتنا زیادہ رواج ہوتا ہے۔
شادی کی چاہے کوئی شکل ہو، لوگ شادی کے بعد بھی
وہی رہتے ہیں جو پہلے تھے اور چونکہ پروٹسٹنٹ ملکوں
کے شہری زیادہ تر کم نظر ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم
پروٹسٹنٹ ملکوں میں بھی بہترین مثالوں کا اوسط نکالیں تو
دیکھیں گے کہ یک زوجگی میں میاں بیوی ایک دوسرے سے
اکتا جاتے ہیں، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور اسی کو
ازدواجی مسرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دونوں قسم کی
شادیوں کی بہترین تصویر ناول میں ملتی ہے۔ فرانسیسی
ناولوں میں کیتھولک قسم کی شادی کی تصویر اور جرمن
ناولوں میں پروٹسٹنٹ قسم کی شادیوں کی۔ دونوں میں
مرد «پا لیتا ہے» ــــ جرمن ناول میں نوجوان مرد، لڑکی پا
لیتا ہے اور فرانسیسی ناول میں شوہر، قرمساقی کا تمغہ۔
ان دونوں میں کس کی حالت زیادہ قابل رحم ہے، یہ کہنا
ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ جرمن ناول کا ٹھس پن فرانسیسی

بورژواؤں میں کراهیت کا وهی احساس پیدا کرتا هے جو فرانسیسی ناولوں کی «بدکاری» جرمن کم نظروں میں پیدا کرتی هے۔ لیکن ادهر حال میں چونکه «برلن راجدهانی بن رها هے» اس لئیے جرمن ناولوں میں هیتائرازم اور زناکاری کا ذکر، جو سب کو معلوم هے که عرصے سے وهاں موجود تهی کهل‌کر زیاده دلیری کے ساتهه هونے لگا هے۔

دونوں صورتوں میں شادی فریقین کی طبقاتی حیثیت پر منحصر هوتی هے اور اس حد تک وه همیشه مصلحت کی شادی هوتی هے۔ پهر دونوں هی صورتوں میں مصلحت کی یه شادی اکثر نهایت بےحیائی سے عصمت‌فروشی کا جامه پهن لیتی هے—کبهی کبهی دونوں فریقوں پر لیکن عموماً بیویوں پر یه بات زیاده صادق آتی هے۔ ایک بازاری طوائف اور اس قسم کی بیوی میں فرق صرف یه هوتا هے که وه اجرت پر کام کرنےوالے مزدور کی طرح اپنے جسم کو تهوڑی تهوڑی دیر کے لئیے کرایه پر نهیں دیتی بلکه اسے همیشه کے لئیے غلامی میں فروخت کر دیتی هے۔ اور فورئیے کے الفاظ مصلحت کی ان سبهی شادیوں پر صادق آتے هیں: «جس طرح قواعد میں دو منفی سے مل‌کر ایک مثبت بنتا هے اسی طرح شادی کے اخلاقیات میں دو عصمت‌فروشیوں (بدچلنیوں) سے مل‌کر ایک عصمت (نیک‌چلنی) بنتی هے»۔ شوهر اور بیوی کے رشته میں جنسی محبت کا قاعده صرف مظلوم طبقوں میں یعنی آج کل کے مزدور طبقه میں هو سکتا هے اور سچ پوچهئے تو انهیں میں هوتا بهی هے، چاهے ان کے شوهر

اور بیوی کے رشتہ کو باقاعدہ یہ حیثیت حاصل ہو یا نہ ہو — لیکن ان میں کلاسیکی یک‌زوجگی کی تمام بنیادیں گر جاتی ہیں کیونکہ ان میں ملکیت کا سرے سے کوئی وجود نہیں جس کی حفاظت کرنے اور جسے اپنے بچوں کو وراثت میں دینے کے لئے یک‌زوجگی کا نظام اور اس کے ساتھہ مردوں کا تسلط قائم کیا گیا تھا۔ اسی لئے مزدور طبقہ کے اندر مردوں کا غلبہ قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوئی۔ پھر اسی وجہ سے اس غلبہ کو قائم کرنے کے ذرائع بھی ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ بورژوا قانون جو اس غلبہ کو قائم رکھتا ہے، صرف ملکیت‌والوں کے لئے اور ان کی طرف سے مزدور طبقے کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہے۔ اس قانون سے فائدہ اٹھانے کے لئے روپئے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے جہاں تک مزدور کا تعلق ہے وہ اپنے افلاس کی وجہ سے اپنی بیوی کے معاملہ میں اس قانون سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔ یہاں فیصلہ‌کن حیثیت بالکل مختلف قسم کے شخصی اور سماجی رشتوں کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے کی صنعت نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے نکال‌کر محنت کی منڈی میں، کارخانہ میں پہونچا دیا ہے۔ اکثر عورت ہی خاندان کی روزی کمانے‌والی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کے گھرانوں میں مردوں کے غلبہ کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہی۔ اگر کچھہ رہ گئی ہے تو شاید عورتوں کے ساتھہ بےرحمی سے پیش آنے کی عادت ہے جو یک‌زوجگی کے قائم ہونے کے بعد

سے پوری طرح جڑ پکڑ چکی ہے۔ چنانچہ پرولتاری خاندان کو صحیح معنی میں اب یک زوجگی کا خاندان نہیں کہہ سکتے اور یہ بات ان حالتوں میں بھی صحیح ہے جبکہ فریقین ایک دوسرے سے بڑی گہری محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھہ پوری وفاداری برتتے ہیں اور جہاں انہوں نے شادی کے موقع پر دینی اور دنیوی ساری رسمیں ادا کر لی ہوں۔ یک زوجگی کے دو لوازمات ہیں جو مستقل طور پر اس کے ساتھہ لگے رہتے ہیں، ایک زناکاری اور دوسرے ہیتائرازم۔ اور مزدور کی زندگی میں ان دونوں کے لئیے تقریباً کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ عورت کو علیحدہ ہونے کا حق عملاً پھر سے حاصل ہو چکا ہے اور جب مرد عورت میں نباہ نہیں ہو سکتا تو وہ الگ ہو جانے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مزدوروں کی شادی لفظی اعتبار سے تو یقیناً یک زوجگی کی شادی ہے لیکن تاریخی طور پر قطعی نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے علم قانون کے ماہروں کا دعوی ہے کہ قانون سازی میں جوں جوں ترقی ہوئی ہے عورتوں کی شکایت کے اسباب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے نظام قانون اس بات کو زیادہ سے زیادہ ماننے لگے ہیں کہ شادی تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد دونوں فریقوں کی رضامندی پر ہو اور دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کے دوران میں بھی دونوں فریقوں پر یکساں حقوق اور ذمہ داریاں ہونی چاہئیں۔ لیکن اگر ان

دونوں باتوں پر پوری طرح عمل کیا جائے تو عورتیں جو کچھہ چاھتی ھیں، وہ انہیں حاصل ھو جائےگا۔

یہ خاص وکیلانہ دلیل بالکل ویسی ھی دلیل ھے جس کے ذریعے ریڈیکل، جمہوریت پسند بورژوا، مزدوروں کو ٹال دیتے ھیں۔ مزدوروں کے بارے میں بھی تو یہی کہا جاتا ھے کہ کارخانے میں کام کرنے کرانے کا معاھدہ سرمایہ دار اور مزدور دونوں اپنی اپنی مرضی سے کرتے ھیں۔ لیکن دونوں کی اپنی اپنی مرضی کا مطلب صرف یہ ھے کہ قانون نے دونوں کو کاغذ پر برابر مان لیا ھے۔ ایک فریق کو اپنی مخصوص طبقاتی حیثیت کی وجہ سے جو اختیار حاصل ھے اور دوسرے فریق پر وہ جتنا دباؤ ڈال سکتا ھے یعنی دونوں کی صحیح اقتصادی حالت، یہ سب قانون کی نظر میں کوئی اھمیت نہیں رکھتی اور پھر یہ سمجھہ لیا جاتا ھے کہ کام کرنے کا معاھدہ جتنی مدت کے لئے کیا گیا ھے اس کے دوران میں دونوں فریقوں کے مساوی حقوق ھیں اور یہ حقوق اس وقت تک رھتے ھیں جب تک کوئی فریق انہیں باضابطہ ختم نہ کر دے۔ قانون کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ٹھوس اقتصادی حالت سے مجبور ھوکر مزدور کو ان مساوی حقوق سے اس طرح دست بردار ھونا پڑتا ھے کہ ان کا شائبہ تک نہیں رھنے پاتا۔

جہاں تک شادی کا تعلق ھے، جیسے ھی فریقین اپنی مرضی سے شادی کرنے کی خواھش باقاعدہ ظاھر کرتے ھیں، بڑے سے بڑا ترقی پسند قانون بھی بالکل مطمئن ھوکر

بیٹھہ جاتا ھے۔ لیکن قانون کے پردے کے پیچھے کیا کچھہ ھوتا ھے، جہاں زندگی کے حقیقی واقعات عمل میں آتے ھیں، یہ رضامندی حاصل کیونکر کی جاتی ھے، ان باتوں سے قانون اور قانون بنانےوالوں کو کوئی مطلب نہیں۔ اور یہ قانون بنانےوالے اگر قانونوں کا محض معمولی سا موازنہ بھی کریں تو انہیں معلوم ھو جائےگا کہ یہ رضامندی حقیقت میں ھے کیا۔ ان ملکوں میں جہاں اولاد کو اپنے والدین کی جائداد میں قانونی حق ھے اور انہیں وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا، جیسے جرمنی میں اور ان ملکوں میں جہاں فرانسیسی قانون رائج ھے اور دوسرے ملکوں میں، بچوں کو شادی کے معاملہ میں والدین کی منظوری لینی پڑتی ھے۔ ان ملکوں میں جہاں انگریزی قانون چلتا ھے، جہاں شادی کے لئے والدین کی منظوری قانونی طور پر ضروری نہیں ھے، وھاں والدین کو اپنی جائداد کے بارے میں وصیت کر جانے کا پورا اختیار ھے اور وہ چاھیں تو اپنے بچوں کو ایک ایک پیسہ سے محروم کر سکتے ھیں۔ چنانچہ یہ ظاھر ھے کہ اس کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے انگلینڈ اور امریکہ میں بھی ان سبھی طبقوں میں جن کے پاس وراثت میں چھوڑ جانے کے لئے تھوڑی بہت دولت ھوتی ھے، شادی کرنے کی آزادی فرانس یا جرمنی سے زیادہ نہیں ھے۔

جہاں تک ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کی قانونی برابری کا سوال ھے، وھاں بھی یہی حال ھے۔ قانون کی نظر میں دونوں کی نابرابری جوکہ دراصل گذشتہ سماجی

حالات کا اثر ہے، عورتوں پر اقتصادی ظلم کا سبب نہیں
بلکہ اس کا نتیجہ ہے۔ قدیم کمیونسٹی گھرانوں میں جن
میں متعدد جوڑے اور ان کے بچے رہتے تھے، گھر کا انتظام
عورتوں کے ذمہ ہوتا تھا۔ اور یہ گھر کا نظم و نسق اتنا
ہی عوامی اور سماجی طور پر ضروری کام تھا، جتنا مرد کا
غذا فراہم کرنا۔ پدری خاندان کے قائم ہونے پر یہ حالت
نہیں رہی۔ یک زوجگی کے انفرادی خاندان کے بعد تو حالت
اور بھی بدل گئی۔ گھر کے انتظام کی عمومی حیثیت ختم
ہو گئی۔ سماج کو اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ ایک
نجی خدمت ہو گئی۔ سماجی پیداوار کے دائرے سے الگ کر
دئیے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی۔ یہ صرف
موجودہ زمانہ کی بڑے پیمانے کی صنعت کا اثر تھا کہ سماجی
پیداوار کے دروازے عورتوں کے لئے کھل گئے۔ لیکن یہ
صرف مزدور طبقہ کی عورتوں کے لئے تھا۔ لیکن ان کا
بھی یہ حال ہے کہ جب وہ اپنے گھر کا کام کاج کرتی ہیں
تو سماجی پیداوار کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہیں اور
انہیں اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ اور اگر وہ صنعت
و حرفت میں حصہ لینا چاہتی ہیں اور آپ اپنے پیروں پر
کھڑی ہوکر اپنی روزی کمانے کی کوشش کرتی ہیں تو
اپنے گھر کی ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتیں۔ کارخانہ میں کام
کرنے والی عورتوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہی ان
عورتوں پر بھی صادق آتا ہے جو دوسرے پیشوں میں حتی کہ
ڈاکٹری اور وکالت میں حصہ لیتی ہیں۔ جدید انفرادی خاندان

عورت کی گھریلو غلامی پر مبنی ہے چاہے وہ کھلی غلامی ہو یا پوشیدہ۔ اور موجودہ سماج انہیں انفرادی خاندانوں کے سالموں سے مرکب ہے۔ آج کل زیادہ‌تر حال یہ ہے کہ مرد کماتا ہے اور اپنے گھروالوں کی پرورش کرتا ہے — کم از کم ملکیت‌والے طبقوں میں یہی ہوتا ہے — اور اس کی وجہ سے مرد کو ایک غالب حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جس کے لئے کسی مخصوص قانونی حقوق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خاندان کے اندر شوہر بورژوا ہے اور بیوی مزدور۔ لیکن صنعت و حرفت کی دنیا میں مزدور طبقے کے کندھوں پر اقتصادی لوٹ اور ظلم و ستم کا جو جوا رکھا ہوا ہے اس کی ساری خصوصیتیں اسی وقت پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں جب سرمایہ‌دار طبقے کے مخصوص قانونی اختیارات کا پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور دونوں طبقوں میں مکمل قانونی مساوات قائم کر دی جاتی ہے۔ جمہوری ری‌پبلک میں دونوں طبقوں کا اختلاف ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے برعکس ایسی ری‌پبلک اس اختلاف کے لئے میدان کارزار مہیا کرتی ہے۔ اسی طرح جدید خاندان میں عورت پر مرد کے غلبہ کی مخصوص نوعیت اور مرد عورت میں صحیح معنی میں سماجی مساوات قائم کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ صرف اسی وقت واضح طور پر سامنے آئےگا جب قانون کی نظر میں دونوں کو مکمل مساوات حاصل ہو جائےگی۔ تب ہی یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ عورتوں کی آزادی کی پہلی شرط یہ ہے کہ تمام عورتوں کو صنعت و حرفت کے میدان

میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر خاندان کی یہ حیثیت کہ وہ سماج کی اقتصادی اکائی ہے، ختم کر دی جائے۔

* * *

اب تک ہم نے یہ دیکھا کہ شادی کی تین اہم شکلیں ہیں اور یہ تینوں انسانی ارتقا کی تین خاص منزلوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وحشت کے عہد میں گروہ‌وار شادی، بربریت کے عہد میں جوڑا بیاہ اور تمدن کے عہد میں یک‌زوجگی، جس کے ساتھہ لازم و ملزوم کے طور پر زناکاری اور عصمت‌فروشی لگی ہوتی ہے۔ بربریت کے آخری دور میں جوڑا بیاہ اور یک‌زوجگی کے درمیان ایک دور آتا ہے جب کہ مردوں کا غلام عورتوں پر تسلط ہوتا ہے اور کثرت ازواج یعنی کئی بیویاں رکھنے کا رواج ہوتا ہے۔

ہم نے ابھی تک جو کچھہ بیان کیا اس سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اس سلسلہ میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں وہ اس عجیب و غریب حقیقت سے وابستہ ہیں کہ جہاں عورتیں گروہ‌وار شادی کی جنسی آزادی سے زیادہ سے زیادہ محروم ہوتی گئیں، وہاں مرد نہیں ہوئے۔ سچ پوچھئے تو مردوں کے لئے آج بھی گروہ‌وار شادی موجود ہے۔ عورت کے لئے جو چیز جرم ہے، جس کے لئے اسے قانونی اور سماجی ہر قسم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، وہ چیز مرد کے لئے قابل فخر ہے اور بہت ہوا تو اس کے دامن پر بدچلنی

کا ھلکا سا داغ پڑ جاتا ھے جسے وہ خوشی سے گوارا کر لیتا ھے۔ ھمارے زمانہ میں سرمایہ دارانہ جنس تبادلہ کی پیداوار کی وجہ سے روایتی ھیتائرازم میں جتنی زیادہ تبدیلی ھوتی ھے اور جس قدر وہ اپنے آپ کو اس پیداوار کے سانچے میں ڈھالتی ھے اسی قدر وہ کھلم کھلا عصمت فروشی کی صورت اختیار کرتی جاتی ھے اور اس کا اثر اتنا ھی زیادہ خراب اور تباہ کن ھوتا جاتا ھے۔ اور اس کے اثر سے عورتوں سے کہیں زیادہ مردوں کے اخلاق پست ھوتے ھیں۔ عورتوں میں عصمت فروشی صرف ان بدنصیبوں کو خراب کرتی ھے جو اس کے چنگل میں پھنستی ھیں اور پھر وہ بھی اتنی خراب نہیں ھوتیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ھے۔ اس کے برعکس مردوں میں تو شروع سے آخر تک سب کا اخلاق بگڑ جاتا ھے۔ چنانچہ دس میں نو صورتوں میں لمبے عرصہ کا تعلق دراصل ایک ایسی تربیت گاہ کا کام دیتا ھے جہاں ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھہ بےوفائی کرنے کی تربیت دی جاتی ھے۔

اب ھم ایک ایسے سماجی انقلاب کی طرف بڑھہ رھے ھیں جس میں یک زوجگی کے موجودہ نظام کی اقتصادی بنیادیں ختم ھو جائیں گی اور اسی کے ساتھہ عصمت فروشی کی بنیاد بھی مٹ جائےگی کیونکہ عصمت فروشی اور یک زوجگی کا چولی دامن کا ساتھہ ھے۔ یک زوجگی کی بنیاد یہ ھے کہ ایک ایک آدمی کے پاس، اور وہ بھی مرد کے پاس، کثیر دولت جمع ھو جاتی ھے جس کو وہ صرف اپنے بچوں کے

لئے چھوڑ جانا چاھتا ھے۔ وہ یہ نہیں چاھتا کہ کسی اور مرد کے بچے اس کی دولت کے وارث ھوں۔ اسی لئے یہ ضروری ھؤا کہ عورت ایک ھی مرد سے شادی کرے۔ لیکن مرد کے لئے ایک ھی عورت سے شادی کرنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ چنانچہ یہی ھؤا — عورت کے لئے ایک شوھر کا دستور بنا اور یہ دستور مردوں کو کھلم کھلا یا چوری چھپے کئی بیویاں رکھنے سے نہیں روک سکا۔ لیکن آنے والا سماجی انقلاب اس مستقل دولت کے بڑے حصہ کو جو آج وراثت میں باپ سے بیٹے کو ملتی ھے، یعنی ذرائع پیداوار کو، سماج کی ملکیت بنا دے گا، اور اس لئے یہ فکر کہ میرے بعد میری وراثت کس کو ملے گی بہت کم رہ جائے گی۔ تو کیا ان اقتصادی اسباب کے مٹنے پر، یک زوجگی جو ان کا نتیجہ تھی، خود بھی مٹ جائے گی؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہنا غلط نہیں ھوگا کہ ختم ھونے کے بدلے یک زوجگی کی تکمیل ھونے لگے گی۔ کیونکہ ذرائع پیداوار جب سماج کی ملکیت بن جائیں گے تو اجرتی محنت اور اجرت پر کام کرنے والا مزدور طبقہ بھی ختم ھو جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ، اس بات کی ضرورت بھی نہیں رھے گی کہ کچھ عورتیں جن کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ھے، اپنے آپ کو پیسے کی خاطر مردوں کے حوالہ کریں۔ عصمت فروشی مٹ جائے گی۔ یک زوجگی کا زوال نہیں ھوگا۔ وہ آخرکار ایک حقیقت بن جائے گی، ایک ایسی حقیقت جو مردوں کے لئے بھی ھوگی۔

اِس سے بہرحال مردوں کی حالت بہت بدل جائیے گی۔ لیکن عورتوں کی حالت میں بھی اور سبھی عورتوں کی حالت میں اہم تبدیلیاں ہوں گی۔ ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت بن جائیں گے تو ایک ایک خاندان سماج کی اقتصادی اکائی نہیں رہے گا۔ ذاتی خانہ داری بڑھ‌کر ایک سماجی صنعت کی صورت اختیار کرے گی۔ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ‌داری سماج کے اوپر ہوگی۔ سماج سبھی بچوں کی نگہداشت ایک طرح سے کرے گا۔ بچوں میں یہ فرق نہیں کیا جائیے گا کہ کون شادی کے بعد پیدا ہؤا ہے اور کون شادی کے بغیر۔ اس طرح «نتائج» کی فکر جو آج اخلاقی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے بڑی سماجی اہمیت رکھتی ہے، جو آج ایک لڑکی کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ جس مرد سے محبت کرتی ہے اس کی ہو رہے، وہ فکر ختم ہو جائیے گی۔ لیکن کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جنسی تعلقات زیادہ بےلگام ہو جائیں گے اور کیا اسی کے ساتھہ عورتوں کی عصمت و عفت اور شرم و حیا کے سوال پر بھی رائیے عامہ زیادہ فراخ دلی کا رویہ اختیار نہیں کرے گی؟ اور کیا ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ موجودہ زمانہ میں یک‌زوجگی اور عصمت‌فروشی میں تضاد ہوتے ہوئے بھی چولی دامن کا ساتھہ ہے، دونوں ایک ہی سماجی حالت کے دو رخ ہیں؟ کیا عصمت‌فروشی اپنے ساتھہ یک‌زوجگی کو مٹائے بغیر ختم ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے اور وہ ہے انفرادی جنسی محبت۔ یک زوجگی کی جب ابتدا ہوئی اس وقت یہ انفرادی جنسی محبت زیادہ سے زیادہ محض ایک بیج کی صورت میں رہی ہوگی۔

عہد وسطی سے پہلے انفرادی جنسی محبت جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ جسمانی حسن، گہرے تعلقات، مزاج کی یکسانیت وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن سے مردوں عورتوں میں جنسی تعلق کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرد اور عورتیں کوئی بھی اس بات سے بالکل آنکھ نہیں بند کرتے کہ اتنا گہرا تعلق کس آدمی کے ساتھ قائم ہو رہا ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں مل کر بھی ہمارے زمانہ کی جنسی محبت سے بہت پیچھے ہیں۔ قدیم زمانہ میں ہر جگہ شادی ماں باپ کرتے تھے۔ فریقین چپ چاپ ان کی باتوں کو مان لیتے تھے۔ قدیم زمانہ میں زن و شوہر کی محبت اگر کہیں کچھ تھی تو وہ کوئی داخلی میلان نہیں بلکہ ایک خارجی فرض کی ادائگی تھی۔ وہ شادی کا سبب نہیں بلکہ اس کا ایک نتیجہ تھی۔ موجودہ زمانہ میں عشق و محبت کا جو مفہوم ہے، اس مفہوم میں عشق و عاشقی کی باتیں قدیم زمانہ میں سرکاری سماج کے باہر ہوتی تھیں۔ وہ چرواہے جن کی محبت اور خوشی اور غم کے گیت تھیوکریٹس اور موس چس نے گائے ہیں یا لانگس نے «ڈافنی اور کلوئی» میں جن لوگوں کی داستان سنائی ہے وہ محض غلام تھے، جن کا ریاست میں جو آزاد شہریوں کی

چیز تھی، کوئی حصہ نہیں تھا ۔ غلاموں کے علاوہ اگر محبت
کہیں ملتی ھے تو وہ نتیجہ ھے قدیم دنیا کے زوال کا، جب
اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا ۔ اور یہ محبت بھی ایسی
عورتوں کے ساتھہ کی جاتی تھی جو سماج کے اصلی دائرے
سے باھر تھیں یعنی ھیتائری سے کی جاتی تھی جو یا تو
اجنبی عورتیں تھیں یا غلامی سے آزاد کی ھوئی عورتیں
تھیں ۔ ایتھنز میں اس کے زمانۂ زوال کی ابتدا سے لیکر
بعد تک اور روم میں شہنشاھوں کے عہد میں اسی قسم کی
محبت پائی جاتی تھی ۔ آزاد مرد اور عورت شہریوں میں
اگر واقعی کبھی محبت ھوتی تھی تو وہ زناکاری کی صورت
میں ھوتی تھی ۔ اور جنسی محبت کا جو مفہوم ھمارے یہاں
ھے وہ قدیم زمانہ کے مشہور عشقیہ شاعر اناکریون کے لئے
اتنا بےمعنی تھا کہ اسے اس بات سے بھی کوئی مطلب نہیں
تھا کہ اس کا محبوب عورت ھے یا مرد ۔

ھماری جنسی محبت قدیم زمانہ کے لوگوں کی محض
جنسی شہوت سے، ان کے «ایراس» سے بہت مختلف ھے ۔
جنسی محبت کے لئے ضروری ھے کہ مرد عورت ایک دوسرے
سے محبت کرتے ھوں ۔ اس اعتبار سے عورت کا وھی درجہ
ھے جو مرد کا ۔ اس کے برخلاف قدیم زمانہ کے «ایراس»
میں عورت کی مرضی کا ھمیشہ خیال بھی نہیں کیا جاتا
تھا ۔ دوسرے، جنسی محبت میں اب اتنی شدت اور پائداری
آ گئی ھے کہ دونوں فریق جدائی اور فراق کو اگر سب سے
بڑی نہیں تو بہت بڑی مصیبت ضرور سمجھتے ھیں ۔ ایک

دوسرے کا وصال حاصل کرنے کے لئے وہ کیا کیا خطرے نہیں اٹھاتے، جان جوکھم میں ڈالتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اگر کبھی ایسا ہوتا بھی تھا تو محض زناکاری کے لئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنسی تعلق کے محاسبہ کے لئے ایک نیا اخلاقی معیار قائم ہو رہا ہے۔ اب سوال صرف یہ نہیں ہے کہ جنسی تعلق جائز تھا یا ناجائز بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد باہمی محبت پر تھی یا نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جاگیری یا بورژوا سماج میں اس نئے معیار کا بھی عملاً وہی حشر ہو رہا ہے جو اور سبھی اخلاقی معیاروں کا ہؤا۔ یعنی اسے بھی محض نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن اس کا حشر ان سبھوں سے زیادہ برا بھی نہیں ہؤا۔ اور معیاروں کی طرح اسے بھی محض نظری طور پر، کاغذ کے اوپر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور سردست اس سے زیادہ کوئی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔

جنسی محبت کی طرف قدم اٹھانے کے بعد عہد قدیم نے جہاں سے سلسلہ توڑ دیا وہیں سے عہد وسطی نے اس کی ابتدا کی — یعنی زناکاری سے۔ ہم سورماؤں کی فداکارانہ محبت کا ذکر کر آئے ہیں جس سے «نغمات سحر» کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس قسم کی محبت میں جس کا مقصد ازدواجی زندگی کے رشتہ کو منقطع کرنا تھا اور اس محبت میں جس کی بنیاد پر ازدواجی زندگی قائم اور استوار ہوتی ہے، بڑا گہرا فرق ہے اور ساونتوں سورماؤں کے عہد نے اس خلیج کو پاٹنے میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ جب ہم

بدچلن لاطینیوں سے ہوکر پاکباز جرمنوں تک پہونچتے ہیں تو وہاں بھی یہی دیکھتے ہیں کہ نائبے لنگنلائڈ میں کرائم ھائلڈ کو درپردہ سگفریڈ سے عشق ہو گیا ہے۔ اور وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اس کے باوجود جب گنتھر اسے بتایا ہے کہ اس کی سگائی ایک سورما سے کر دی گئی ہے جس کا نام تک وہ اسے نہیں بتلاتا تو کرائم ھائلڈ یہی کہتی ہے کہ «آپ کو پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر۔ جیسا حکم دیں گے بندی تعمیل کرے گی۔ حضور جس کو منتخب کریں گے میں اس کو اپنا شوہر بنا لوں گی» ۔ اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس معاملہ میں اس کی اپنی محبت کا بھی کوئی سوال ہو سکتا ہے۔ جس طرح گنتھر برون ھائلڈ کو کبھی ایک بار دیکھے بغیر بیاہ لایا تھا، اسی طرح کرائم ھائلڈ کو ایٹزل کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ «گڈرون» میں بھی یہی ہوتا ہے۔ آئرلینڈ کا سائگبانٹ ناروے کی دوشیزہ اوتے سے شادی کی درخواست کرتا ہے اور ھیگے لنگن کا رہنے والا ھی ٹیل آئرلینڈ کی ھلڈے سے اور آخر میں مورلینڈ کا سگفریڈ، اور اورمانی کا ھارٹموٹ، اور سیلینڈ کا ھروگ گڈرون سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہاں پہلی بار یہ واقعہ ہوتا ہے کہ گڈرون خود اپنی پسند سے ھروگ کے حق میں فیصلہ کرتی ہے۔ عام طور سے ایک نوجوان شہزادے کی دلہن کا انتخاب اس کے ماں باپ کرتے تھے۔ اور اگر وہ زندہ نہ ہوتے تو وہ

شہزادہ اپنے سب سے بڑے باجگذار سرداروں کے مشورے سے اس کا انتخاب کرتا تھا۔ ان سرداروں کے مشورے کی بڑی اہمیت تھی اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ کسی نائٹ یا بیرن (نوابوں کے مختلف درجے) کی شادی خود بادشاہ کی طرح سیاسی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کے ذریعہ نئے نئے لوگوں سے اتحاد کرکے اپنی طاقت میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس معاملہ میں انفرادی پسند ناپسند نہیں بلکہ خاندانی مفاد فیصلہ‌کن ہوتا تھا۔ ایسی شادی میں محبت کو کیا دخل ہو سکتا تھا؟

عہد وسطی کے شہروں میں «گلڈ»* کے اراکین کا بھی یہی حال تھا۔ انہیں جو مراعات حاصل تھیں — اہل حرفہ کی انجمنوں کی سندیں، اور ان کے مخصوص تحفظات، وہ مصنوعی دیواریں جو انہیں اہل حرفہ کی دوسری انجمنوں سے، اپنے ہم‌پیشہ دوسرے کاریگروں سے اور اپنے شاگردوں اور نوسکھئے لوگوں سے، قانونی طور پر الگ کرتی تھیں — وہی مراعات اس دائرے کو محدود کئے رکھتی تھیں جس کے اندر اس کو اپنی بیوی چننی تھی۔ کون سب سے اچھی اور موزوں ہوگی، یہ سوال انفرادی پسند ناپسند سے نہیں بلکہ خاندانی مفاد کی روشنی میں طے ہوتا تھا۔

مختصر یہ کہ عہد وسطی کے آخر تک زیادہ‌تر صورتوں

---

* گلڈ۔ قرون وسطی میں ہم‌پیشہ استاد کاریگروں کی انجمن یا برادری۔ (اڈیٹر۔)

میں شادی کی حیثیت وہی رہی جو اس عہد کے شروع میں تھی — یعنی یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کا فیصلہ وہ دونوں فریق نہیں کرتے تھے جن کو اس سے سب سے زیادہ تعلق تھا۔ سب سے پہلے یہ حال تھا کہ انسان جب دنیا میں آتا تو اس کی شادی پیدائش سے پہلے ہی جنس مخالف کے ایک پورے گروہ کے ساتھ ہو چکی ہوتی تھی۔ گروہ‌وار شادی کی بعد کی شکلوں میں بھی غالباً اسی قسم کے تعلقات قائم رہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس گروہ کا دائرہ برابر محدود ہوتا جا رہا تھا۔ جوڑا بیاہ میں یہ قاعدہ تھا کہ مائیں اپنے بچوں کی شادی طے کرتی تھیں۔ اور وہاں بھی فیصلہ‌کن سوال یہ تھا کہ کون سا رشتہ، گن اور قبیلے میں نئے جوڑے کی حیثیت کو مضبوط کرے گا۔ اور جب اجتماعی ملکیت کے اوپر ذاتی ملکیت کا غلبہ ہؤا اور وراثت کے خیال کے ساتھ ساتھ پدری حق اور یک‌زوجگی کا رواج ہؤا تو شادی زیادہ سے زیادہ اقتصادی مصلحتوں پر منحصر ہونے لگی۔ شادی کی وہ شکل تو نہیں رہی جس میں بیوی خریدی جاتی تھی لیکن شادی زیادہ سے زیادہ اس طرح انجام دی جانے لگی کہ نہ صرف عورت بلکہ مرد کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ذاتی اوصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی جائداد اور ملکیت کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ شروع ہی سے حکمراں طبقوں میں جو رواج چلا آتا تھا اس میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شادی میں دولہا دلہن کی اپنی مرضی اور پسند کو کوئی دخل ہونا چاہئیے۔ ایسی باتیں صرف رومان کی

خیالی دنیا میں ممکن تھیں یا پھر مظلوم طبقوں میں ہو سکتی تھیں اور ظاہر ہے کہ وہ قابل اعتنا نہیں تھے۔

یہ تھی صورت حال جب سرمایہ دارانہ پیداوار نے جغرافیائی دریافتوں کے دور کے بعد تجارت و حرفت کے ذریعہ دنیا کو یافتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ شادی کا یہ طریقہ اس نظام پیداوار کے لئے بہت زیادہ موزون تھا۔ اور بات بھی یہی تھی۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفیوں کی تہہ تک کون پہونچ سکتا ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام پیداوار نے ہی بیاہ کے اس طریقے کی بنیاد ہلا دی۔ اس نے ہر چیز کو جنس تبادلہ (یعنی بکاؤ مال) بنا دیا۔ اس نے تمام قدیمی روایتی تعلقات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ موروثی رسم و رواج اور تاریخی حقوق کے بدلے اس نے خرید و فروخت یا «آزاد» معاھدے کو رواج دیا۔ اور انگلینڈ کے ماھرعلم‌قانون ایچ۔ ایس۔ مین نے لکھا کہ پچھلے ادوار کے مقابلہ میں ہماری ساری ترقی یہ ہے کہ ہم رتبہ اور حیثیت سے ترقی کر کے معاھدے تک پہونچ گئے ہیں from status to contract — ایک ایسی صورت حال سے جو باپ سے بیٹے تک جوں کی توں منتقل ہوتی تھی، ہم ایک ایسی حالت میں پہونچ گئے جہاں اپنی رضامندی سے معاھدے کئے جاتے ہیں۔ مین کا خیال تھا کہ یہ لکھہ کر اس نے کوئی بڑا بھاری انکشاف کیا ہے حالانکہ اس کے قول میں جو کچھہ سچائی ہے وہ پہلے ہی کمیونسٹ مینی‌فسٹو» میں بیان کر دی گئی تھی۔

لیکن معاھدہ کرنے کے لئے ایسے لوگوں کا ہونا ضروری

ہے جو اپنا، اپنے اعمال کا اور اپنی چیزوں کا آزادی کے ساتھ لین دین کر سکیں اور جو ایک دوسرے سے مساوات کی بنیاد پر مل سکیں۔ سرمایہ دارانہ نظام پیداوار کا ایک خاص کام ایسے ہی «آزاد» اور «مساوی» لوگوں کی تخلیق کرنا تھا۔ ابتدا میں اگرچہ یہ کام محض نیم شعوری طور پر اور قطعی طور پر مذہب کے پردے میں کیا گیا، تاہم لوتھر اور کالون کی تحریک اصلاح کے زمانہ سے یہ پختہ اصول بن گیا کہ انسان اپنے اعمال کے لئے پوری طرح ذمہ دار اسی وقت ہوتا ہے جب اسے ان کاموں کو کرتے وقت اپنے ارادے کی پوری آزادی حاصل ہو اور یہ کہ غیراخلاقی کاموں کے لئے جو دباؤ ڈالا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن بیاہ کا جو طریقہ رائج تھا، اس کے ساتھ اس اصول کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ بورژوا تصورات کے مطابق شادی ایک معاہدہ ہے، ایک قانونی معاملہ ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ سب معاہدوں سے زیادہ اہم بھی ہے کیونکہ اس میں زندگی بھر کے لئے دو انسانوں کے جسم و جان کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بظاہر یہ سودا اپنی مرضی سے کیا جاتا تھا۔ فریقین کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن یہ کس کو نہیں معلوم تھا کہ رضامندی کیسے حاصل کی جاتی تھی اور اصل میں شادی کون لوگ طے کرتے تھے۔ لیکن اگر اور سبھی معاہدوں کے لئے فیصلہ کرنے کی پوری آزادی کا مطالبہ تھا تو پھر اس معاہدے کے لئے بھی اس کا مطالبہ کیوں نہ ہو؟

کیا اس نوجوان لڑکے اور لڑکی کو جو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے باندھے جانے والے تھے، یہ حق نہیں تھا کہ آزادی کے ساتھ اپنے بارے میں، اپنے جسم اور اس کے اعضا کے بارے میں فیصلہ کریں؟ کیا سورماؤں کے فداکارانہ عشق کی بدولت جنسی محبت کا فیشن نہیں ہو گیا تھا اور کیا سورماؤں کی زناکاری کی محبت کے برخلاف شوہر اور بیوی کی محبت اس کی صحیح بورژوا شکل نہیں تھی؟ لیکن اگر شادی شدہ جوڑوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں تو کیا یہ عاشق و معشوق کا اتنا ہی زیادہ فرض نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے علاوہ اور کسی سے شادی نہ کریں؟ اور کیا ان محبت کرنے والوں کا حق باپ ماں، رشتہ داروں اور دوسرے روایتی مشاطہ گیری کرنے والوں کے حق سے بلند تر نہیں تھا؟ اگر آزادی کے ساتھ ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے کا حق دراتا ہؤا کلیسا اور مذہب کے دائرے میں گھس آیا تھا تو پھر وہ نئی نسل کے جسم و جان کے اوپر، ان کی ملکیت، خوشی اور غم کے اوپر پرانی نسل کے لوگوں کے ناقابل برداشت دعووں کے سامنے پہونچ کر کیوں کر رک جا سکتا تھا؟

ایک ایسے دور میں جبکہ سارے پرانے سماجی بندھن ڈھیلے ہو رہے تھے اور تمام روایتی تصورات کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں، یہ سبھی سوالات لازمی طور پر اٹھ رہے تھے۔ چشم زدن میں دنیا کی وسعت دس گنا بڑھ گئی تھی۔ پہلے جہاں مغربی یورپ والوں کی نظروں کے سامنے کرۂ زمین کے نصف کا بھی محض ایک چوتھائی حصہ تھا، اب پورے

کرۂ زمین کے دروازے ان پر کھل گئے تھے اور وہ باقی ساتوں ربعات پر اپنا جھنڈا نصب کرنے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔ عہد وسطی کے بندھے ٹکے طرز فکر نے ذہن پر جو ہزاروں سال پرانی چوکیاں بٹھا رکھی تھیں وہ دیکھتے دیکھتے اسی طرح ختم ہو گئیں جس طرح ارض وطن کی پرانی تنگ حدبندیاں۔ ایک نہایت وسیع افق انسان کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کے سامنے کھل گیا تھا۔ وہ نوجوان جن کی آنکھوں میں ہندوستان کی دولت سما گئی تھی، جو میکسیکو اور پوٹوسی کی سونے چاندی کی کانوں پر اپنا ایمان دھرم کھو بیٹھے تھے، ان کے لئے شرافت و نجابت کی اور پیشہ ور انجمنوں کے نسلاً بعدنسل چلے آنےوالے پرانے امتیازات اور مراعات کی کیا وقعت ہو سکتی تھی؟ یہ بورژوا طبقہ کا مہم جو سورمائی عہد تھا، اس کا اپنا رومان بھی تھا، پریم کے سپنے بھی تھے لیکن ان کی بنیاد بورژوا تھی اور آخر تک تجزیہ کیا جائے تو اس کے پیش نظر مقصد بھی بورژوا تھا۔

چنانچہ اس طرح نوخیز بورژوا طبقہ نے، خاص کر پروٹسٹنٹ ملکوں میں جہاں موجودہ نظام کی بنیادیں سب سے زیادہ ہل گئی تھیں، شادی میں بھی معاہدے کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ تسلیم کر لیا اور مذکورۂ بالا طریقے سے اس کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ شادی طبقاتی شادی ہی رہی مگر اپنے طبقہ کی حدود کے اندر فریقین کو کسی حد تک انتخاب کی آزادی مل گئی۔ اور کاغذ پر، اخلاقیات کے اصولوں میں اور شاعری میں بھی یہ چیز مان لی گئی کہ ہر وہ

شادی جس کی بنیاد فریقین کی باہمی جنسی محبت اور شوہر اور بیوی کی حقیقی اور آزادانہ رضامندی پر نہیں ہے وہ شادی اخلاق سے گری ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ محبت کی شادی کو انسانی حق کا درجہ دے دیا گیا۔ وہ صرف مرد کا حق (droit de l'homme) ہی نہیں بلکہ ایک مستثنی کے طور پر، عورت کا حق (droit de la femme) بھی تھا۔

لیکن ایک اعتبار سے یہ انسانی حق تمام دوسرے نام نہاد انسانی حقوق سے مختلف تھا۔ عملاً ان نام نہاد انسانی حقوق کی عملداری حکمراں طبقہ یعنی بورژوا طبقہ تک ہی محدود تھی اور مظلوم طبقہ یعنی مزدور براہ راست یا بالواسطہ ان سے محروم تھے۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی نے یہاں بھی اپنا اثر دکھلایا۔ حکمراں طبقہ پر آج بھی ان اقتصادی اثرات کا غلبہ ہے جن سے ہم واقف ہیں اور اس لئے ان میں شاذ و نادر ہی ایسی شادیاں دیکھنے میں آتی ہیں جو حقیقی معنی میں فریقین کی اپنی رضامندی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مظلوم طبقے میں یہی عام قاعدہ ہے۔

غرضکہ شادی میں پوری آزادی کے اصول پر اسی وقت عملدرآمد ہو سکتا ہے جب سرمایہ دارانہ نظام پیداوار اور اس کے لائے ہوئے ملکیت کے رشتے مٹ جائیں اور اس کی وجہ سے وہ سبھی ضمنی اقتصادی مصلحتیں بھی ختم ہو جائیں جو آج تک شریک زندگی کے انتخاب پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ اور تب باہمی محبت کے سوا شادی کی اور کوئی بنیاد باقی نہیں رہے گی۔

جنسی محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے محبوب کی طالب ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بلا شرکت غیرے کے اصول پر آج کل صرف عورتوں کے سلسلہ میں پوری طرح عمل کیا جاتا ہے — اس لئے جو شادی جنسی محبت پر مبنی ہوگی وہ اپنی خاصیت کی بنا پر یک زوجگی پر بھی مبنی ہوگی۔ باخوفن نے صحیح کہا تھا کہ گروہ وار شادی سے انفرادی شادی کی نشو و نما دراصل عورتوں کا کام ہے۔ یہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ صرف جوڑا بیاہ سے یک زوجگی کا ارتقا مرد کا کام ہو سکتا ہے۔ اور تاریخی طور پر سچ پوچھئے تو اس سے عورتوں کی حالت اور خراب ہو گئی اور مردوں کے لئے بےوفائی کرنا اور آسان ہو گیا۔ جب وہ اقتصادی مصلحتیں ختم ہو جائیں گی جن کی وجہ سے مجبور ہوکر عورتوں کو مردوں کی بےوفائی برداشت کرنی پڑتی تھی یعنی جب انہیں اپنی روزی کی اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہیں ستایا کرے گی تو عورتوں اور مردوں میں مساوات قائم ہو جائے گی۔ اور پچھلے تمام تجربوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مساوات کی وجہ سے عورتوں میں متعدد شوہروں سے شادی کرنے کا رجحان نہیں پیدا ہوگا بلکہ اس سے کہیں زیادہ مردوں میں حقیقی یک زوجگی پر عمل کرنے کا رجحان پیدا ہوگا۔

یک زوجگی کے نظام سے کچھ باتیں یقیناً مٹ جائیں گی۔ یہ مٹنے والی باتیں اس کی وہ سبھی خصوصیتیں ہیں جو ملکیت

کے تعلقات سے پیدا ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ لگ گئی ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت تو مرد کا غلبہ ہے اور دوسری شادی کے رشتہ کا اٹوٹ ہونا۔ ازدواجی زندگی میں مرد کا تسلط اصل میں اس کے اقتصادی تسلط کا نتیجہ ہے اور اس کے ختم ہونے پر وہ بھی آپ ہی آپ ختم ہو جائیے گا۔ شادی کے رشتے کے اٹوٹ ہونے کی وجہ ایک حد تک وہ اقتصادی حالات تھے جن کے تحت یک زوجگی قائم ہوئی تھی اور کسی حد تک اس زمانہ کے روایتی اثرات تھے جب کہ ان اقتصادی حالات اور یک زوجگی کے تعلق کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا تھا اور مذہب نے اس کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا تھا۔ آج اس دیوار میں ہزاروں شگاف پڑ چکے ہیں۔ اگر صرف وہی شادیاں اخلاقی نقطۂ نظر سے صحیح ہیں جو محبت پر مبنی ہیں تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہی ازدواجی زندگی اخلاقی نقطۂ نظر سے صحیح ہے جس میں محبت قائم رہتی ہے۔ انفرادی جنسی محبت کی میعاد مختلف افراد میں خاص کر مردوں میں بہت مختلف ہوتی ہے۔ اور جب انس باقی نہ رہے، یا جب ایک نئی محبت کا پرجوش جذبہ اس کی جگہ لے لے تو علیحدگی فریقین کے لئے اور خود سماج کے لئے بھی ایک رحمت ثابت ہوتی ہے۔ اور ایسی صورت میں لوگ طلاق کے مقدموں کی فضول دلدل میں سے گذرنے کے تجربے سے بچ جائیں گے۔

سرمایہ دارانہ نظام پیداوار کے مٹ جانے کے بعد جنسی تعلقات کی کیا صورت ہوگی، اس کے بارے میں آج ہم جو

قیاس آرائی کر سکتے ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی منفی قسم کی ہے یعنی زیادہ تر وہ قیاس آرائی صرف اسی حد تک ہے کہ کونسی چیزیں مٹ جائیں گی۔ لیکن کون سی نئی خصوصیتیں ہیں جن کا اضافہ ہوگا؟ اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب ایک نئی نسل پروان چڑھ چکے گی۔ وہ ایسے مردوں کی نسل ہوگی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کی عصمت چاندی کے چند سکوں کے عوض نہیں خریدی ہوگی اور نہ اسے حاصل کرنے کے لئے کسی اور طرح کے سماجی اختیار سے کام لیا ہوگا۔ اور وہ ایسی عورتوں کی نسل ہوگی جو سچی محبت کے سوا اور کسی وجہ سے اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالہ کرنے پر مجبور نہیں ہوئی ہوں گی اور نہ انہیں اقتصادی مجبوریوں کے ڈر سے اپنے محبوب سے شادی کا خیال ترک کرنا پڑا ہوگا۔ جب ایسے مرد اور ایسی عورتیں وجود میں آ جائیں گی تو پھر انہیں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہوگی کہ ہم کیا سوچتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئیے۔ وہ خود اپنے ساتھ اپنا عمل لائیں گے اور اسی کے مطابق ہر فرد کے عمل کے بارے میں اپنی رائے عامہ تیار کریں گے۔ اور یہیں یہ بات ختم ہو جاتی ہے۔

اس اثنا میں ہم پھر مارگن کی طرف رجوع کریں جس کو چھوڑکر ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ تمدن کے عہد میں جن سماجی اداروں کی نشو و نما ہوئی، ان کی تاریخی چھان بین مارگن کی کتاب کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ وہ اس عہد میں یک زوجگی کے انجام کے سوال پر صرف

مختصر طور پر بحث کرتا ہے۔ وہ بھی یک زوجگی کے خاندان کی نشو و نما کو ایک بڑی ترقی سمجھتا ہے۔ اس کی رائے میں اس سے مردوں عورتوں کی مکمل مساوات قریب آ جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ منزل آ پہونچی۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ «جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ خاندان کی یکے بعد دیگرے چار شکلیں ہوئی ہیں اور اب یہ اس کی پانچویں شکل ہے تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ شکل آئندہ ہمیشہ رہے گی۔ اس کا ایک ہی جواب دیا جا سکتا ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ جیسے جیسے سماج ترقی کرے گا، خاندان کی شکل میں بھی ترقی ہوگی، جیسے جیسے سماج میں تبدیلی ہوگی، خاندان کی شکل میں بھی تبدیلی ہوگی۔ یہی پہلے بھی ہؤا ہے، یہی آئندہ بھی ہوگا۔ وہ سماجی نظام کی تخلیق ہے اور اس میں اسی کی تہذیب کی جھلک دکھائی دے گی۔ جس طرح تمدن کے آغاز کے زمانہ سے آج تک یک زوجگی کے خاندان میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور موجودہ زمانہ میں نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ ہوئی ہے، اسی طرح کم از کم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ اس میں اتنی ترقی ہوگی کہ مردوں اور عورتوں میں مکمل مساوات قائم ہو جائے گی۔ اگر مستقبل بعید میں یک زوجگی کا خاندان سماج کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا تو آج یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس کے بعد آنے والے نظام کی خاصیت اور فطرت کیا ہوگی۔»

۳

ایروکواس لوگوں کا گن

اب ہم مارگن کی ایک اور دریافت کو لیتے ہیں، جو کم سے کم اتنی ہی اہم ہے جتنی یک جدی قرابت داری (سگوتر) کے نظاموں سے خاندان کی ابتدائی صورتوں کی دریافت تھی ـ مارگن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکی انڈین قبیلوں کے اندر سگوتر لوگوں یعنی یک‌جدی قرابت داروں کی جو جماعتیں تھیں اور جن کے نام جانوروں کے نام پر رکھے جاتے تھے، وہ بنیادی طور پر وہی چیز تھی جو یونانیوں کی جینیا (genêa) اور رومیوں کی جنٹس (gentes) تھی۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ گن کی ابتدائی صورت اصل میں وہ ہے جو امریکہ میں ملتی ہے اور یونان اور روم کے گن بعد کی پیداوار ہیں اور اسی سے ماخوذ ہیں ـ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے یونانیوں اور رومیوں میں سماج گنوں، فریٹریوں (برادریوں) اور قبیلوں میں منظم تھا ـ ہو بہو ویسی ہی تنظیم امریکی انڈینوں میں بھی پائی جاتی ہے ـ اور (جہاں تک ہماری موجودہ واقفیت

ہے) گن ایک ایسا ادارہ ہے جو تمدن کے عہد میں داخل ہونے تک اور یہاں تک کہ اس کے بعد بھی سبھی بربری لوگوں میں پایا جاتا ہے ۔ ان باتوں کا ثبوت مل جانے سے قدیم یونانی اور رومی تاریخ کی مشکل ترین گتھیاں چشم زدن میں سلجھ گئیں ۔ ساتھ ہی اس دریافت نے قدیم زمانہ کے — یعنی ریاست کی ابتدا ہونے سے پہلے کے — سماجی دستور کی بنیادی خصوصیتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے جس کی کسی کو توقع تک نہ تھی ۔ ایک بار جان لینے کے بعد یہ بات کتنی ہی آسان اور سیدھی سادی کیوں نہ معلوم ہو لیکن مارگن اس کا پتہ ابھی حال میں ہی لگا سکا ہے ۔ ۱۸۷۱ء میں جب اس کی کتاب شائع ہوئی تھی تو اس وقت تک وہ اس راز کو نہیں پا سکا تھا ۔ اور جب مارگن نے اس راز کو پالیا تو انگلستان کے ماقبل تاریخ کے ماہر جنہیں اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا، مجبوراً کچھ دنوں کے لئے چپ چاپ چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں جا گھسے ۔

مارگن نے یکجدی قرابت داروں (سگوتر لوگوں) کی اس جماعت کے لئے عام طور پر لاطینی زبان کے لفظ جنس (gens) کو استعمال کیا ہے ۔ یہ لفظ بھی اپنے یونانی مرادف جیناس (genos) کی طرح ایک ہی آریائی مادہ جن یا گن (gan) سے ماخوذ ہے (جرمن زبان میں قاعدہ کے مطابق آریائی گاف بدل کر کاف ہو جاتا ہے، چنانچہ جرمن میں یہ لفظ کن (kan) ہے) جس کے معنی ہیں جننا، جنم دینا ۔ جن (gens)، جیناس (genos)، سنسکرت جاناس (dschanas)، گوتھک کونی (kuni)

(مذکورۂ بالا قاعدے کے مطابق)، قدیم نارڈک اور اینگلوسیکسن کائن (kyn)، انگریزی کن (kin)، وسطی ٹکسالی جرمن زبان کا لفظ کونی (künne)، سبھی کا ایک ھی مطلب ھے، قرابت داری، نسل۔ لیکن لاطینی زبان کا جن (gens) اور یونانی کا جیناس (genos) خاص طور پر ایسے قرابت داروں کی جماعت کے لئے استعمال کیا جاتا ھے جن کو ایک ھی مورث اعلی کی (اور اس صورت میں مرد مورث اعلی کی) اولاد ھونے کا دعوی ھے، اور جو بعض سماجی اور مذھبی اداروں کے ذریعہ سے ایک مخصوص کمیونیٹی یا برادری کے رشتے میں منسلک ھو گئے ھیں جس کے ابتدائی حالات اور نوعیت کے بارے میں آج تک ھمارے سبھی مورخ تاریکی میں تھے۔

پونالوان خاندان کے سلسلہ میں ھم اوپر دیکھہ آئے ھیں کہ شروع میں جینس یا گن کیسے بنتا ھے۔ اس میں وہ تمام لوگ شامل ھوتے تھے جو پونالوان شادی کی بدولت اور ان تصورات کے مطابق جو لازمی طور پر اس کے اندر قائم ھوتے تھے، ایک خاص عورت مورث اعلی کی جو اس گن کی بانی تھی، اولاد مانے جاتے تھے۔ چونکہ خاندان کی اس شکل میں یقین کے ساتھہ نہیں کہا جا سکتا کہ بچے کا باپ کون ھے، اس لئے نسل صرف عورتوں سے چلتی ھے۔ اور چونکہ بھائی بہن میں شادی نہیں ھو سکتی تھی اور مرد صرف دوسری نسل کی عورتوں سے شادی کر سکتے تھے، اس لئے ایسی عورتوں سے جو بچے پیدا ھوتے تھے، وہ مادری حق کے مطابق گن سے باھر چلے جاتے تھے۔ اس طرح ھر

نسل میں صرف لڑکیوں کی اولاد قرابت داری کے دائرے میں رہ سکتی تھی اور بیٹوں کی اولاد اپنی ماں کے گنوں میں چلی جاتی تھی۔ یکجدی قرابت داروں کی یہ (سگوتر) جماعت جب قبیلے کے اندر اپنی جیسی دوسری جماعتوں سے علیحدہ ایک جماعت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟

مارگن نے ایروکواس لوگوں کے اور ان میں بھی خاص کر سینیکا قبیلہ کے گنوں کو ابتدائی گنوں کی کلاسیکی شکل مانا ہے۔ ان لوگوں میں آٹھ گن ہیں جن کے نام مندرجۂ ذیل جانوروں کے نام پر رکھے گئے ہیں: (۱) بھیڑیا۔ (۲) بھالو۔ (۳) کچھوا۔ (٤) اودبلاؤ۔ (۵) ہرن۔ (٦) چہا۔ (۷) بگلا۔ (۸) باز۔ ان میں سے ہر گن میں حسب ذیل رسم و رواج پائے جاتے ہیں:

(۱) وہ اپنا ساشم (یعنی امن کے زمانہ کا رہنما) اور اپنا سالار (یعنی جنگ کا رہنما) چنتا ہے۔ ساشم کو گن کے اندر سے ہی چننا پڑتا تھا اور اس کا عہدہ گن کے اندر موروثی ہوتا تھا جس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جیسے ہی یہ جگہ خالی ہوتی اس کو پر کر دیا جاتا تھا۔ جنگی سالار گن کے باہر سے بھی چنا جا سکتا تھا اور کبھی کبھی جگہ خالی بھی رہتی تھی۔ سابق ساشم کا بیٹا کبھی اس کا جانشین نہیں ہو سکتا کیونکہ ایروکواس لوگوں میں مادری حق کا رواج تھا اور اسی لئے بیٹا دوسرے گن کا رکن ہوتا تھا۔ لیکن ساشم کا بھائی یا بھانجا اکثر اس کی جگہ پر چن لیا

جاتا تھا۔ انتخاب میں عورت اور مرد دونوں ووٹ دیتے تھے۔ لیکن جو آدمی چنا جاتا تھا اسے باقی سات گنوں کی منظوری بھی لینی پڑتی تھی، اس کے بعد ھی اسے باقاعدہ ساشم کے عہدے پر بٹھلایا جاتا تھا اور یہ رسم تمام ایروکواس لوگوں کے وفاق کی عام کاؤنسل انجام دیتی تھی۔ اس کی اھمیت آگے چل کر واضح ھوگی۔ گن کے اندر ساشم کا اقتدار محض بزرگانہ اور خالص اخلاقی نوعیت کا ھوتا تھا۔ اس کے ھاتھہ میں جبر کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ اپنے عہدے کی بدولت وہ سینیکا قبیلہ کی کاؤنسل کا رکن بھی تھا اور سبھی ایروکواس‌قبیلوں کی وفاقی کاؤنسل کا بھی۔ جنگی سالار صرف فوجی مہم کے دوران میں حکم دے سکتا تھا۔

(۲) گن اپنے ساشم اور جنگی سالار کو جب چاھے برطرف کر سکتا تھا۔ یہ کام بھی مرد اور عورت مل کر کرتے تھے۔ اس کے بعد برطرف کیا ھؤا آدمی اوروں کی طرح ایک عام سپاھی یا شہری کی حیثیت سے رھتا تھا۔ قبیلہ کی کاؤنسل گن کی خواھش کے خلاف بھی ساشم کو برطرف کر سکتی تھی۔

(۳) کسی شخص کو گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ گن کا بنیادی قاعدہ تھا جو اس کی شیرازہ بندی کو قائم رکھتا تھا۔ اس منفی صورت میں دراصل خون کے اس نہایت مثبت رشتے کا اظہار ھوتا تھا جس کی بدولت ان افراد کو جو یہاں جمع تھے، ملاکر گن بنایا گیا تھا۔ اس معمولی سی حقیقت کو دریافت کر کے مارگن نے پہلی

مرتبہ گنوں کی نوعیت کا انکشاف کیا ۔ اس وقت تک لوگ گن کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھتے تھے ۔ اور یہی وجہ تھی کہ وحشی اور بربری لوگوں کے بارے میں پہلے کی رپورٹوں میں، ان مختلف جماعتوں کو جن سے مل کر گن کی تنظیم بنتی ہے، بلا سوچے سمجھے اوز بلاکسی فرق اور امتیاز کے قبیلہ، جرگہ اور تھم وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا تھا اور کبھی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کے اندر شادی کرنے کی ممانعت ہے ۔ اور اس طرح وہ الجھن پیدا کی گئی جس کو دور کرنے کے لئے مسٹر میکلینن نے مداخلت کی اور انھوں نے نپولین کی طرح ایک فرمان نکال کر نظم و ترتیب قائم کرنا چاہا ۔ انہوں نے فرمان صادر کر دیا کہ سبھی قبیلے دو گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں، ایک وہ جن میں شادی کرنا منع ہے (exogamous) اور دوسرے وہ جن میں اس کی اجازت ہے (endogamous) ۔ اور اس طرح خوب گڑبڑ پیدا کرنے کے بعد وہ اس چھان بین میں لگ گئے کہ ان کے مہمل گروہوں میں سے کون سا گروہ زیادہ پرانا ہے ۔ گن کی دریافت کے ساتھ یہ بے وقوفی کی باتیں آپ ہی آپ ختم ہو گئیں ۔ گن خون کے رشتوں کی بنیاد پر بنتے تھے اور اس کے رکن آپس میں شادی نہیں کر سکتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ ایروکواس لوگ ارتقا کی جس منزل پر تھے، اس میں گن کے اندر شادی کی ممانعت کے اس قاعدہ پر سختی کے ساتھ عمل ہوتا تھا ۔

(٤) مرنے والے کی جائداد گن کے باقی لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی کیونکہ اس جائداد کو گن کے اندر ھی رھنا تھا۔ چونکہ کوئی ایروکواس شخص مرنے پر بہت زیادہ ترکہ نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لئے وہ گن کے اندر بہت ھی قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ جب کوئی مرد مرتا تو اس کی جائداد اس کے سگے بھائی بہنوں میں اور اس کے ماموں میں بانٹ دی جاتی۔ اور جب کوئی عورت مرتی تو اس کے اپنے بچوں اور اپنی بہنوں میں۔ مگر اس کے بھائیوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ یہی وجہ ھے کہ میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کا ترکہ نہیں ملتا تھا اور نہ بچوں کو باپ کی وراثت ملتی تھی۔

(٥) گن کے ممبروں کا فرض ھوتا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد اور حفاظت کریں اور خاص کر اگر باھر کا کوئی آدمی گن کے کسی ممبر کو نقصان پہونچا گیا ھو تو اس کا بدلہ لینے میں عملی مدد کریں۔ فرد اپنی حفاظت کے لئے گن کی مدد پر بھروسہ کر سکتا تھا اور کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے تکلیف پہونچاتا تو گویا وہ سارے گن کو تکلیف پہونچاتا تھا۔ اسی سے، یعنی گن کے خون کے رشتے سے، خونی انتقام لینے کا رواج پیدا ھوٗا اور اسے فرض قرار دیا گیا۔ ایروکواس لوگ اس فرض کو غیر مشروط طریقے پر مانتے تھے۔ اگر گن کے باھر کے کسی آدمی نے گن کے کسی آدمی کو قتل کر دیا تو مقتول کے گن سے تعلق رکھنے والے پر اس خون کا بدلہ لینا ضروری تھا۔ پہلے

تصفیہ کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قاتل کے گن کی کاؤنسل بلائی جاتی اور مقتول کے گن کی کاؤنسل کے پاس معاملہ کا تصفیہ کر لینے کے لئے تجویزیں بھیجی جاتیں۔ اس کا طریقہ زیادہ‌تر یہ ہوتا تھا کہ کاؤنسل اپنی طرف سے معذرت کرتی اور خون بہا کے طور پر بیش قیمت تحفے بھیجتی۔ اگر ان کو قبول کر لیا جاتا تو بات رفت گذشت ہو جاتی۔ اور اگر نہیں تو مقتول کا گن بدلہ لینے کے لئے ایک یا متعدد آدمیوں کو تعینات کرتا تھا۔ ان کا کام قاتل کا پیچھا کر کے اس کو قتل کر دینا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو قاتل کے گن کو شکایت کا کوئی حق نہیں تھا اور سمجھا جاتا کہ بدلہ پورا ہو گیا۔

(٦) گن کے اپنے مخصوص نام یا ناموں کا سلسلہ ہوتا تھا جسے سارے قبیلہ میں صرف وہی گن استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ کسی شخص کے نام سے ہی یہ پتہ لگ سکتا تھا کہ وہ کس گن کا آدمی ہے۔ جو شخص گن کا نام استعمال کرتا، اسے گن کے حقوق بھی حاصل ہوتے تھے۔

(٧) گن اجنبی آدمیوں کو بھی اپنا ممبر بنا سکتا تھا۔ اور ایسا ہونے کے بعد وہ شخص پورے قبیلہ کا ممبر سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے قیدیوں میں سے جن لوگوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا، وہ کسی گن میں شریک کر لئے جاتے تھے اور اس طرح پورے سینیکا قبیلہ کے رکن بن جاتے تھے، اور پھر انہیں قبیلے اور گن کے سارے اختیارات حاصل ہو جاتے تھے۔ اجنبیوں کو گن کے انفرادی ممبروں کی درخواست

پر ہی ممبر بنایا جاتا تھا۔ مرد کہتے کہ فلاں اجنبی کو میرا بھائی یا بہن مان لیا جائے۔ اور عورتیں کہتیں کہ اسے میری اولاد مان لیا جائے۔ منظوری کے لئے ضروری تھا کہ گن کے اندر شامل کرنے کی رسم باقاعدہ طریقے سے انجام دی جائے۔ جن گنوں میں آدمیوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم ہو جاتی تھی وہ اکثر دوسرے گنوں سے اجازت لے کر بہت سے لوگوں کو اپنے گن میں شامل کر لیتے تھے۔ ایروکواس لوگوں میں گن میں شامل کرنے کی رسم قبیلے کی کاؤنسل کے ایک عام جلسہ میں انجام دی جاتی تھی اور اس کی حیثیت ایک مذہبی رسم کی ہو گئی تھی۔

(۸) انڈین گنوں میں مخصوص مذہبی رسموں کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے۔ اور پھر بھی اس میں شک نہیں کہ انڈینوں کی مذہبی رسمیں کم و بیش گنوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایروکواس لوگوں میں سال میں چھہ مذہبی تقریبیں ہوتی تھیں جن میں الگ الگ گنوں کے ساشم اور جنگی سالار جو اپنے عہدے کی بدولت «محافظ دین» بھی سمجھے جاتے تھے، پروھتوں اور پجاریوں کا کام کرتے تھے۔

(۹) ہر گن کا ایک قبرستان ہوتا تھا۔ ریاست نیویارک کے ایروکواس لوگ اب چاروں طرف سے گورے لوگوں سے گھر گئے ہیں، اس لئے ان کا قبرستان باقی نہیں رہا، لیکن پہلے تھا۔ دوسرے انڈین قبیلوں کے اب بھی خود اپنے قبرستان ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹسکارورواس قبیلے کا، جس کو ایروکواس لوگوں سے قریبی تعلق ہے، اپنا قبرستان

ہے۔ اگرچہ یہ لوگ عیسائی ہیں پھر بھی ان کے قبرستان
میں ہر گن کے لئیے قبروں کی ایک علیحدہ قطار ہوتی ہے۔
ماں اور اس کے بچے ایک ہی قطار میں دفن کئے جاتے ہیں
لیکن باپ کو اس قطار میں جگہ نہیں دی جاتی۔ ایروکواس
لوگوں میں تجہیز و تکفین کے وقت سبھی آدمی ماتم کرتے
ہیں، قبر تیار کرتے ہیں، جنازے پر تقریر کرتے ہیں،
وغیرہ وغیرہ۔

(۱۰) گن کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی۔ یہ ایک جمہوری
مجلس تھی جس میں گن کے تمام بالغ مرد اور عورتیں شامل
ہوتی تھیں اور سب کی آواز برابر ہوتی تھی۔ یہی کاؤنسل
ساشم اور جنگی سالار چنتی یا انہیں برطرف کرتی تھی۔
اسی طرح وہی کاؤنسل اور باقی «محافظین مذہب» کو بھی
چنتی اور برطرف کرتی تھی۔ گن کے کسی ممبر کے مارے
جانے پر یہی کاؤنسل خون بہا (wergeld) لینے یا خون کا
بدلہ خون سے لینے کا فیصلہ کرتی۔ اسی میں اجنبیوں کو
گن کے اندر شامل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا
تھا۔ مختصر یہ کہ گن میں یہی کاؤنسل سارے اختیارات کی
مالک تھی۔

امریکی انڈینوں کے ایک عام گن کے حسب ذیل
اختیارات ہوتے تھے: «ایک انڈین گن کے سبھی رکن ذاتی
طور پر آزاد ہیں۔ اور ایک دوسرے کی آزادی کی حفاظت
کرنا ان کا فرض ہے۔ انفرادی حقوق اور اختیارات میں
سب ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ ساشم اور سالاروں کو

بھی کوئی فوقیت نہیں۔ یہ ایک ایسی برادری ہے جو قرابت داری کے دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔آزادی، مساوات اور بھائی‌چارے کے اصول کا کبھی باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا مگر گن کے یہی بنیادی اصول ہیں۔ گن ایک سماجی نظام کی اکائی ہے، گن وہ بنیاد ہے جس پر انڈین سماج کی تنظیم ہوئی تھی۔ آزادی اور خودداری کا احساس جو انڈینوں کے کردار کی عام خصوصیت ہے، اسی کا نتیجہ ہے۔»

جس وقت انڈینوں کا پتہ لگا، وہ سارے شمالی امریکہ میں ایسے گنوں میں منظم تھے جو مادری حق کے مطابق بنے تھے۔ ڈکوٹا جیسے محض چند ہی قبیلے ایسے تھے جن میں گن کا زوال شروع ہو چکا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے، جیسے اوجبوا اور اوماھا، جن کی تنظیم پدری حق کے مطابق کی گئی تھی۔

امریکی انڈینوں کے بہت سے قبیلے ایسے تھے جن میں پانچ یا چھ سے زیادہ گن تھے۔ ان میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تین چار یا اس سے بھی زیادہ گنوں کو ملاکر ایک مخصوص گروہ بنا دیا جاتا تھا۔ مارگن نے اس کے انڈین نام کا یونانی مرادف ڈھونڈکر فریٹری (برادری) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سینیکا قبیلہ میں اس طرح کی دو فریٹریاں تھیں۔ پہلی میں ایک سے چار نمبر تک کے گن شامل تھے اور دوسری میں پانچ سے آٹھ نمبر تک کے۔ زیادہ گہری چھان بین سے یہ پتہ لگا کہ یہ فریٹریاں اصل میں ان ابتدائی گنوں کی نمائندہ ہیں جن میں سب سے پہلے قبیلے کی تقسیم

ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک گن میں شادی کی ممانعت ہو جانے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ ہر قبیلہ میں کم سے کم دو گن ہوں تاکہ قبیلہ اپنے آزاد وجود کو قائم رکھ سکے۔ جیسے جیسے قبیلہ بڑھتا گیا، ہر گن مزید دو یا زیادہ گنوں میں تقسیم ہوتا گیا اور ہر ایک ان میں سے ایک علیحدہ گن بن گیا۔ اور جو ابتدائی گن تھا یعنی جس میں سبھی لڑکی والے گن شامل ہیں، فریٹری کی شکل میں زندہ رہا۔ سینیکا قبیلہ میں اور اکثر دوسرے انڈین قبیلوں میں ایک فریٹری کے گن آپس میں بھائی یا برادر گن ہیں اور دوسری برادری یا فریٹری کے گن ان کے رشتہ کے بھائی ہوتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یکجدی قرابت داری (سگوتر) کے امریکی نظام میں یہ القاب نہایت حقیقی اور ٹھوس اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں سینیکا قبیلہ کا کوئی آدمی ہرگز اپنی برادری (فریٹری) کے اندر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بہت دن ہوئے کہ یہ پابندی اٹھا دی گئی ہے اور اب یہ محض اپنے گن تک محدود ہے۔ سینیکا قبیلہ میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ «بھالو» اور «ہرن» نام کے دو گن شروع میں تھے۔ دوسرے گن ان ہی کی شاخیں ہیں جو بعد میں ان سے پھوٹیں۔ ایک بار جب اس ادارے نے جڑ پکڑ لی تو پھر حسب ضرورت اس میں تبدیلی بھی ہوئی۔ توازن قائم رکھنے کے لئے اکثر ایسا بھی ہؤا کہ کسی دوسری فریٹری کے پورے کے پورے گن ایسی فریٹری میں شامل کر دئے گئے جن کے گن ناپید ہو چکے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف قبیلوں کی برادریوں (فریٹریوں) میں ہم ایک ہی نام کے متعدد گنوں کو مختلف گروہوں میں منظم پاتے ہیں۔

ایروکواس لوگوں میں فریٹری (برادری) کے منصب کسی حد تک سماجی اور کسی حد تک مذہبی ہیں۔ (۱) فریٹریاں آپس میں گیند کھیلتی ہیں۔ ہر فریٹری اپنے بہترین کھلاڑیوں کو میدان میں اتارتی ہے۔ فریٹری کے باقی لوگ تماشا دیکھتے ہیں، جنہیں فریٹری کے مطابق الگ الگ صفوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے فریق کی جیت کے بارے میں شرط بدتے ہیں۔ (۲) قبیلے کی کاؤنسل میں ہر برادری کے ساشم اور جنگی سالار ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں۔ مختلف گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھتے ہیں اور تقریر کرنے والا ہر فریٹری کے نمائندوں کو ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے۔ (۳) اگر قبیلے میں کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اور قاتل اور مقتول ایک ہی فریٹری کے نہ ہوں تو مقتول کا گن اکثر اپنے برادر گنوں سے اپیل کرتا ہے۔ یہ گن مل کر فریٹری کی کاؤنسل بلاتے ہیں اور دوسری فریٹری سے بھی اپنی کاؤنسل بلانے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ اس معاملہ کا تصفیہ کیا جا سکے۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برادری یا فریٹری ہی شروع میں اصل گن تھی اور چونکہ وہ اپنی شاخوں یعنی الگ الگ گنوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اس لئے اس کی کامیابی کی امید بھی زیادہ ہوتی ہے۔ (٤) کسی فریٹری کے

کسی اہم آدمی کے مرنے پر دوسری فریٹری تجہیز و تکفین کا انتظام کرتی ھے اور مرنے والے کی فریٹری کے لوگ ماتم کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ چلتے ھیں۔ اگر کوئی ساشم مر جائے تو دوسری فریٹری کے لوگ ایروکواس لوگوں کی وفاقی کاؤنسل میں اطلاع دیتے ھیں کہ اس کی جگہ خالی ہو گئی۔ (۵) ساشم کے انتخاب کے وقت فریٹری کی کاؤنسل پھر سامنے آتی ھے۔ برادر گنوں کی منظوری کی حیثیت محض رسمی ھے لیکن دوسری فریٹری کے گن مخالفت کر سکتے ھیں۔ ایسی صورت میں اس فریٹری کی کاؤنسل بیٹھتی ھے اور اگر وہ بھی مخالفت کرنے والوں کا ساتھ دیتی ھے تو انتخاب کو مسترد کر دیا جاتا ھے۔ (٦) پہلے ایروکواس لوگوں میں خاص قسم کی پراسرار مذھبی رسمیں ہوتی تھیں جنھیں گورے لوگ medicine—lodges (جادو ٹونا) کہتے تھے۔ سینیکا قبیلہ میں یہ رسمیں دو مذھبی گروہ ادا کرتے تھے۔ ھر گروہ ایک برادری کے لئے تھا۔ نئے ممبروں کو شامل کرنے کے لئے باقاعدہ مذھبی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ (۷) اگر، جیسا کہ تقریباً یقینی معلوم ہوتا ھے، فتح امریکہ کے وقت تلس کلا کے چار حصوں (مربعوں) پر جو چار یکجدی گروہ (linages) قابض تھے وہ چار برادریاں تھیں، تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ یونانیوں کی برادریوں اور جرمنوں کے اسی قسم کے یکجدی گروھوں (سگوتروں) کی مانند یہ فریٹریاں (برادریاں) بھی فوجی اکائی کا کام دیتی تھیں۔ ان چاروں میں سے ھر یکجدی (سگوتر) گروہ لڑائی

میں حصہ لیتا تھا۔ اس کی اپنی الگ سپاہ، الگ وردی اور جھنڈا اور الگ اپنا سالار ہوتا تھا۔

جس طرح کئی گنوں سے مل کر ایک فریٹری (برادری) بنتی تھی اسی طرح، اپنی کلاسیکی (قدیم) شکل میں، کئی برادریوں سے مل کر ایک قبیلہ بنتا تھا۔ اکثر بہت سے قبیلوں میں جو کمزور ہو گئے ہیں، یہ بیچ کی کڑی یعنی برادری ختم ہو گئی ہے۔ امریکہ میں انڈین قبیلوں کی نمایاں خصوصیتیں کیا ہیں؟

(۱) ہر قبیلہ کا اپنا علاقہ اور اپنا نام ہوتا تھا۔ اس زمین کے علاوہ جہاں پر بستی ہوتی تھی ہر قبیلہ کے پاس ایک بڑا علاقہ شکار کھیلنے اور مچھلی پکڑنے کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت دور تک ایسی زمین تھی جو کسی قبیلہ کی نہیں تھی اور جس کے بعد سے دوسرے قبیلہ کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ جہاں دو قبیلے ایک دوسرے سے ملتی جلتی زبان بولتے تھے، وہاں بیچ کا یہ غیرمقبوضہ علاقہ نسبتاً مختصر ہوتا تھا اور جہاں ان کی بولیوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا وہاں وہ علاقہ زیادہ بڑا ہوتا تھا۔ ایسے ہی غیرمقبوضہ علاقوں میں جرمنوں کے سرحدی جنگل تھے، وہ بنجر زمین تھی جسے سیزر کے سوئےویوں نے اپنے علاقہ کے چاروں طرف بنا رکھا تھا، ڈنمارک کے باشندوں اور جرمنوں کے درمیان کا ایزارن‌ہولٹ «isarnholt» (ڈینش زبان میں jarnved, limes Danicus تھا)، جرمنوں اور سلاف لوگوں کے درمیان کے سیکسن جنگل اور «برانیبور» تھے (جس کے معنی

سلاف زبانوں میں «حفاظتی جنگل» کے ہیں) — جس سے شہر برانڈنبرگ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سب ایسے ہی غیرمقبوضہ علاقے تھے۔ ان غیرواضح سرحدوں کے بیچ میں جو علاقہ پڑتا تھا وہ قبیلے کی مشترک ملکیت تھی۔ پڑوس کے قبیلے والے بھی اسے تسلیم کرتے تھے، اور اگر دوسرے لوگ اس میں گھسنے کی کوشش کرتے تو قبیلہ اس علاقہ کی حفاظت کرتا اور انہیں آنے سے روکتا۔ سرحد کے غیرواضح ہونے کی وجہ سے عملی دشواریاں زیادہ‌تر اسی وقت پیدا ہوئیں جب آبادی بہت بڑھ گئی۔ قبیلے کا نام بہ ظاہر بہت سوچ سمجھ کر نہیں رکھا جاتا تھا۔ اکثر ان کا نام محض کسی اتفاق کی وجہ سے پڑ جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہؤا کہ کچھ دنوں کے بعد پڑوس کے قبیلے والے کسی قبیلہ کو اس کے اپنے نام سے نہیں بلکہ کسی اور نام سے پکارنے لگے۔ جرمنوں (die Deutschen) کے ساتھ بھی یہی ہؤا۔ تاریخی طور پر ان کا پہلا جامع نام — جرمانی (Germanen) — انہیں کیلٹوں نے دیا تھا۔

(۲) ہر قبیلہ کی اپنی ایک خاص بولی ہوتی تھی۔ اصل میں قبیلہ اور بولی دونوں کا دائرہ ایک ہوتا تھا۔ تقسیم در تقسیم سے نئے قبیلوں اور بولیوں کی نشو و نما امریکہ میں ابھی حال تک جاری تھی، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا سلسلہ اب بند ہو گیا۔ جہاں دو کمزور قبیلے مل‌کر ایک ہو گئے ہیں وہاں مستثنی صورتوں میں ایسا بھی ہؤا ہے کہ ایک ہی قبیلہ کے اندر دو بہت ملتی جلتی

بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ایک امریکی قبیلے میں اوسطاً دو ہزار آدمی ہوتے ہیں۔ لیکن چیروکی قبیلے میں چھبیس ہزار آدمی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک بولی بولنے والے انڈینوں کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔

(۳) گنوں کے منتخب کئے ہوئے ساشم اور جنگی سالاروں کو ان کے عہدے پر بٹھانے کا حق قبیلہ کو تھا۔

(٤) قبیلہ کو اختیار تھا کہ چاہے تو گن کی رائے کے خلاف بھی ان دونوں عہدہ‌داروں کو برخواست کر دے۔ چونکہ یہ ساشم اور جنگی سالار قبیلہ کی کاؤنسل کے ممبر ہوتے ہیں اس لئے ان کے سلسلہ میں قبیلہ کے ان اختیارات کی تشریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہاں کہیں متعدد قبیلوں کا وفاق قائم ہوا تھا اور ایک وفاقی کاؤنسل میں سبھی قبیلوں کی نمائندگی ہوتی تھی وہاں مذکورۂ بالا اختیارات اس ادارے کے ہاتھہ میں سونپ دئے جاتے تھے۔

(۵) قبیلہ کے مذہبی خیالات (دیومالا) اور عبادت کی رسمیں ایک سی ہوتی تھیں۔ «بربری لوگوں کے مخصوص انداز کے مطابق امریکہ کے انڈین ایک مذہبی قوم تھے۔» ابھی تک تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کی دیومالا کی جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مذہبی عقائد کو شخصی صورت دے دی تھی — وہ طرح طرح کے بھوت پریت کو مانتے تھے۔ لیکن وہ بربریت کے جس ابتدائی دور میں تھے، اس میں ابھی تک ان ارواح کو مٹی یا پتھر کے سانچوں میں نہیں ڈھالا گیا تھا یعنی بت اور مورتیں نہیں

بنائی گئی تھیں۔ فطرت اور اس کے عناصر کی یہ پرستش رفتہ رفتہ بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ ہر قبیلے کے اپنے اپنے تیوہار اور عبادت کی مخصوص صورتیں تھیں، جس میں ناچ اور کھیل ہوتے تھے۔ ناچ سبھی مذہبی تقریبوں کا لازمی جزو تھا اور ہر قبیلے کے لوگ علیحدہ علیحدہ اپنی تقریبیں مناتے تھے۔

(٦) مشترک معاملات کے لئے قبیلہ کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی۔ اس میں مختلف گنوں کے سبھی ساشم اور جنگی سالار ہوتے تھے۔ یہ ان گنوں کے سچے نمائندے تھے کیونکہ انہیں ہر وقت برخاست کیا جا سکتا تھا۔ کاؤنسل کا کھلا اجلاس ہوتا تھا جس کے چاروں طرف قبیلے کے دوسرے لوگ کھڑے ہوتے تھے جنہیں بحث میں حصہ لینے اور رائے دینے کا حق ہوتا تھا۔ لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار صرف کاؤنسل کو تھا۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ ہر شخص جو وہاں پر موجود ہوتا کاؤنسل کو اپنی بات سنا سکتا تھا۔ عورتیں بھی کسی اپنی پسند کے ترجمان کے ذریعہ سے اپنی رائے ظاہر کر سکتی تھیں۔ ایروکواس لوگوں میں آخری فیصلہ صرف اتفاق رائے سے ہو سکتا تھا۔ جرمن مارک کمیونٹی (برادریوں) کے زیادہ‌تر فیصلوں میں بھی یہی صورت تھی۔ دوسرے قبیلوں کے ساتھہ اپنے تعلقات متعین کرنے کا کام خاص طور پر قبیلہ کی کاؤنسل کا تھا۔ دوسرے قبیلوں کے سفیر اس کے سامنے حاضر ہوتے اور وہی دوسرے قبیلوں میں اپنے ایلچی بھیجتی۔ وہی کاؤنسل جنگ اور

امن کا فیصلہ کرتی۔ جنگ چھڑنے پر وہی لوگ لڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے جو خود اپنی رضامندی سے آگے آتے تھے۔ اصولاً ایک قبیلہ کی ان تمام قبیلوں سے جنگ تھی جن کے ساتھہ باقاعدہ امن کا معاہدہ نہیں تھا۔ ایسے دشمنوں کے خلاف فوجی مہم کی تیاری زیادہ‌تر چند ایک ممتاز ساونت کرتے تھے۔ وہ ایک جنگی رقص کا انتظام کرتے اور جو کوئی اس ناچ میں شامل ہوتا وہ گویا اس مہم میں شریک ہونے کا اعلان کر دیتا تھا۔ ان لوگوں کو لےکر اسی وقت ایک دستہ بنا لیا جاتا اور وہ فوراً کوچ کر جاتا۔ جب قبیلہ کے علاقے پر دوسرے لوگ حملہ کرتے تو اس کی حفاظت کا کام بھی اسی طرح رضاکاروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ رضاکاروں کے ان دستوں کی روانگی اور واپسی کے موقع پر بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جاتا۔ ان مہموں کے لئے قبیلہ کی کاؤنسل کی منظوری ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ منظوری نہ تو مانگی جاتی تھی اور نہ دی جاتی تھی۔ ان مہموں کا وہی حال تھا جو جرمن پابند خدمت سپاہیوں کی نجی جنگی مہموں کا تھا جس کی تفصیل ٹیسی‌ٹس نے بیان کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جرمنوں میں پابند خدمت سپاہیوں کی حیثیت کم و بیش مستقل سپاہیوں کی سی تھی۔ امن کے زمانہ میں بھی ان کا ایک چھوٹا سا مضبوط دستہ ہوتا تھا جس میں جنگ کے زمانہ میں اور رضاکار بھی شامل ہو جاتے تھے۔ ان فوجی دستوں میں بہت لوگ نہیں ہوتے تھے۔ امریکی انڈینوں کی نہایت اہم مہموں میں بھی،

جن میں انہیں لڑنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا، بہت کم لوگ جاتے تھے۔ جب کسی بڑی لڑائی کے لئے ایسے متعدد دستے ایک جگہ جمع ہوتے تو ہر دستہ صرف اپنے ہی سالار کا حکم مانتا تھا۔ جنگ کے داؤپیچ سالاروں کی کاؤنسل مل‌کر تیار کرتی تھی تاکہ پوری جنگ ایک ہی داؤپیچ کے مطابق لڑی جائے۔ چوتھی صدی میں اپر رھائن کے ایلامنی لوگوں نے بھی جنگ کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا جس کا حال امیانس مارسیلینس نے بیان کیا ہے۔

(۷) بعض قبیلوں میں ایک بڑا سردار (Oberhäuptling) ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ وہ بھی ایک ساشم تھا جسے ایسے موقعوں پر جبکہ فوری قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے، عارضی فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ لیکن یہ فیصلے اسی وقت تک کے لئے ہوتے تھے جب تک کہ کاؤنسل اپنے اجلاس میں کوئی آخری فیصلہ نہ کر لیتی۔ یہ ایک ایسا عہدہ‌دار مقرر کرنے کی کوشش تھی جو فیصلوں پر عمل کرا سکے۔ لیکن یہ نہایت کمزور کوشش تھی جس کا مقصد پوری طرح واضح نہیں تھا۔ اور جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دراصل جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اگر سبھی جگہ نہیں تو زیادہ‌تر جگھوں میں سب سے بڑا فوجی سالار (oberster Heerführer) ہی ترقی کر کے ایسا عہدہ‌دار بن گیا۔

امریکہ کے انڈینوں کی بہت بڑی اکثریت کبھی بھی قبائلی اتحاد کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہ چھوٹے

چھوٹے قبیلے تھے جن میں بہت کم لوگ ہوتے تھے، جن میں آپس میں بڑے بڑے غیرمقبوضہ سرحدی علاقوں کی وجہ سے بہت فاصلہ ہوتا تھا اور جو ہمیشہ کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ اور یہ تھوڑے سے آدمی ایک بہت بڑے علاقہ میں بکھرے ہوئے تھے۔ عارضی مصلحتوں کی بنیاد پر قرابت دار قبیلوں میں کہیں کہیں اتحاد قائم ہوتا تھا تو وقتی خطرے کے گذر جانے کے بعد وہ ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن بعض علاقوں میں ایسے قبیلے جو شروع میں قرابت دار تھے مگر آگے چل کر غیرمتحد ہو گئے تھے، پھر پائدار وفاقوں کی صورت میں متحد ہوئے اور اس طرح انہوں نے قوموں کی تشکیل کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ ریاست‌ہائے متحدہ امریکہ میں ہمیں اس وفاق کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ایروکواس لوگوں میں ملتی ہے۔ ان کا ابتدائی وطن مسی‌سپی کے مغرب میں تھا جہاں غالباً وہ عظیم ڈکوٹا نامی نسل کا حصہ تھے۔ وہاں سے نکل‌کر وہ بہت دنوں تک گھومتے پھرتے رہے اور پھر اس علاقہ میں آ بسے جو آج کل نیویارک‌کی ریاست ہے۔ وہ پانچ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے—سینیکا، کایوگا، اوننڈگا، اونیڈا اور موھاوک۔ وہ مچھلی، شکار کئے ہوئے جانور اور بہت ہی بھدی قسم کی باغبانی کی پیداوار پر گذارہ کرتے تھے۔ وہ ایسے گاؤں میں رہتے تھے جو زیادہ‌تر باڑوں سے گھرے ہوتے تھے۔ ان کی تعداد کبھی بھی بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ان میں متعدد گن تھے جو

پانچوں قبیلوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں بولتے تھے جو ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ وہ ایک ہی سلسلے کے قطعۂ زمین پر رہتے تھے جو پانچوں قبیلوں میں بٹا ہؤا تھا۔ چونکہ اس علاقہ پر انہوں نے ابھی حال میں ہی قبضہ کیا تھا اس لئے قدرتی بات تھی کہ جن لوگوں کو انہوں نے اس جگہ سے ہٹایا تھا ان کے مقابلہ میں آپس میں ان پانچوں قبیلوں میں اتحاد تھا۔ حد سے حد پندرھویں صدی کی ابتدا میں یہ چیز بڑھ‌کر ایک «مستقل اتحاد» یا وفاق کی صورت اختیار کر چکی تھی، جسے اپنی اس طاقت کا اتنا گھمنڈ ہؤا کہ اس نے فوراً ہی دوسروں پر چڑھائی شروع کر دی اور اپنی طاقت کے انتہائی عروج کے زمانہ میں یعنی ۱۶۷۵ء کے لگ بھگ اس نے آس‌پاس کے بہت بڑے علاقہ کو فتح کر لیا اور وہاں کے باشندوں میں کچھ کو نکال باہر کیا اور کچھ کو خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ ان انڈینوں میں جو بربریت کے ابتدائی دور سے آگے نہیں بڑھے تھے (جن میں میکسیکو، جدید میکسیکو اور پیرو کے باشندوں کے علاوہ باقی سب شامل تھے) ایروکواس لوگوں کی وفاقی تنظیم سب سے زیادہ ترقی یافتہ سماجی تنظیم تھی۔ اس وفاق کی بنیادی خصوصیتیں یہ تھیں:

(۱) مکمل برابری اور قبیلے کے تمام اندرونی معاملوں میں پوری آزادی کی بنیاد پر پانچ یکجدی قبیلوں میں مستقل اتحاد قائم تھا۔ وفاق کی اصل بنیاد یہی خون کا رشتہ

تھا۔ ان پانچ قبیلوں میں تین پسری قبیلے کہلاتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے اور باقی دو پسری قبیلے تھے۔ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ تین گن سب سے پرانے تھے اور وہ پانچوں قبیلوں میں موجود تھے اور دوسرے تین بھی تین قبیلوں میں تھے۔ ان گنوں میں سے ہر ایک کے ممبر پانچوں قبیلوں میں بھائی بھائی سمجھے جاتے تھے۔ بولی ٹھولی کے فرق کے باوجود زبان کی وحدت اس بات کا اظہار اور ثبوت تھی کہ پانچوں قبیلے ایک ہی نسل سے ہیں۔

(۲) وفاق کا انتظامی ادارہ ایک کاؤنسل تھی جس میں پچاس ساشم تھے جن میں ہر ایک کا درجہ اور اعزاز یکساں تھا۔ وفاق سے تعلق رکھنے والی سبھی باتوں پر یہی کاؤنسل فیصلہ کیا کرتی تھی۔

(۳) جب وفاق قائم کیا گیا تو یہ پچاس ساشم نئے عہدہ دار کی حیثیت سے مختلف قبیلوں اور گنوں میں بھیج دئیے گئے تھے۔ یہ نیا عہدہ خاص طور پر وفاق کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جب کبھی کسی ساشم کی جگہ خالی ہوتی تو جس گن سے اس کا تعلق ہوتا، وہ نیا ساشم چن لیتا اور جب چاہتا وہ اسے ہٹا دیتا۔ لیکن ساشم کو عہدے پر بٹھانا وفاقی کاؤنسل کا کام تھا۔

(٤) یہ وفاقی ساشم اپنے اپنے قبیلے کے بھی ساشم ہؤا کرتے تھے اور ان کو قبیلے کی کاؤنسل میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق تھا۔

(۵) وفاقی کاؤنسل کے سبھی فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے تھے۔

(٦) قبیلہ وار ووٹ دیا جاتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے لئے جسکی پابندی سب پر لازم ہو، ہر قبیلہ اور اس قبیلہ کے تمام کاؤنسل ممبروں کی منظوری ضروری تھی۔

(۷) پانچوں قبائلی کاؤنسلوں میں سے کوئی بھی اس وفاقی کاؤنسل کا اجلاس بلا سکتی تھی۔ لیکن وفاقی کاؤنسل آپ اپنا اجلاس نہیں منعقد کر سکتی تھی۔

(۸) وفاقی کاؤنسل کے جلسے عام لوگوں کے سامنے ہوتے تھے۔ ایروکواس لوگوں کے کسی بھی قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی آدمی اپنی رائے دے سکتا تھا، لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار صرف کاؤنسل کو تھا۔

(۹) وفاق کا کوئی باقاعدہ سردار یا انتظامی عہدہ‌دار نہیں تھا۔

(۱۰) لیکن اس کے دو اعلی جنگی سردار ہؤا کرتے تھے جن کے اختیار اور درجے برابر ہوتے تھے۔ (اسپارٹا میں اسی طرح دو «بادشاہ» اور روم میں دو مشیر یا کونسل ہوتے تھے۔)

یہ تھا وہ تمام سماجی دستور جس کے تحت ایروکواس لوگ چار سو برس سے زیادہ عرصہ تک زندگی بسر کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق مارگن کا بیان کافی تفصیل سے نقل کیا ہے کیونکہ اس سے ہم

ایک ایسے سماج کی تنظیم کا مطالعہ کر سکتے ھیں جس
میں اس وقت تک ریاست کا وجود نہیں تھا ۔ ریاست کے
لئے ایک ایسے مخصوص اقتدارعامہ کی ضرورت ھے جو
بحیثیت مجموعی ان لوگوں سے علیحدہ ھو چکا ھو جو اس
کے تحت رھتے ھیں۔ اور ماؤرر نے سچی جبلی سمجھداری
کا ثبوت دیا جب اس نے یہ کہا کہ جرمن مارک کا دستور
دراصل ایک خالص سماجی چیز ھے جو ریاست سے بنیادی
طور پر مختلف ھے اگرچہ آگے چل کر وہ بڑی حد تک
ریاست کی بنیاد کا کام دیتا ھے۔ چنانچہ ماؤرر نے اپنی
تمام تصنیفات میں اس بات کی چھان بین کی ھے کہ مارکوں،
گاؤں، بستیوں اور شہروں کے ابتدائی دستوروں سے باھر
اور ان کے ساتھہ ساتھہ اقتدار عامہ کی تدریجی نشو و نما
کیوں کر ھوئی۔ شمالی امریکہ کے انڈینوں کو دیکھنے سے
یہ بات معلوم ھوتی ھے کہ ایک ایسا قبیلہ جو ابتدا میں
متحد تھا کیوں کر ایک وسیع براعظم میں پھیل گیا، کیوں کر
ایک ایک قبیلہ تقسیم ھوتے ھوتے، کئی قبیلوں کا گروہ،
اور ایک پوری جاتی بن گیا ۔ کس طرح زبانیں تبدیل ھوتی
رھیں حتی کہ نہ صرف آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنا
ناممکن ھو گیا بلکہ ابتدائی وحدت کے تقریباً سارے آثار
مٹ گئے اور کس طرح قبیلہ کے اندر ایک ایک گن ٹوٹ کر
متعدد گنوں میں بٹ گیا ۔ کس طرح پرانے مادری گن
آج بھی فریٹری کی شکل میں قائم ھیں، اور ان قدیم‌ترین
گنوں کے نام آج بھی دور دور تک بکھرے ھوئے قبیلوں

میں ملتے ہیں، جن کو ایک دوسرے سے الگ ہوئے عرصہ گذر گیا۔ آج بھی زیادہ‌تر انڈین قبیلوں میں گنوں کے لئے بھیڑئیے اور بھالو کا نام استعمال ہوتا ہے۔ اوپر جس دستور کا ذکر کیا گیا وہ عام طور پر ان سبھی قبیلوں میں پایا جاتا ہے سوائے اس کے کہ بہت سے قبیلے ابھی تک قرابت دار قبیلوں کے وفاق کی منزل تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ گن ایک سماجی اکائی بن گیا تو پھر اس کے بعد گن، برادری (فریٹری) اور قبیلے کا پورا نظام ناگزیر طور پر — اس لئے کہ قدرتی طور پر — اس اکائی سے نشو و نما پانے لگا۔ یہ تینوں مختلف درجے کے یک‌جدی (سگوتر) رشتہ داروں کے گروہ ہیں۔ ہر گروہ بذات خود مکمل ہے اور خود اپنے معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ لیکن ہر گروہ سے باقی دونوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ جن معاملات کے سنبھالنے کی ذمہ داری ان پر ہوتی ہے وہ بربریت کے ابتدائی دور کے تمام پبلک معاملات ہیں۔ چنانچہ اگر کہیں ہم یہ دیکھیں کہ گن سماج کی اکائی ہے تو وہاں ہمیں امید کرنی چاہئے کہ قبیلہ کی مذکورۂ بالا تنظیم سے ملتی جلتی تنظیم بھی ہوگی۔ اور جہاں کہیں کافی مواد ملےگا جیسا کہ مثال کے طور پر یونانیوں اور رومنوں میں ملا ہے، وہاں ہمیں نہ صرف یہ کہ اس تنظیم کا پتہ ملےگا بلکہ ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا ہوگا کہ جہاں کہیں پورا مواد نہ ملے وہاں امریکی سماجی

دستور کے موازنہ سے ہم نہایت مشکل شبہات اور گتھیوں کو حل کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

اور یہ گن دستور اپنی طفلانہ سادگی میں ایک عجیب و غریب چیز ہے! ہر کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے جس کے لئے نہ پولس کے کسی سپاہی کی ضرورت ہے، نہ فوج کی۔ نہ وہاں بادشاہ اور امراء ہیں، نہ کوئی گورنر اور منصف وغیرہ۔ نہ وہاں مقدمے چلتے ہیں اور نہ کسی کو قید کی سزا دی جاتی ہے۔ سارے اختلاف اور جھگڑے وہ سب لوگ آپس میں مل کر لے لیتے ہیں جن کو اس سے تعلق ہوتا ہے، مثلاً گن یا قبیلہ یا متعدد گن آپس میں مل کر طے کرتے ہیں۔ خون کا بدلہ خون سے بالکل انتہائی صورتوں میں اور وہ بھی محض شاذ و نادر ہی لیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کی سزائے موت بھی تو اسی کی ایک مہذب صورت ہے جس میں تہذیب کی تمام خوبیاں اور خامیاں دونوں جمع ہو گئی ہیں۔ اگرچہ آج کے مقابلہ میں مشترک معاملات زیادہ ہیں ــــ مثلاً خانہ داری متعدد خاندانوں کے لوگ مل کر اور کمیونسٹی ڈھنگ سے چلاتے ہیں، زمین قبیلہ کی ملکیت ہوتی ہے اور صرف چھوٹے چھوٹے باغیچے عارضی طور پر الگ الگ گھرانوں کو دے دئے جاتے ہیں ــــ پھر بھی ہماری طرح نظم و نسق کی ایک وسیع اور پیچیدہ مشینری کا وہاں کوئی وجود نہیں۔ جن لوگوں کو کسی معاملہ سے تعلق ہوتا ہے وہ اس کو طے کر لیتے ہیں اور زیادہ‌تر تو حال یہ ہے

که صدیوں پرانے رسم و رواج نے پہلے ہی سب کچھ طے
کرکے رکھ دیا ہے۔ وہاں کوئی مفلس اور محتاج نہیں
ہو سکتا کیونکہ کمیونسٹی گھرانے اور گن ضعیفوں، مریضوں
اور جنگ کے اپاھجوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کا پورا
احساس رکھتے ہیں۔ سب آزاد اور برابر ہیں، اور اس
میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس وقت تک غلامی کا کہیں
کوئی گذر نہیں۔ غیرقبیلے والوں کو اس وقت تک غلام
بنانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ جب ایروکواس لوگوں
نے ۱۶۵۱ء کے آس پاس ایریز لوگوں اور «غیرجانب‌دار قوم»
کو فتح کیا تو ان کو انہوں نے برابری کی بنیاد پر اپنے
وفاق میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جب مفتوح لوگوں
نے اس سے انکار کر دیا تبھی ان کو اس علاقہ سے نکلنے
پر مجبور کیا گیا۔ اور ایسا سماج کس طرح کے مردوں
اور عورتوں کو جنم دیتا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے
لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گورے جو ایسے انڈینوں سے مل
سکے تھے جو ان کے اثر سے خراب نہیں ہو پائے تھے، وہ
سب ان کی خودداری اور وقار نفس، ان کی صاف‌گوئی، ان
کے کردار کی مضبوطی اور ان کی دلیری کے مداح تھے۔

ابھی حال ہی میں ہم نے افریقہ میں اس دلیری کی
مثالیں دیکھیں۔ چند سال پہلے زولو کافروں نے اور ان ہی
کی طرح دو ایک مہینے پہلے نوبین لوگوں نے—جن میں
دونوں قبیلوں میں گن کی تنظیم ابھی زندہ ہے—وہ کچھ

کر دکھایا جو کوئی بھی یورپین فوج نہیں کر سکتی تھی * ۔ ان کے پاس بندوقیں نہیں تھیں ۔ وہ محض نیزے اور برچھے لیے کر گولیوں کی بوچھار میں آگے بڑھتے رہے اور انگریزی سپاہ کی سنگینوں کی نوک تک بڑھتے چلے آئے اور اس قدر قریب آ کر انگریزوں کی پیدل سپاہ میں جو اپنی مضبوط صف‌بندی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے، انہوں نے بھگدڑ مچا دی اور کئی بار اسے مار بھگایا ۔ یہ سب اس کے باوجود ہؤا کہ دونوں کے ہتھیاروں میں بےانتہا فرق تھا اور زولو کافروں میں فوجی خدمت اور فوجی قواعد کا بالکل رواج نہیں تھا ۔ وہ بڑے پھرتیلے، مستعد اور جیوٹ ہوتے ہیں ۔ انگریزوں کو یہ شکایت تھی کہ ایک کافر چوبیس گھنٹے میں ایک گھوڑے سے زیادہ چلتا ہے اور زیادہ تیزی سے چلتا ہے ۔ ایک انگریز مصور کا کہنا ہے کہ «ان کے جسم کے چھوٹے سے چھوٹے عضلات بھی کوڑا بنانے کی بٹی ہوئی رسی کی طرح سخت اور ابھرے ہوئے ہیں ۔»

یہ تھا انسان اور انسانی سماج طبقاتی تقسیم سے پہلے ۔ اور اگر ہم ان کی حالت کا موازنہ آج کل کے متمدن لوگوں کی بڑی اکثریت سے کریں تو موجودہ زمانہ کے مزدوروں اور چھوٹے کسانوں میں اور قدیم زمانہ کے گن کے آزاد لوگوں میں ہمیں بڑا فرق دکھائی دے گا ۔

---

* یہ اشارہ انگریزوں اور زولو قبیلے کی لڑائی (۱۸۷۹ء) اور انگریزوں اور نوبین قبیلے کی لڑائی (۱۸۸۳ء) کی طرف ہے ۔ (اڈیٹر ۔)

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہئیے کہ وہ نظام مر رہا تھا۔ قبیلہ کی منزل سے آگے اس کی کوئی نشو و نما نہیں ہوئی۔ اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے قبیلوں کے وفاق نے ہی اس کے زوال کی گھنٹی بجا دی تھی۔ ایروکواس لوگوں نے دوسروں کو مطیع کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ جو کچھ قبیلے سے باہر تھا وہ قانون کے احاطے سے باہر تھا۔ جہاں علانیہ امن کا معاہدہ نہیں ہؤا وہاں قبیلے قبیلے میں جنگ تھی اور یہ جنگ ایسی بے رحمی سے لڑی جاتی تھی جو انسان کی خصوصیت تھی اور جس میں وہ تمام دوسرے حیوانوں سے بڑھا ہؤا تھا۔ اس بے رحمی میں کمی آگے چل کر محض ذاتی مفاد کی خاطر ہوئی۔ جیسا کہ ہم نے امریکہ میں دیکھا گن کا دستور جب اپنے عروج پر تھا تب بھی وہ پیداوار کی ایک نہایت غیرترقی یافتہ حالت پر مبنی تھا جس میں بہت تھوڑے سے لوگ ایک نہایت وسیع علاقہ میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس لئے انسان پر خارجی فطرت کا مکمل غلبہ تھا۔ فطرت انسان کے لئے اجنبی، مخالف اور ناقابل فہم چیز تھی۔ اس کے غلبہ کی جھلک انسان کے طفلانہ مذہبی تصورات میں ملتی ہے۔ انسان کی دنیا اس کا قبیلہ تھا۔ وہ خود اس کی ذات کے لئے بھی اور اس کی نظروں میں باہر والوں کے لئے بھی آخری سرحد تھی۔ قبیلہ، گن اور ان کے ادارے مقدس اور،

احترام کے قابل تھے گویا وہ کسی برتر قوت کے مالک تھے جسے فطرت نے کھڑا کر دیا تھا۔ اور فرد اپنے احساسات، خیالات اور اعمال میں بالکل اس کے تابع تھا۔ اس عہد کے لوگ ہمیں نہایت شاندار معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں آپس میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مارکس کے لفظوں میں وہ ابھی تک گویا اولین برادری کی ناف کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ ان اولین برادریوں کی طاقت کو توڑنا ضروری تھا، اور وہ توڑی بھی گئی۔ مگر اس کو ایسے اثرات نے توڑا جو ہمیں شروع ہی سے ذلیل اور پست معلوم ہوتے ہیں، جنھوں نے قدیم گن سماج کی سادگی اور اخلاقی عظمت کو برباد کر دیا۔ ادنی‌ترین مفاد کا خیال، ذلیل قسم کا لالچ، بے‌رحمانہ نفس پرستی اور عیاشی، کمینگی اور ہوس، مشترک ملکیت کی خود غرضانہ لوٹ، انہیں کے سائے میں نیا متمدن سماج، طبقاتی سماج، سامنے آتا ہے۔ چوری، عصمت دری، دھوکہ اور فریب یہی سب پرانے، بے‌طبقہ گن سماج کی جڑیں کھوکھلی کرتے اور اس کو تہس‌نہس کرتے ہیں۔ اور نئے سماج کی ڈھائی ہزار برس کی تاریخ کا کارنامہ اس کے سوا کچھہ نہیں کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت پر ظلم ڈھا کر اور اس کا خون پی کر ایک چھوٹی سی اقلیت نے اپنے لئے عیش و عشرت کے محل تعمیر کئے۔ اور آج حالت پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔

۴

یونانی گن

یونانی اور پلاسگین لوگوں کے درمیان اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں کے درمیان بھی، جو انہیں قبیلوں سے نکلے تھے، ماقبل تاریخی زمانہ ہی سے وہی تسلسل اور ترتیب ملتی ہے جیسے ہم امریکہ کے قدیم باشندوں میں دیکھ چکے ہیں — یعنی گن، فریٹری (برادری)، قبیلہ اور پھر قبیلوں کا وفاق، اسی سلسلہ سے ان کا سماج منظم تھا۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں، جیسے مثال کے طور پر ڈورین لوگوں میں، فریٹری نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قبیلوں کا وفاق ہر جگہ پوری طرح نمودار نہ ہؤا ہو۔ لیکن گن ہر جگہ سماج کی بنیادی اکائی تھی۔ یونانی جس وقت تاریخ کے افق پر نمودار ہوئے وہ تمدن کی دہلیز پر پہونچ چکے تھے۔ یونانیوں اور ان امریکی قبیلوں کے درمیان جن کا ذکر اوپر ہؤا ہے، نشو و نما کے دو بڑے دور پڑتے ہیں کیونکہ سورمائی عہد کے یونانی ایروکواس لوگوں سے دو دور آگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی گن پر وہ پرانے

دقیانوسی اثرات باقی نہیں رہے تھے جو ایروکواس لوگوں کے گن پر دکھائی دیتے تھے۔ گروہ‌وار شادی کے اثرات بہت دھندلے ہو چکے تھے۔ مادری حق کی جگہ پدری حق قائم ہو چکا تھا۔ اور اس طرح ذاتی دولت کے فروغ نے گن کے دستور میں پہلی بار رخنہ ڈال دیا تھا۔ پہلے کے بعد قدرتی طور پر دوسرا رخنہ بھی پڑا: پدری حق قائم ہو جانے کے بعد چونکہ ایک دولتمند لڑکی کا ترکہ اس کے شوہر کو ملےگا یعنی اس کے گن کے باہر چلا جائےگا اور اس طرح پورے گن قانون کی بنیاد ہی ٹوٹ جائےگی، اس لئے ایسی صورتوں میں لڑکیوں کو نہ صرف اس بات کی اجازت دی گئی بلکہ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ گن کے اندر ہی شادی کریں تاکہ گھر کی دولت گھر میں رہے۔

گروٹے کی «تاریخ یونان» کے مطابق ایتھنز کے گن کو ایک شیرازہ میں باندھنے والے عناصر یہ تھے: -

(۱) مشترک مذہبی رسمیں اور ایک خاص دیوتا کے اعزاز میں پجاریوں کے مخصوص حقوق اور اختیارات۔ یہ دیوتا گن کا قدیم مورث اعلی سمجھا جاتا تھا اور اس حیثیت سے اس کا ایک مخصوص لقب تھا۔

(۲) مشترک قبرستان۔ (موازنہ کے لئے دیکھئے: ڈیموستھینیز کی کتاب «یوبولائڈیز» ۔)

(۳) وراثت کے باہمی حقوق۔

(٤) کوئی اگر طاقت سے کام لے تو اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد، حفاظت اور حمایت کرنا هر ایک کا فرض تھا۔

(۵) بعض صورتوں میں خاص کر کوئی لڑکی جب یتیم هو جائے یا وراثت پانے والی هو تو اس کی شادی گن کے اندر کرانا سبھوں کا باھمی حق اور فرض تھا۔

(٦) ملکیت، کم سے کم کچھه صورتوں میں، مشترکه ھوتی تھی جس کا اپنا آرکون (مختارکل) اور اپنا خزانچی ھوتا تھا۔

فریٹری کئی گنوں کو ملاکر بنتی تھی۔ اس کے اندر مختلف حصوں میں اتنا گھرا تعلق نہیں تھا، پھر بھی وھاں ھمیں اسی طرح کے باھمی حقوق اور فرائض دکھائی دیتے ھیں۔ بعض مذھبی رسوم کو وہ ایک ساتھه ادا کرتے تھے۔ فریٹری کے کسی آدمی کے قتل هو جانے پر قانونی چارہ جوئی کا حق سب کو تھا۔ اس کے علاوہ ایک قبیله کی تمام فریٹریاں مقررہ عرصه پر بعض مشترک مذھبی رسوم کو ایک مجسٹریٹ کی صدارت میں انجام دیتی تھیں۔ اس مجسٹریٹ کو فائلوبیسیلئیس (قبائلی مجسٹریٹ) کہا جاتا تھا اور اسے امراء (یعنی یوپیٹریڈیز) میں سے چنا جاتا تھا۔

یه تو ھؤا گروٹے کا بیان۔ اس پر مارکس کہتا ھے که «یونانی گن میں کوئی بھی وحشی (مثال کے طور پر ایروکواس) بلا تامل لیا پہچان جائے گا»۔ جب ھم آگے کچھه اور

باتوں کا پتہ لگائیں گے تو اس کو پہچاننا اور بھی یقینی ہو جائیے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی گن کی کچھ اور بھی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۷) نسل پدری حق کے مطابق چلتی ہے۔

(۸) گن کے اندر وارثہ عورتوں کو چھوڑکر باقی لوگوں کی آپس میں شادی کی سخت ممانعت تھی۔ یہ مستثنی صورت اور اس کے بارے میں یہ باقاعدہ ہدایت یہ بتلا رہی ہے کہ پرانا قاعدہ قانون اس وقت تک جاری تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت بھی ہے: یہ ایک عام قاعدہ بن گیا تھا کہ جب کسی عورت کی شادی ہوتی تو وہ اپنے گن کے مذہبی رسوم کو ترک کر دیتی اور اپنے شوہر کے گن کے مذہبی رسوم اختیار کر لیتی۔ اسے شوہر کی فریٹری میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عام طور پر اپنے گن کے باہر شادی کرنے کا قاعدہ تھا۔ ڈیکیارکس کی ایک مشہور عبارت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بیکر نے «چاریکلیز» میں بھی یہی بات مانی ہے کہ کسی مرد یا عورت کو اپنے گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

(۹) گن میں باہر کے لوگوں کو اپنا لینے کا حق تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اس شخص کو کسی خاندان کے اندر اپنا لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے لئے ایک باقاعدہ

جلسۂ عام میں رسم ادائگی کرنی ضروری تھی۔ لیکن اس اختیار سے بہت کم کام لیا جاتا تھا۔

(۱۰) سرداروں کو منتخب اور معزول کرنے کا اختیار۔ ہم جانتے ہیں کہ گن کا اپنا ایک آرکون (مختار کل) ہوتا تھا۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ عہدہ بعض خاندانوں میں موروثی تھا۔ زیادہ ترین قیاس یہ ہے کہ بربریت کے آخر تک اس عہدے کو سختی کے ساتھہ موروثی نہیں بنایا گیا اور ان حالات میں جبکہ ہر گن کے اندر غریبوں اور امیروں کو بالکل مساوی حق حاصل تھا، ایسا کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

گروٹے ہی نہیں بلکہ نیبور، مومسن اور قدیم کلاسیکی عہد کے سب پہلے کے مورخ بھی گن کے مسلہ کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس کی بعض نمایاں خصوصیتوں کا پتہ لگا لیا تھا مگر گن کو وہ ہمیشہ خاندانوں کا ایک گروہ سمجھا کئیے، اور انہوں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی جس میں ان کے لئیے گن کی نوعیت اور اس کی ابتدا کو سمجھنا نا ممکن ہو گیا۔ گن کے دستور کے تحت خاندان کبھی بھی تنظیم کی اکائی نہیں رہا۔ اور یہ ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ شوہر اور بیوی لازمی طور پر دو مختلف گنوں میں ہوتے تھے۔ گن بحیثیت مجموعی فریٹری کے اندر تھے۔ اور فریٹری قبیلے کے اندر تھی۔ مگر جہاں تک خاندان کا تعلق ہے وہ آدھا شوہر کے گن میں اور آدھا بیوی کے گن میں بٹا ہوا تھا۔ ریاست بھی قانون عامہ میں

خاندان کو تسلیم نہیں کرتی اور آج تک اس کا وجود صرف دیوانی کے قانون میں تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم آج تک کی قلمبند تاریخ میں ایک نہایت مہمل بات فرض کر لی گئی اور اٹھارھویں صدی میں تو اس کے خلاف کچھ بولنا بھی جرم سمجھا جانے لگا تھا۔ اور وہ خیال یہ ہے کہ یک زوجگی کا انفرادی خاندان ہی وہ محور ہے جس کے گرد سماج اور ریاست نے رفتہ رفتہ تشکیل پائی ہے۔ حالانکہ یہ انفرادی خاندان تمدن کے عہد سے شاید ہی کچھ پرانا ہو۔

مارکس نے لکھا ہے کہ «مسٹر گروٹے یہ بات بھی دھیان میں رکھیں گے کہ اگرچہ یونانی لوگ اپنے گنوں کا ماخذ دیومالا میں بتلاتے تھے لیکن ان کے گن، ان کی دیومالا اور اس کے دیوی دیوتاؤں اور نیم دیوتاؤں سے زیادہ پرانے ہیں۔ اور آخرالذکر تو سب دراصل خود ان ہی لوگوں کی تخلیق ہیں۔»

مارگن نے گروٹے کی رائے کو ترجیح دی ہے اور ایک ممتاز اور غیرمشتبہ گواہ کی حیثیت سے اس کا حوالہ دیا ہے۔ گروٹے آگے چل کر بتاتا ہے کہ ایتھنز کے ہر گن کا نام اس کے کسی مشہور مورث اعلی سے ماخوذ ہوتا تھا۔ سولون کے زمانہ سے پہلے تو عام طور پر، اور اس کے بعد اس صورت میں جبکہ کوئی شخص بغیر وصیت کئے ہوئے مر جاتا تھا، تب اس کا ترکہ اس کے گن والوں (gennêtes) کو ملتا تھا۔ اگر کوئی شخص قتل ہو جاتا تو پہلے اس کے رشتہ داروں، پھر اس کے گن والوں اور آخر میں اس کی فریٹری کے لوگوں

کا حق اور فرض تھا کہ مجرم پر عدالتوں میں مقدمہ چلائیں۔ «ایتھنز کے قدیم‌ترین قوانین کے بارے میں ہم جو کچھ سنتے ہیں وہ گن اور فریٹری کی تقسیموں پر مبنی ہے۔»

گن کا ایک مشترک مورث اعلی کی نسل سے ہونا، ایک ایسی پہیلی اور گتھی ہے جس سے (بقول مارکس) «تعلیم یافتہ کم نظروں» کا دماغ چکرا گیا ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ مشترک مورث کی بات محض جھوٹ ہے — یہ کہنے کو تو وہ کہہ گئے، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکے کہ علیحدہ اور مختلف خاندانوں سے جن کو شروع میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا، گن کیسے بن گئے۔ لیکن یہ تو ان کو کسی نہ کسی طرح ثابت کرنا ہی تھا۔ ورنہ پھر وہ گن کی توجیہ کیا پیش کرتے! لہذا وہ چند الفاظ کے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں اور اس فقرے سے آگے نہیں جاتے کہ نسب نامہ تو یقیناً فرضی ہے لیکن گن ایک حقیقی چیز ہے۔ اور آخر میں گروٹے کہتا ہے — قوسین کے اندر کے فقرے مارکس کے ہیں — «سلسلۂ نسب کی بات ہمیں بہت کم سنائی دیتی ہے کیونکہ عوام کے سامنے اسے محض چند مخصوص ممتاز اور قابل احترام صورتوں کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ نامور گنوں کی طرح بالکل معمولی گنوں کی بھی اپنی مشترک رسمیں تھیں (کچھ عجیب سی بات ہے، مسٹر گروٹے!) اور مشترک مافوق‌الانسانی مورث اعلی اور سلسلۂ نسب تھا (بالکل معمولی گنوں کے درمیان کتنی عجیب و غریب بات ہے یہ، مسٹر گروٹے!) اسکیم اور اعیانی بنیاد (جناب والا، اعیانی

نہیں، سیدھی سادی جرمن زبان میں، (fleischlich) حیوانی بنیاد) سبھوں میں ایک ہی تھی۔»

اس پر مارگن کے جواب کا خلاصہ مارکس نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے: «یک جدی قرابت داری (سگوتر) کا نظام گن کی ابتدائی شکل کے لئے موزوں تھا ـــ دوسرے انسانوں کی طرح یونانیوں میں بھی اس کا وجود تھا ـــ اس نظام کی وجہ سے یہ علم محفوظ رہا کہ گن کے سب لوگوں میں آپس میں کیا رشتہ ہے۔ یہ ان کے لئے بڑی اہم بات تھی جس کو وہ اپنے ابتدائی بچپن کے زمانہ سے ہی سیکھ لیتے تھے۔ جیسے ہی یک زوجگی کا خاندان قائم ہوا یہ بات ختم ہو گئی۔ گن کے نام نے ہی ایک نسب نامہ تیار کر دیا تھا جس کے مقابلہ میں یک زوجگی کا خاندان بہت معمولی چیز معلوم ہوتی تھی۔ یہ نام جن لوگوں کے ساتھ لگا ہوتا تھا، ان کے مشترک سلسلۂ نسب کی گواہی دیتا تھا۔ لیکن گن کا نسب نامہ اتنی دور تک جاتا تھا کہ اس کے ممبروں کے لئے اب یہ ثابت کرنا ممکن نہیں تھا کہ ان میں آپس میں خون کا کیا رشتہ ہے۔ صرف وہی تھوڑے سے لوگ اپنا رشتہ ثابت کر سکتے تھے جن کے مشترک مورث نسبتاً حال کے زمانہ کے تھے۔ نام خود مشترک سلسلۂ نسب کا ثبوت تھا اور ان لوگوں کو چھوڑ کر جو باہر سے گن میں اپنا لئے گئے تھے، اور باقی لوگوں کے لئے وہ ایک قطعی اور پکا ثبوت تھا۔ گروٹے اور نیبور کے کہنے کا مطلب دراصل یہ ہے کہ گن کے لوگوں میں آپس میں یک جدی قرابت نہیں تھی۔ اس انکار کا نتیجہ

یہ ہوگا کہ گن محض ایک فرضی چیز، محض دماغ کے واہمہ کی پیداوار ہو کر رہ جائیے گا۔ اس طرح کا خیال محض «اعیان پرست» سائنس دانوں، یعنی حجرہ نشین کتابی کیڑوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ چونکہ نسلوں کی سلسلہ بندی، خاص کر یک زوجگی کے آغاز کے بعد سے، بہت دور کی چیز ہو گئی ہے اور ماضی کی حقیقت من گھڑت قصے کہانیوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، اس لئیے ان کم ظرفوں نے یہ نتیجہ نکالا اور اب بھی نکالتے ہیں کہ اس خیالی اور فرضی سلسلۂ نسب نے اصل میں گنوں کی تخلیق کی ہے۔»

امریکن انڈینوں کی طرح یہاں بھی فریٹری ایک مادری گن تھی جو کئی دختر گنوں میں بٹ گئی تھی اور ساتھہ ہی انہیں متحد بھی کرتی تھی اور اکثر ان سبھوں کا سلسلۂ نسب ایک ہی مشترک مورث اعلی سے ملاتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ گروٹے نے لکھا ہے «ہیکےٹیئس کی فریٹری کے سب ہم‌عصر ممبروں کا مشترک مورث اعلی سولہ پشت پہلے کا ایک دیوتا تھا۔» اس لئیے اس فریٹری کے سب گن آپس میں برادر گن تھے۔ ہومر نے اس وقت بھی فریٹری کو ایک فوجی اکائی بتایا ہے۔ اس کا تذکرہ ہومر کی اس مشہور عبارت میں ہے جہاں نسٹر، ایگامنون کو مشورہ دیتا ہے کہ «قبیلوں اور فریٹریوں کے حساب سے فوج کی صف‌بندی کرو تاکہ فریٹری فریٹری کی مدد کرے اور قبیلہ قبیلے کی»۔ فریٹری کا کوئی شخص اگر قتل کر دیا جائیے تو قاتل کو سزا دلوانا فریٹری کا حق بھی تھا اور اس کا فرض بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں فریٹری کا ایک کام خونی انتقام لینا بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس کی مشترک عبادت گاہیں اور مذہبی تہوار ہوتے تھے۔ آریوں کا پرانا روایتی دھرم فطرت کی پوجا کرنا تھا اور اس سے یونانیوں کی ساری دیومالا کا ارتقا دراصل گنوں اور فریٹریوں کی بدولت اور انہیں کے اندر ہوا۔ فریٹری کا ایک سردار بھی ہوتا تھا (جس کو فریٹریارکس کہتے تھے)۔ اور دی کولانژے کی رائے ہے کہ ہر فریٹری کی سبھائیں ہوتی تھیں جن کے فیصلوں پر عمل کرنا لازمی ہوتا تھا۔ ایک عدالت اور نظم و نسق کا محکمہ ہوتا تھا۔ بعد کے زمانہ میں ریاست نے بھی اگرچہ گن کو نظر انداز کر دیا تھا مگر کچھ سرکاری کام فریٹری کے لئے چھوڑ دئے تھے۔

متعدد قرابت دار فریٹریوں سے مل کر قبیلہ بنتا تھا۔ اٹیکا میں چار قبیلے تھے جن میں ہر ایک میں تین فریٹریاں تھیں اور ہر فریٹری میں تیس گن تھے۔ قبیلوں، فریٹریوں اور گنوں کی اس باقاعدہ اور مفصل تقسیم کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل تو خود بخود ہوئی تھی مگر بعد میں اس میں سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ دخل اندازی کی گئی تھی۔ یونانی تاریخ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ یہ بات کب، کیسے اور کیوں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود یونانیوں نے جس زمانہ تک کی یاد کو محفوظ رکھا ہے، وہ سورمائی عہد سے پیچھے نہیں جاتا۔

نسبتاً ایک چھوٹے سے علاقہ میں یونانیوں کی گنجان آبادی بسی ہوئی تھی۔ بولیوں کا اختلاف امریکہ کے وسیع جنگلوں میں جتنا بڑھ گیا تھا، اتنا یونانیوں میں نہیں ہؤا۔ تاہم یہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محض ایک ہی بولی بولنے والے قبیلے ایک بڑی شیرازہ بندی میں متحد ہوئے۔ اور چھوٹے سے اٹیکا کی بھی اپنی ایک خاص بولی تھی جو آگے چل کر یونانی نثر میں غالب زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔

ہومر کی رزمیہ نظموں میں ہم پاتے ہیں کہ یونانی قبیلے مل کر چھوٹی چھوٹی جاتیاں بن گئیں۔ لیکن ان جاتیوں کے دائرے کے اندر گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ وہ دیواروں سے گھرے ہوئے شہروں میں رہنے لگے تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ بڑھے، کھیت بنا کر کاشت کی جانے لگی اور دستکاری کی ابتدا ہوئی تو ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھی اور پھر دولت کا فرق بھی پیدا ہؤا جس کی وجہ سے جمہوریت کے اس قدیم نظام میں جس کی فطری طور پر نشو و نما ہوئی تھی امرا کا طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جاتیاں سب سے اچھی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے، اور لوٹ کے مال کی خاطر بھی، برابر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔

ان قبیلوں اور چھوٹی جاتیوں کا دستور یہ تھا:

(۱) مستقل اقتدار ایک کاؤنسل (boulê) کے ہاتھ میں تھا جس میں شروع میں غالباً گنوں کے سردار ہؤا کرتے تھے۔

لیکن جب آگے چل کر ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تو اس کاؤنسل کا انتخاب ہونے لگا۔ اس سے امراء کی ایک جماعت کو بڑھنے اور تقویت پانے کا موقع ملا۔ ڈایونی سیئس صاف لکھتا ھے کہ سورمائی عہد کی کاؤنسل امراء (kratistoi) پرمشتمل تھی۔ اہم سوالوں پر کاؤنسل کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔ ایسکیلس کے یہاں تھیبیز کی کاؤنسل نے ایک فیصلہ کیا جس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ ایٹیوکلیز کی تجہیز و تکفین شان و شوکت سے کی جائے اور پولینیئس کی لاش کتوں کے آگے ڈال دی جائے۔ آگے چل کر جب ریاست وجود میں آئی تو اسی کاؤنسل کو سینیٹ بنا دیا گیا۔

(۲) عوامی اسمبلی (agora) ۔ ایروکواس لوگوں میں ہم دیکھہ چکے ہیں کہ مرد عورت سب کاؤنسل کے اجلاس کے باہر چاروں طرف دائرہ بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور بحث میں باقاعدہ حصہ لیتے اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ہومر کے زمانہ کے یونانیوں میں یہ چیز جس کو، اگر ہم قدیم جرمن قانونی اصطلاح کا استعمال کریں تو (Umstand) امسٹانڈ* کہہ سکتے ہیں، ایک مکمل عوامی اسمبلی بن چکی تھی۔ قدیم زمانہ کے جرمنوں میں بھی یہی ہوا تھا۔ اہم مسائل طے کرنے کے لئے کاؤنسل اس اسمبلی کا اجلاس بلاتی تھی جس میں ہر شخص کو بولنے کا حق تھا۔ فیصلہ ہاتھہ

---

* امسٹانڈ کے معنی ہیں چاروں طرف کھڑے ہونے والے لوگ۔ (اڈیٹر۔)

اٹھاکر کیا جاتا تھا (ایسکیلس نے «ملتجی» میں لکھا ھے) اور کبھی کبھی زبانی اعلان کے ذریعہ بھی کیا جاتا تھا۔ اسمبلی ھی تمام اختیارات کی مالک تھی۔ اس کے اوپر کوئی نہیں تھا۔ شومان نے اپنی کتاب «یونان کے قدیم آثار»* میں لکھا ھے کہ «جب کبھی کسی ایسے مسئلہ پر بحث ھوتی جس کو عمل میں لانے کے لئیے عوام کے تعاون کی ضرورت تھی تو ھومر کہیں بھولے سے بھی یہ نہیں کہتا کہ لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا جاتا تھا۔» اس زمانہ میں جبکہ قبیلے کا ھر بالغ شخص ایک جنگجو سپاھی تھا کوئی ایسا ریاستی اقتدار نہیں تھا جو عوام سے الگ ھو اور جس کو اس کے خلاف کھڑا کیا جا سکتا ھو۔ قدیم جمہوریت اپنے شباب پر تھی اور کاؤنسل اور بیسیلیئس کے اختیارات اور ان کی حیثیت کا اندازہ لگانے میں اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ھے۔

(۳) فوجی سالار (basileus) ۔ اس سوال پر مارکس نے لکھا ھے کہ «یورپ کے فلسفی جو خود زیادہ تر بادشاھوں کے پیدائشی خادم ھیں، بیسیلیئس کو آج کل کے مفہوم میں بادشاہ بناکر پیش کرتے ھیں۔ یانکی (امریکی) جمہوریت پسند مارگن اس پر اعتراض کرتا ھے۔ بڑے طنز لیکن بڑی سچائی کے ساتھہ چاپلوس گلیڈسٹن اور اس کی کتاب «شباب عالم»**

---

* Schoemann G. F., Griechische Alterthümer. Bd. I—II. Berlin, 1855—1859. (اڈیٹر۔)

** Gladstone W. E., Juventus mundi. The gods and men of the heroic age. London, 1869. (اڈیٹر۔)

کے بارے میں مارگن کہتا ہے: «مسٹر گلیڈسٹن اپنے پڑھنے والوں کے سامنے سورمائی عہد کے یونانی سرداروں کو بادشاہ اور شاہزادہ بناکر پیش کرتے ہیں اور ان میں شریف زادوں کی خصوصیتوں کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن گلیڈسٹن صاحب کو یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ یونانیوں میں اگرچہ جیٹھائی (یعنی بڑے لڑکے کے حقدار ہونے) کا رواج یا قاعدہ خاصی حد تک تو ضرور ہے لیکن بہت اچھی طرح واضح نہیں ہے۔» سچ تو یہ ہے کہ مسٹر گلیڈسٹن نے خود بھی یہ بات محسوس کی ہوگی کہ بڑے لڑکے کے حقدار ہونے کا یہ اتفاقی نظام اگر خاصی حد تک واضح ہے مگر بہت اچھی طرح واضح نہیں ہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک عہدوں کے موروثی ہونے کا تعلق ہے، ایروکواس اور دوسرے انڈین قبیلوں میں سرداروں کے عہدوں کا کیا حال تھا۔ چونکہ تمام عہدہ دار زیادہتر گن کے اندر سے ہی چنے جاتے تھے، اس لئے اس حد تک یہ عہدے گن کے اندر پشتینی یا موروثی ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ قاعدہ ہو گیا کہ کوئی جگہ خالی ہوتی تو وہ اس شخص کو ملتی تھی جو گن کے حساب سے پرانے عہدہ دار کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوتا تھا یعنی وہ عہدہ پرانے عہدہ دار کے بھائی کو یا بہن کے لڑکے کو ملتا تھا۔ یہ قاعدہ اسی وقت توڑا جاتا تھا جب ایسا کرنے کی کوئی مناسب وجہ ہوتی۔ یونان میں چونکہ پدری حق قائم تھا اس لئے بیسیلیئس کا عہدہ زیادہ تر پرانے بیسیلیئس کے لڑکے کو یا اس کے

متعدد لڑکوں میں سے کسی ایک کو ملتا تھا۔ لیکن اس بات سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ عام طور پر باپ کی جگہ اس کے کسی لڑکے کو چنتے تھے۔ اس سے یہ ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ عام انتخاب کیے بغیر ہی باپ کا عہدہ بیٹے کو قانوناً مل جاتا تھا۔ یہاں ہمیں ایروکواس لوگوں میں اور یونانیوں میں گنوں کے اندر شرفا اور امراء کے مخصوص خاندانوں کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور یونانیوں میں تو یہ مستقبل کی موروثی سرداری یا بادشاہت کی پہلی جھلک تھی۔ اس لئے ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ یونانیوں میں بیسیلیئس کو یا تو عوام چنتے تھے یا کم سے کم عوام کی تسلیم‌کردہ جماعت — کاؤنسل یا اگورا — کی منظوری ضروری ہوتی تھی جیسا کہ رومی «بادشاہ» (ریکس) کے سلسلہ میں ہوتا تھا۔

«ایلیڈ» میں سورماؤں کا حکمران ایگاممنون، یونانیوں کے سب سے بڑے باد شاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی وفاقی فوج کے سب سے بڑے سپہ سالار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ایک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ اور جب یونانی لوگ آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں، تب اوڈیسیئس اس مشہور ٹکڑے میں اس کی اسی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: بہت سے فوجی سالاروں کا ہونا اچھا نہیں ہے۔ ہمارا ایک ہی سپہ سالار ہونا چاہئے، وغیرہ۔ (بعد میں اس میں وہ حصہ بھی جوڑ دیا گیا جس میں عصائے شاہی کا ذکر ہے)۔ «یہاں اوڈیسیئس اس بات پر لکچر نہیں دے رہا ہے

که حکومت کس طرح کی ہونی چاہئیے بلکہ اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ میدان جنگ میں سب سے بڑے سپہ سالار کی ہدایتوں پر عمل کرنا چاہئیے۔ ٹرائے کے سامنے یونانی محض ایک فوج کی شکل میں آتے ہیں۔ لیکن ان کی مجلس (agora) کی کارروائی کافی جمہوری ڈھنگ سے ہوتی ہے: جب ایکیلیز تحفوں یعنی جنگ کے مال غنیمت کے بٹوارے کا ذکر کرتا ہے تو وہ کبھی بھی ایگاممنون یا کسی دوسرے بیسیلیئس کے ذریعہ نہیں بلکہ ہمیشہ «ایکینوں کے بیٹوں» یعنی عوام کے ذریعہ اس کو تقسیم کراتا ہے۔ اگر کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ «زیوس کی اولاد» ہے یا «زیوس نے اس کو پالا پوسا» ہے تو اس سے کوئی خاص بات ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ہر گن کسی نہ کسی دیوتا کی اولاد ہوتا ہے اور قبائلی سردار کا گن کسی «ممتاز» دیوتا کی اولاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کا گن زیوس کی نسل سے ہے۔ یہاں تک کہ سوروں کی دیکھ بھال کرنے والے ایمویئس اور دوسرے غلام بھی «دیوتاؤں کی نسل» سے (theioi یا dioi) مانے جاتے ہیں۔ اس کا ذکر ہمیں «اوڈیسی» تک میں ملتا ہے اور اس لئے یہ «ایلیڈ» سے بہت بعد کے زمانہ کی چیز ہے۔ اسی طرح ہم «اوڈیسی» میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مولیوس نامی نقیب کو اور ڈیموڈوکس نام کے اندھے گویا شاعر کو بھی «heros» (ہیروس) یعنی سورما کہا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یونانی مصنفین ہومر کی نام نہاد بادشاہت کے لئے جس لفظ basileia کو استعمال کرتے ہیں، (کیونکہ فوجی رہنمائی ہی اس کی اصلی خصوصیت

ھے)، وہ بیسیلیا کاؤنسل اور عوامی اسمبلی کے ساتھہ مل کر محض ایک فوجی جمہوریت ھوتی ھے، اور کچھہ نہیں۔»
(مارکس۔)

فوجی ذمہ داریوں کے علاوہ بیسیلیئس کو کچھہ پروھتی اور کچھہ عدالتی ذمہ داریاں بھی ادا کرنی پڑتی تھیں۔ عدالتی ذمہ داریاں بہت صاف نہیں تھیں۔ لیکن پروھت کا کام وہ اپنے قبیلے کے یا متعدد قبیلوں کے وفاق کے سب سے اعلی نمائندے کی حیثیت سے انجام دیتا تھا۔ اس کی نظم ونسق کی ذمہ‌داریوں کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ھے۔ لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے کہ بیسیلیئس اپنے عہدے کی بدولت کاؤنسل کا ممبر ھوتا تھا۔ علم صرف کے قاعدے کی رو سے «بیسیلیئس» کا ترجمہ بادشاہ کرنا بالکل صحیح ھے کیونکہ انگریزی کا لفظ کنگ (king) جس کا مطلب بادشاہ ھے، (یا کوننگ kuning)، کنی (kuni) یا کنے (künne) سے نکلا ھے جس کے معنی ھیں گن کا سردار۔ لیکن قدیم یونانی بیسیلیئس کو لفظ کنگ (بادشاہ) کے موجودہ مفہوم سے کوئی نسبت نہیں۔ تھیوسیڈیڈیز تو قدیم basileia کو صاف صاف patrikê کہتا ھے جس کا مطلب ھے کہ وہ گن سے نکلا ھے۔ اس نے یہ بھی کہا ھے کہ بیسیلیا کی مخصوص اور اس لئے محدود ذمہ داریاں ھوتی تھیں۔ اور ارسطو کا کہنا ھے کہ سورمائی عہد میں بیسیلیا آزاد شہریوں کی رھنمائی کرتا تھا اور بیسیلیئس فوجی سالار، قاضی اور بڑا پروھت ھؤا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ بعد کے زمانہ میں

حکومت کا جو مطلب ھو گیا، ویسی کوئی طاقت بیسیلیئس کے ھاتھہ میں نہیں تھی*۔

اس طرح سورمائی عہد کے یونانی سماجی دستور میں جہاں ھم ایک طرف یہ پاتے ھیں کہ پرانا گن نظام اب بھی اتنے ھی زور و شور سے جاری ھے، وھاں ساتھہ ھی ھمیں اس کے زوال کی ابتدا بھی دکھائی دینے لگتی ھے۔ اس عہد میں

---

* یونانی بیسیلیئس کی طرح ایزتک لوگوں کے فوجی سالار کو بھی غلط ڈھنگ سے موجودہ مفہوم کے مطابق بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ھے۔

اسپین والوں نے شروع میں چیزوں کو غلط سمجھا اور ان کے متعلق مبالغہ‌آرائی سے کام لیا اور بعد میں تو وہ جان بوجھہ کر چیزوں کو توڑ مڑوڑ کر پیش کرنے لگے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے مارگن نے ھی سب سے پہلے اسپینیوں کی رپورٹوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس نے بتایا کہ میکسیکو کے باشندے بربریت کے درمیانی دور میں تھے۔ لیکن وہ نیومیکسیکو کے پوئبلو انڈینوں کے مقابلہ میں زیادہ اونچی سطح پر تھے۔ اور ان کا دستور، جہاں تک مسخ‌شدہ رپورٹوں سے قیاس کیا جا سکتا ھے، مجموعی طور پر کچھہ اس طرح کا تھا: تین قبیلوں کا ایک وفاق تھا جس نے اور متعدد قبیلوں کو اپنا باجگذار بنا لیا تھا، وفاق کی حکومت ایک وفاقی کاؤنسل اور ایک وفاقی فوجی سالار کے ھاتھہ میں تھی۔ اسی وفاقی فوجی سالار کو اسپین والوں نے «شہنشاہ» بنا رکھا تھا۔ (نوٹ از اینگلس۔)

پدری حق مانا جانے لگا ہے اور باپ کی وراثت اس کے بچوں کو ملنے لگی ہے جس سے خاندان کے اندر دولت جمع کرنے کا رجحان بڑھتا ہے اور گن کے مقابلہ میں خاندان کی طاقت بڑھتی ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس کم اور کچھ کے پاس زیادہ دولت ہو جانے کا سماج کے دستور پر اثر پڑتا ہے اور پہلی بار موروثی شرفا اور بادشاہت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ غلامی کی ابتدا ہوتی ہے، جو پہلے جنگ کے قیدیوں تک محدود تھی لیکن جو قبیلہ کے اندر اور خود اپنے گن کے اندر کے لوگوں کو غلام بنانے کا راستہ صاف کرنے لگی تھی۔ پرانے زمانہ میں مختلف قبیلوں میں جنگ ہؤا کرتی تھی، اب اس کی جگہ مویشیوں، غلاموں اور دولت کو لوٹنے کے لئے زمین اور پانی کے رستے حملے کئے جانے لگے۔ روزی حاصل کرنے کا یہ ایک باقاعدہ ذریعہ بن گیا۔ مختصر یہ کہ دھن دولت کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھا جانے لگتا ہے اور دولت کی اس جبری لوٹ کو جائز قرار دینے کے لئے پرانے گن سماج کے اداروں اور رواجوں کو توڑ مڑوڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اب صرف ایک چیز کی کمی تھی—کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جو نہ صرف افراد کی نئی حاصل کی ہوئی ذاتی ملکیت کو گن کے نظام کی کمیونسٹی روایات سے بچا سکے، جو نہ صرف ذاتی ملکیت کو، جو کہ پہلے زیادہ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی تھی، قابل احترام قرار دے اور اس حرمت اور تقدس کو انسانی سماج کا اعلی ترین مقصد قرار دے، بلکہ جو ملکیت حاصل کرنے کے اور دولت میں

برابر تیزی سے اضافہ کرتے رہنے کے نت نئے ابھرنے والے طریقوں پر قبول عام کی مہر بھی لگا دے، جو نہ صرف سماج میں نئی پیدا ہونےوالی طبقاتی تقسیم کو مستقل بنا دے بلکہ ملکیت والے طبقوں کے ہاتھوں ملکیت سے محروم طبقوں کے استحصال کے حق کو اور محروم طبقوں پر ملکیت والے طبقوں کی حکومت کو پائدار بھی بنائے۔

اور یہ ادارہ بھی آ پہنچا۔ ریاست ایجاد ہو گئی۔

۵

ایتھنز میں ریاست کا ظہور

ریاست کا ارتقا کیونکر ہؤا، نئے اداروں کے قائم ہونے کی وجہ سے کیونکر گن دستور کے کچھہ ادارے بدل گئے اور کچھہ مٹ گئے اور آخر میں کس طرح سارے پرانے اداروں کی جگہ پر صحیح معنی میں سرکاری حکام آ گئے اور دوسری طرف «ہتھیاربند عوام» کی جگہ، جو خود اپنے گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں کے ذریعہ اپنی حفاظت کیا کرتے تھے، ہتھیاربند «سرکاری طاقت» قائم ہوئی جو ان حکام کے اشاروں پر چلا کرتی تھی اور لہذا جس سے عوام کے خلاف بھی کام لیا جا سکتا تھا — یہ تمام باتیں خاصکر اپنے ابتدائی دور میں جتنی صفائی کے ساتھہ ایتھنز میں دیکھی جا سکتی ہیں، اتنی صفائی کے ساتھہ اور کہیں نہیں دیکھی جا سکتیں۔ یہ تبدیلیاں کیسے ہوئیں، اس کو بحیثیت مجموعی مارگن بتا چکا ہے۔ ان کی تہہ میں کون سی اقتصادی حقیقت کام کر رہی تھی، یہ خود مجھے اضافہ کرنا پڑا ہے۔

سورمائی عہد میں ایتھنز والوں کے چار قبیلے اٹیکا کے الگ الگ حصوں میں بسے ہوئے تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن بارہ فریٹریوں کو لے کر یہ چار قبیلے بنے تھے، وہ بھی کیکروپس کے بارہ شہروں میں الگ الگ رہتی تھیں۔ سبھی جگہ وہی سورمائی عہد کا دستور قائم تھا: عوامی اسمبلی، عوامی کاؤنسل اور بیسیلئیس۔ اس قدیم زمانہ میں، جہاں تک لکھی ہوئی تاریخ ہمیں لے جاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ زمین لوگوں میں بانٹی جا چکی ہے اور وہ لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئی ہے۔ اور یہ بات اس سے مطابقت رکھتی ہے کہ اس زمانہ میں، بربریت کے آخری دور کے ختم ہوتے ہوتے جنس تبادلہ کی پیداوار اور اس کی تجارت نسبتاً ترقی کر چکی تھی۔ اناج کے علاوہ شراب بنانے کے لئے انگور اور تیل نکالنے کے لئے تلہن کی بھی کھیتی ہونے لگی تھی۔ بحر ایجین کے راستے جو تجارت ہوتی تھی وہ فوئینیشین لوگوں کے ھاتھوں سے نکل کر زیادہ سے زیادہ اٹیکا کے لوگوں کے ھاتھوں میں پہونچ رہی تھی۔ زمین کی خرید و فروخت اور کھیتی اور دستکاری، تجارت اور جہازرانی کے درمیان برابر تقسیم محنت کے بڑھتے رہنے کی وجہ سے گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں کے ممبر جلدی ھی آپس میں گھلنے ملنے لگے۔ جن ضلعوں میں پہلے ایک فریٹری یا قبیلے کے لوگ رہا کرتے تھے، وھاں اب نئے لوگ پہونچ گئے جو اسی ملک کے باشندے ہوتے ہوئے بھی ان قبیلوں یا فریٹریوں کے ممبر نہیں تھے اور اس لئے جو خود اپنی بود و باش کی جگہوں میں

اجنبی تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امن کے زمانہ میں ہر فریٹری اور ہر قبیلہ خود اپنے معاملوں کا انتظام کرتا تھا اور ایتھنز میں بیٹھنے والی عوامی کاؤنسل یا بیسیلیئس سے کوئی مشورہ نہیں لیتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی فریٹری یا قبیلہ کے علاقہ میں رهنے والے وہ لوگ جو ان دونوں میں سے کسی کے ممبر نہ ہوں، نظم و نسق میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔

اس سے گن دستور کے مختلف اداروں کے باقاعدہ کام میں خلل پڑنے لگا۔ اور سورمائی عہد میں ھی اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ کسی طرح اس گڑبڑ کو دور کیا جائے۔ چنانچہ ایک نیا دستور بنایا گیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے تھیسیئس نے تیار کیا تھا۔ اس تبدیلی کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ایتھنز میں ایک مرکزی ادارۂ نظم و نسق قائم کیا گیا۔ مطلب یہ کہ کچھہ ایسے معاملے جن کا انتظام ابھی تک قبیلے خود آزادی کے ساتھہ کرتے تھے، اب سب قبیلوں کے اجتماعی یا مشترک معاملے قرار دئیے گئیے اور انہیں ایتھنز کی عام کاؤنسل کے سپرد کر دیا گیا۔ امریکہ کے انڈین ترقی کی جس منزل تک پہونچے تھے، ایتھنز کے باشندے اس سے ایک قدم آگے بڑھہ گئے۔ پڑوسی قبیلوں کے سادہ وفاق کے بدلے اب سارے قبیلے آگے بڑھہ کر ایک جاتی کے روپ میں گھل مل گئے۔ اس سے ایتھنز کے عام قانون کا ایک پورا نظام تیار ھو گیا جو قبیلوں اور گنوں کے قانونی رواجوں سے زیادہ اونچی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظام سے ایتھنز کے سبھی شہریوں کو شہری کی حیثیت سے

بعض حقوق اور بعض مزید قانونی تحفظات حاصل ہو گئے تھے
جو اس علاقہ میں کام آ سکتے تھے جو ان کے اپنے قبیلہ کا
نہیں تھا۔ لیکن گن دستور کی جڑ کھودنے کی طرف یہ پہلا
قدم تھا۔ کیونکہ بعد میں اسی کی بنیاد پر ایسے لوگوں کو
بھی شہری بنا لیا گیا جن کو اٹیکا کے کسی بھی قبیلے سے
تعلق نہیں تھا اور جو ایتھنز کے گن دستور کے دائرے کے
بالکل باہر تھے اور باہر ہی رہے۔ تھیسیئس کی طرف ایک
اور بات منسوب کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمام لوگوں
کو گن، فریٹری اور قبیلے کے فرق کو بھلاکر، تین طبقوں
میں تقسیم کر دیا: یوپیٹریڈیز یعنی امراء اور شرفاء کا طبقہ،
جیوموروئی یعنی زمین کی کاشت کرنے والے لوگ اور ڈیمی
ارجی یعنی دستکار۔ سرکاری عہدہ دار بننے کا حق صرف امراء
اور شرفاء کو دیا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ امراء اور شرفاء
کے لئے سرکاری عہدوں کو مخصوص کر دینے کے علاوہ اس
نئی تقسیم کا اور کوئی اثر نہیں ہوًا کیونکہ اس نے مختلف
طبقوں کے درمیان کوئی اور قانونی امتیازات نہیں پیدا کئے۔
لیکن اس کے باوجود یہ تقسیم بہت اہم ہے کیونکہ اس سے
ہمیں ان نئے سماجی عناصر کا پتہ چلتا ہے جو اس دوران میں
خاموشی کے ساتھ ابھر آئے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ گنوں میں عہدوں پر چند خاص خاندانوں کے لوگوں کے
تقرر کا رواج بڑھ کر ان خاندانوں کا مخصوص حق بن چکا
تھا اور اس پر کسی کو اعترض نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ خاندان
جو اپنی دولت کی وجہ سے کافی طاقتور ہو چکے تھے، اپنے

گنوں کے باہر ایک با اقتدار طبقہ کی صورت میں متحد ہونے لگے تھے۔ اور جو نئی ریاست جنم لے رہی تھی اس نے اقتدار کے اس غصب کو جائز قرار دیا۔ پھر اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکار اور دستکار کے درمیان محنت کی تقسیم اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس نے گنوں اور قبیلوں کی پرانی تقسیم کی برتری کو سماجی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ اور آخر میں، اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا تھا کہ گن سماج اور ریاست میں ایک ایسا تضاد ہے جو کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ ریاست قائم کرنے کی اس پہلی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ گن کے ممبروں کو ایک اعلیٰ طبقہ اور ایک ادنیٰ طبقہ میں تقسیم کر کے گن کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا اور ادنیٰ طبقہ کو پھر کاشتکاروں اور دستکاروں کے دو الگ الگ طبقوں میں بانٹ کر انہیں ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔

اس کے بعد سے سولون کے زمانہ تک ایتھنز کی سیاسی تاریخ پوری طرح معلوم نہیں ہے۔ بیسیلیئس کا عہدہ رفتہ رفتہ بیکار ہو گیا۔ اور آرکون (مختار کل) جو شرفا میں سے چنے جاتے تھے ریاست کے صدر بن گئے۔ امراء اور شرفاء کی حکومت برابر بڑھتی گئی حتیٰ کہ ۶۰۰ قبل مسیح تک وہ ناقابل برداشت ہو گئی۔ عام لوگوں کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے دو ذریعے تھے، ایک زر یعنی روپیہ اور دوسرے سود خوری۔ شرفاء زیادہ تر ایتھنز میں اور اس کے آس پاس رہتے تھے اور وہاں سمندری تجارت سے اور ضمنی کار و بار کے طور پر کبھی

کبھار کی سمندری قزاقی سے، دولت بٹور رہے تھے اور ساری
نقد دولت اپنے ہاتھوں میں جمع کر رہے تھے۔ اس زمانہ سے
دیہی برادریوں کی قدیم روایتی زندگی کو جو فطری معیشت
پر مبنی تھی، زر کا بڑھتا ہؤا نظام تیزاب کی طرح کھانے
لگا۔ گن دستور زر کے نظام سے قطعی کوئی میل نہیں کھاتا۔
جیسے جیسے اٹیکا کے چھوٹے چھوٹے کسان اقتصادی حیثیت
سے برباد ہوتے گئے، ویسے ویسے گن دستور کے وہ بندھن
بھی ڈھیلے پڑتے گئے جو پہلے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ ایتھنز
کے باشندوں نے اس زمانہ تک رھن کا رواج بھی شروع کر
دیا تھا۔ اور مہاجن کی ھنڈی اور رھن‌نامہ نہ تو گن کا
احترام کرتے ھیں اور نہ فریٹری کا۔ پرانا گن دستور زر،
ادھار اور نقد قرض سے ناواقف تھا۔ اس لئے شرفاء کی لگاتار
بڑھتی ہوئی زر کی حکومت نے ایک نئے قانون کو جنم دیا
جو قرضدار سے مہاجن کی حفاظت کرتا تھا اور روپے کے
مالک کو چھوٹے کسان کے استحصال کی اجازت دیتا تھا۔ یہی
نیا رواج تھا۔ اٹیکا کے دیہاتی علاقہ میں رھن کی تختیوں
کا جال بچھہ گیا۔ ان پر لکھا ھوتا تھا کہ جس زمین پر یہ
تختی لگی ھے وہ اتنے روپئے کے لئے فلاں آدمی کے یہاں رھن
رکھہ دی گئی ھے۔ جن کھیتوں میں ایسی تختیاں نہیں تھیں،
ان میں سے زیادہ تر رھن کی میعاد ختم ھو جانے کی وجہ سے
یا سود نہ ادا کر سکنے کی وجہ سے فروخت ھو چکے تھے اور
سود خور شریف‌زادوں کی ملکیت بن چکے تھے۔ کسان کو اگر
لگان دینے والے کاشتکار کی حیثیت سے رھنے دیا جاتا تو وہ

اپنے کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا۔ وہ اپنی محنت کی پیداوار کے ایک چھٹے حصے پر خود گذارہ کرتا اور چھہ میں پانچ حصے مالک کو لگان کے طور پر ادا کر دیتا تھا۔ یہی نہیں، جو زمین رھن رکھی گئی تھی، اس کی فروخت سے اگر مہاجن کا پورا روپیہ ادا نہیں ھوتا تھا یا اگر ایسا قرض ھوتا تھا جس کے بدلے میں کوئی چیز گروی نہیں رکھی گئی تھی تو قرضدار کو مہاجن کا روپیہ ادا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو بدیس میں غلام بنا کر بیچنا پڑتا تھا۔ باپ اپنے ھاتھوں اپنی اولاد کو بیچ ڈالتا تھا۔ پدری حق اور یک زوجگی کا پہلا نتیجہ یہی نکلا تھا۔ اور اگر خون چوسنے والا مہاجن اس سے بھی مطمئن نہیں ھوتا تھا تو وہ خود قرضدار کو غلام کی طرح بیچ سکتا تھا۔ ایتھنز کے لوگوں میں تمدن کی خوشگوار صبح کا آغاز ایسے ھی ھؤا تھا۔

پہلے جب لوگوں کی زندگی کے حالات گن دستور کے مطابق تھے، تب اس طرح کا انقلاب ناممکن تھا۔ لیکن اب یہ انقلاب ھو گیا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے ھو گئی۔ آئیے، کچھہ دیر کے لئے پھر ایروکواس لوگوں کے بیچ لوٹ چلیں۔ جیسی حالت ایتھنز کے باشندوں میں آپ ھی آپ اور گویا بغیر کچھہ کئے ھی، اور بلاشک ان کی خواھش کے خلاف، پیدا ھو گئی ویسی حالت کا ھم ایروکواس لوگوں میں تصور تک نہیں کر سکتے۔ وھاں ذرائع زندگی کی پیدائش کا طریقہ جو سال بہ سال ایک سا ھی رھتا تھا اور جس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں ھوتی

تھی، ایسا تھا جس میں ایسی کشمکش کبھی پیدا ھی نہیں ھو سکتی تھی جس کے بارے میں یہ معلوم ھو کہ اسے باھر سے سماج پر لادا گیا ھے۔ پیداوار کے اس طریقہ میں امیر اور غریب کا اختلاف یا استحصال کرنے والوں اور کئے جانے والوں کا تضاد نمودار نہیں ھو سکتا تھا۔ ایروکواس لوگ ابھی فطرت کے مالک نہیں بن پائے تھے لیکن فطرت نے ان کے لئے جو حد مقرر کر دی تھی، اس کے اندر وہ اپنی پیداوار کے مالک تھے۔ کبھی کبھی ان کے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں اچھی فصل نہیں ھوتی تھی۔ کبھی کبھی ان کی جھیلوں اور ندیوں میں مچھلیاں اور ان کے جنگلوں میں شکار کے جانور اور پرندے ختم ھو جاتے تھے۔ مگر ان باتوں کے علاوہ انہیں یہ معلوم رھتا تھا کہ ان کے روزی کمانے کے طریقہ کا کیا پھل ھوگا۔ اس کا پھل یہی ھو سکتا تھا کہ زندگی بسر کرنے کے وسیلے حاصل ھوں، کبھی فراوانی کے ساتھہ اور کبھی کم۔ لیکن اس کا پھل یہ نہیں ھو سکتا تھا کہ سماج میں بےساختہ افراتفری مچ جائے اور بڑی بڑی تبدیلیاں ھو جائیں، گن دستور کا شیرازہ بکھر جائے، گنوں اور قبیلوں کے ممبروں میں پھوٹ پڑ جائے اور وہ باھم‌دگر مخالف طبقوں میں بٹ‌کر آپس میں لڑنے لگیں۔ پیداوار بہت محدود دائرے میں ھوتی تھی، لیکن پیداوار کرنے والوں کا اپنے پیدا کئے ھوئے مال پر قبضہ ھوتا تھا۔ عہد بربریت کے طریقۂ پیداوار کی یہ ایک بڑی خوبی تھی جو تمدن کے آتے ھی ختم ھو گئی۔ اور فطرت کی قوتوں پر انسان کو جو

زبردست قدرت حاصل ہو گئی ہے اور انسانوں میں آج جو آزاد تعاون ممکن ہے، اس کی بنیاد پر عہد بربریت کی پیداوار کی اس خصوصیت کو پھر سے حاصل کرنا ہی آنے والی نسلوں کا کام ہے ـ

یونانیوں میں ایسی حالت نہیں تھی ـ جب مویشیوں کے ریوڑ اور عیش و آرام کے سامان کچھہ افراد کی نجی ملکیت بن گئے تب افراد کے درمیان چیزوں کا تبادلہ ہونے لگا اور پیداوار جنس تبادلہ یا بکاؤ مال بن گئی ـ آگے چل کر جو سارا انقلاب ہؤا اس کی جڑ میں یہی چیز تھی ـ پیدا کرنے والے چونکہ اب اپنی پیداوار کو خود خرچ نہیں کرتے تھے اور وہ تبادلہ کے ذریعہ ان کے ہاتھہ سے نکل جاتی تھی، اس لئے اپنی پیداوار پر خود ان کو کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا ـ اب انہیں یہ پتہ نہیں رہتا تھا کہ ان کی پیداوار کا کیا ہؤا اور اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ پیداوار ایک روز اپنے پیدا کرنے والوں کے خلاف استعمال کی جا سکے اور وہ ان کے استحصال اور ان پر ظلم کا ایک ہتھیار بن جائے ـ لہذا جو سماج افراد کے درمیان ہونے والے تبادلہ کو بند نہیں کرتا، وہ بہت دنوں تک خود اپنی پیداوار کا مالک نہیں رہ سکتا اور اپنے عمل پیداوار کے سماجی نتیجوں پر قابو نہیں رکھہ سکتا ـ

ایتھنز کے باشندوں کو جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ انفرادی تبادلہ کے شروع ہونے اور پیداوار کے جنس تبادلہ بن جانے کے بعد کتنی تیزی کے ساتھہ پیداوار پیدا کرنے

والے پر اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے۔جنس تبادلہ کی پیداوار کے ساتھ ساتھ انفرادی کھیتی بھی شروع ہو گئی۔ لوگ الگ الگ اپنے فائدے کے لئے زمین جوتنے لگے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد زمین پر انفرادی ملکیت قائم ہو گئی۔پھر زر یا روپیہ یعنی وہ چیز آ گئی جس کا دوسری سبھی چیزوں کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا تھا۔لیکن جب انسانوں نے زر کو ایجاد کیا تب انہوں نے یہ ذرا بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک نئی سماجی طاقت کو، ایک ایسی عالمگیر طاقت کو وجود میں لا رہے ہیں جس کے سامنے پورے سماج کو جھکنا پڑے گا۔یہ نئی طاقت اپنے پیدا کرنے والوں کی خواہش یا واقفیت کے بغیر اچانک پیدا ہو گئی تھی، جس کے شباب کے پورے حیوانی کس بل کو اینٹھنے والوں کو جھیلنا پڑا۔

لیکن پھر کیا کیا جاتا؟ پرانی گن تنظیم زر کی فاتحانہ آمد کو روکنے میں ناکام ثابت ہوتی تھی۔ یہی نہیں، وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ زر، مہاجن، قرضدار اور قرضوں کی زبردستی وصولی جیسی چیزوں کو اپنے نظام میں جگہ دے سکے۔ لیکن نئی سماجی قوت وجود میں آ چکی تھی اور نہ لوگوں کی پاک خواہشوں میں اور نہ ان کی پرانے ست یگ کو پھر سے لوٹا لانے کی تمناؤں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ زر اور سود خوری کو سماج سے نکال کر باہر کر دیتیں۔ اس کے علاوہ گن دستور میں کتنی ہی چھوٹی موٹی دراریں بھی پڑ چکی تھیں۔ اٹیکا کے ہر کونے میں کنوں

اور فریٹریوں کے ممبر آپس میں گھل مل رہے تھے ۔ ایتھنز میں یہ بات خاص طور سے دیکھنے میں آ رہی تھی اور پشت در پشت یہ چیز بڑھتی ہی جا رہی تھی حالانکہ ایتھنز والوں کو اپنی زمین تو گن کے باہر بیچنے کی اجازت تھی مگر وہ اپنے رہائشی مکانات کو گن کے باہر نہیں بیچ سکتے تھے ۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ پیداوار کی مختلف شاخوں میں، جیسے کھیتی، دستکاری اور مختلف پیشوں کے اندر متعدد قسم کے ہنر، تجارت، جہازرانی وغیرہ میں محنت کی تقسیم نے اور بھی ترقی کی ۔ اب لوگ اپنے اپنے پیشوں کے مطابق، پہلے کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ واضح گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ہر گروہ کے کچھہ ایسے نئے مشترک مفاد پیدا ہو گئے تھے جن کے لئے گن میں یا فریٹری میں کوئی گنجائش نہیں تھی اور اس لئے ان کی دیکھہ بھال کرنے کے لئے نئے عہدہداروں کو مقرر کرنا ضروری تھا ۔ غلاموں کی تعداد بہت بڑھہ گئی تھی اور اس ابتدائی حالت میں بھی وہ ایتھنز کے آزاد شہریوں سے تعداد میں کہیں زیادہ ہونگے ۔ گن دستور شروع میں غلامی کے رواج سے ناواقف تھا اور اس لئے وہ کوئی ایسی تدبیر نہیں جانتا تھا جس کے ذریعہ غلاموں کی اس کثیر تعداد کو دبا کر رکھا جا سکے ۔ اور آخری بات یہ ہے کہ تجارت کی کشش سے بہت سے اجنبی ایتھنز میں آ کر بس گئے تھے کیونکہ وہاں دھن دولت کمانا آسان تھا ۔ اور پرانے دستور کے مطابق ان اجنبیوں کو نہ تو کوئی حق حاصل تھا

اور نہ قانون کسی طرح ان کی حفاظت کرتا تھا ۔ باوجود اس کے کہ ان کے ساتھہ پرانی روایتی رواداری برتی جاتی تھی پھر بھی وہ عام لوگوں کے درمیان ایک پریشان‌کن اور اجنبی عنصر بنے ہوئے تھے ۔

مختصر یہ کہ گن دستور کا خاتمہ قریب تھا ۔ سماج دن بدن اس کی حدود سے آگے نکلا جا رہا تھا ۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے جو نہایت تکلیف دہ برائیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کو دور یا کم کر سکے ۔ لیکن اسی دوران میں، خاموشی کے ساتھہ ریاست کا ظہور ہو چکا تھا ۔ پہلے شہر اور دیہات کے درمیان اور پھر شہری صنعت‌وحرفت کی مختلف شاخوں کے درمیان محنت کی تقسیم ہو جانے سے جو نئے گروہ بن گئے تھے، انہوں نے اپنے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے نئے ادارے قائم کر لئے تھے ۔ طرح طرح کے سرکاری عہدے قائم ہو گئے تھے ۔ اور اسکے علاوہ نوخیز ریاست کو سب سے زیادہ ایک فوج کی ضرورت تھی جو ایتھنز کے باشندوں کے لئے، جو سمندر میں جہازرانی کرتے تھے، شروع میں بحری فوج ہی ہو سکتی تھی جو کبھی کبھی ہونے والی چھوٹی موٹی لڑائیوں کے لئے اور تجارتی جہازوں کی حفاظت کرنے کے کام آ سکے ۔ سولون سے پہلے کسی غیرمتعین زمانہ میں چھوٹے چھوٹے علاقائی ضلع بنا دئے گئے تھے جنہیں نوکریری کہا جاتا تھا ۔ ہر قبیلے میں بارہ نوکریری ہوتے تھے اور ہر نوکریری کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک جنگی جہاز کو سازوسامان

اور سپاہیوں سے لیس کرے اور اس کے علاوہ وہ دو گھوڑ سواروں کا بند و بست کرے۔ اس انتظام سے گن دستور پر دو طرح کی چوٹ پڑتی تھی۔ ایک تو اس سے ایک ایسی پبلک طاقت پیدا ہو گئی تھی جو اب تمام ہتھیاربند عوام کی مرادف نہیں رہی تھی۔ دوسرے، امور عامہ کے لئے عوام کو پہلی بار خون کے رشتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ علاقہ کے مطابق، بود و باش کی مشترک جگہ یعنی ایک ہی جگہ بسے ہوئے ہونے کی بنیاد پر، الگ الگ بانٹ دیا گیا تھا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔

عوام جن کا استحصال کیا جاتا تھا، انہیں چونکہ گن دستور سے کوئی مدد نہیں مل پاتی تھی اس لئے اب وہ صرف نئی ابھرنے والی ریاست سے ہی کچھ امید کر سکتے تھے۔ اور ریاست نے سولون کے دستور کی شکل میں ان کی مدد کی اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے پرانے دستور کی اہمیت گھٹاکر اپنا پلہ اور بھی بھاری کر لیا۔ ہمیں یہاں اس سے تعلق نہیں کہ سولون کی ۵۹٤ قبل مسیح کی اصلاحات کس طرح ظہور میں آئی تھیں۔ مگر اس نے ملکیت پر دست درازی کر کے ان انقلابوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو سیاسی کہلاتے ہیں۔ ابھی تک جتنے بھی انقلاب ہوئے ہیں، ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کی ملکیت کی دوسری طرح کی ملکیت سے حفاظت کریں۔ اور ایک طرح کی ملکیت کی حفاظت وہ دوسری طرح کی ملکیت پر حملہ کئے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ فرانس کے

انقلاب عظیم میں بورژوا ملکیت کو بچانے کے لئے جاگیردارانہ ملکیت کو قربان کر دیا گیا۔ سولون کے انقلاب میں قرضداروں کی ملکیت کو فائدہ پہونچانے کے لئے مہاجنوں کی ملکیت کو نقصان پہونچانا پڑا۔ قرضوں کو سیدھے سیدھے منسوخ کر دیا گیا۔ مفصل واقفیت ہمیں نہیں ہے لیکن سولون نے اپنی نظموں میں بڑے فخر کے ساتھہ کہا ہے کہ اس نے رہن‌نامہ کی تختیاں کھیتوں سے ہٹوا دیں اور ان سب لوگوں کو اپنے وطن لوٹ جانے کا موقع دیا ہے جو قرض کی بدولت گھر چھوڑکر بھاگ گئے تھے یا جو غیرملکوں میں بیچ دئے گئے تھے۔ یہ بات ملکیت کے اختیارات پر کھلے عام چوٹ کئے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جو سیاسی انقلاب کہے جاتے ہیں، پہلے سے لےکر آخری تک، ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کی ملکیت کی حفاظت کرنے کے لئے دوسری طرح کی ملکیت کو ضبط کریں — جن کو چوری کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ پچیس سو برس سے ذاتی ملکیت کی حفاظت کرنے کے لئے ملکیت کے حقوق اور اختیاروں کو روندا جا رہا ہے۔

لیکن اب اس بات کی بھی تدبیر کرنی تھی کہ ایتھنز کے آزاد شہریوں کو دوبارہ غلام نہ بنایا جا سکے۔ شروع میں اس کے لئے کچھہ عام ڈھنگ کے قدم اٹھائے گئے۔ مثال کے لئے ایسے اقرارناموں پر روک لگا دی گئی جن میں خود قرضدار کو رہن یا گروی رکھہ دیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک حد طے کر دی گئی جس سے زیادہ زمین کسی کے پاس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ امراء کی کسانوں کی زمین پر قبضہ کرنے کی ہوس پر کسی حد تک تو پابندی لگائی جائے۔ اس کے بعد دستوری ترمیمیں (Verfassung) کی گئیں جن میں ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم یہ ہیں:

کاؤنسل کے ممبروں کی تعداد بڑھاکر چار سو کر دی گئی۔ ہر قبیلے سے سو سو ممبر کاؤنسل میں رہے۔ چنانچہ اس معاملے میں قبیلے ہی کو بنیاد مان لیا گیا۔ لیکن پرانے دستور کی یہی ایک بات تھی جسے نئی ریاست کے دستور میں قائم رکھا گیا تھا۔ باقی باتوں میں سولون نے شہریوں کو ان کی زمین اور اسکی پیداوار کی مقدار کی بنیاد پر چار طبقوں میں بانٹ دیا تھا۔ پہلے تین طبقوں میں وہ لوگ رکھے گئے تھے جن کی زمین سے کم سے کم پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو میڈمنی (medimni) اناج پیدا ہوتا تھا (ایک میڈمنی تقریباً ٤١ لٹر کے برابر ہوتا ہے)۔ جن لوگوں کے پاس اس سے بھی کم زمین تھی یا بالکل نہیں تھی، انہیں چوتھے طبقہ میں رکھا گیا تھا۔ سرکاری عہدوں پر صرف پہلے تین طبقوں کے لوگوں کو ہی مقرر کیا جا سکتا تھا۔ سب سے اونچے عہدے پہلے طبقہ کے لوگوں کو ملتے تھے۔ چوتھے طبقہ کو صرف عوامی اسمبلی میں بولنے اور ووٹ دینے کا حق تھا۔ لیکن تمام عہدہ دار اسی اسمبلی میں چنے جاتے تھے، اسی کے سامنے وہ اپنے کاموں کے لئے جواب دہ تھے، سارے

قانون بھی یہی اسمبلی بناتی تھی اور اس اسمبلی میں اکثریت چوتھے طبقہ کے لوگوں کی ھی تھی۔ شرفاء کے طبقہ کے مخصوص اختیارات کو کسی حد تک دولت کے اختیارات کی شکل میں دوبارہ قائم کر دیا گیا تھا لیکن فیصلہ کن طاقت عوام کے ھاتھوں میں رھی۔ فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے میں بھی انہیں چار طبقوں کو بنیاد بنایا گیا۔ پہلے دو طبقوں سے سوار فوج کے لوگ لئے جاتے تھے۔ تیسرے طبقے کو زرہ بند پیدل فوج کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اور چوتھے طبقہ کو یا تو معمولی پیدل فوج کا کام کرنا پڑتا تھا جس کے پاس زرہ بکتر نہیں ھوتے تھے یا انہیں سمندری فوج میں بھرتی کر دیا جاتا تھا۔ چوتھے طبقہ کے لوگوں کو شاید اس کام کے لئے اجرت بھی دی جاتی تھی۔

اس طرح دستور میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ھو گیا تھا اور وہ عنصر تھا، ذاتی ملکیت۔ شہریوں کے حقوق اور فرائض زمین کی ملکیت کی بنیاد پر طے کئے گئے اور جیسے جیسے ملکیت والے طبقوں کا اثر بڑھتا گیا، ویسے ویسے پرانے، یک جدی خون کے رشتوں (سگوتر) کی بنیاد پر بنے ھوئے گروہ پس منظر میں پڑ گئے۔ گن دستور کو ایک اور شکست ھوئی۔

لیکن ملکیت کے مطابق سیاسی حقوق کی درجہ بندی ریاست کے لئے کوئی لازمی چیز نہیں تھی۔ ریاستوں کی دستوری تاریخ میں اس کی جو بھی اھمیت ھو، لیکن بہت سی ریاستیں

اور ان میں بھی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاستیں اس قسم کی درجہ بندی کے بغیر ہی کام چلاتی تھیں۔ ایتھنز میں بھی اس کی اہمیت عارضی تھی۔ رسطائدیز کے زمانہ سے تمام عہدے سبھی طرح کے شہریوں کو ملنے لگے تھے۔

اگلے اسی برسوں میں ایتھنز کے سماج نے وہ راستہ اختیار کر لیا جس پر چل کر آئندہ کئی صدیوں تک اس کا ارتقا ہوتا رہا۔ سولون سے پہلے کے زمانہ میں سودخور جس طرح زمین پر قبضہ کر لیا کرتے تھے، اس پر روک لگائی گئی، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کے پاس بہت زیادہ زمین اکٹھا ہونے سے روکی گئی۔ تجارت اور دستکاری اور طرح طرح کے فائدہ‌مند ہنر اور فن اہم پیشے بن گئے جن کی بنیاد غلاموں کی محنت تھی اور جو زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر منظم کئے جا رہے تھے۔ سماج میں تعلیم اور روشن خیالی کو ترقی ہوئی۔ خود اپنے شہری بھائیوں کا پرانے بہیمانہ طریقے سے استحصال کرنے کے بجائے، ایتھنز کے باشندے زیادہ تر اپنے غلاموں کا اور اپنے غیرملکی گاہکوں کا استحصال کرنے لگے۔ منقولہ جائداد، یعنی وہ دولت جو زر نقد، غلام اور جہاز کی شکل میں تھی، برابر بڑھتی گئی۔ لیکن پہلے زمانہ میں، باوجود اس کی تمام حدود اور خامیوں کے، اگر دولت محض زمین خریدنے کا ایک ذریعہ تھی، تو اب دولت جمع کرنا خود ایک مقصد بن گیا۔ ایک طرف تو اس سے نیا، دولت‌مند، صنعتی اور تجارتی طبقہ، شرفا کے طبقے کی

پرانی طاقت کا کامیابی کے ساتھہ مقابلہ کرنے لگا تھا اور دوسری طرف پرانے گن دستور کی آخری بنیاد بھی ختم ہو گئی۔ اس طرح پرانے گن، فریٹریاں اور قبیلے جن کے ممبر سارے اٹیکا میں بکھرے ہوئے تھے اور آپس میں گھل مل گئے تھے، سیاسی اداروں کی حیثیت سے بالکل بےکار ہو گئے۔ ایتھنز کے بہت سے شہری کسی بھی گن کے ممبر نہیں تھے۔ وہ بدیسوں سے آئے ہوئے لوگ تھے جو شہری تو بن گئے تھے مگر ان پرانے اداروں میں شریک نہیں ہو پائے تھے جو یک جدی قرابت (سگوتری) کی بنیاد پر بنے تھے۔ اس کے علاوہ غیرملکوں سے آئے ہوئے ایسے لوگوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی جا رہی تھی جنہیں صرف تحفظ حاصل تھا۔

اس دوران میں مختلف پارٹیوں کی جدوجہد جاری رہی۔ شرفاء کا طبقہ اپنے مخصوص اختیارات کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کچھہ دنوں کے لئے اس کا غلبہ قائم بھی ہؤا۔ لیکن (۵۰۹ ق-م-میں) کلائستھینز کے انقلاب نے انہیں اکھاڑ پھینکا، اور ان کے ساتھہ ساتھہ گن دستور کے آخری بچے کھچے آثار بھی مٹ گئے۔

کلائستھینز نے اپنے نئے دستور میں گنوں اور فریٹریوں کی بنیاد پر بنے ہوئے پرانے چار قبیلوں کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ ان کی جگہ ایک بالکل نئی تنظیم نے لے لی جس میں شہریوں کو صرف ان کی بود و باش کی جگہ کی بنیاد پر بانٹا گیا تھا، جیسا کہ پہلے نوکریوں کے ذریعہ کرنے کی

کوشش کی گئی تھی۔ اب فیصلہ‌کن بات یہ نہیں تھی کہ کوئی شخص کس یک‌جدی (سگوتر) گروہ کا رکن ہے بلکہ فیصلہ‌کن بات یہ تھی کہ وہ کس علاقہ کا رہنےوالا ہے۔ اب لوگوں کو نہیں بلکہ علاقوں کو تقسیم کیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے اب لوگوں کی اہمیت صرف یہ تھی کہ وہ کسی علاقہ سے وابستہ تھے۔

پورا اٹیکا ایک سو خودحکومتی قصبات یا بلدوں میں بانٹ دیا گیا۔ انہیں دیم کہا جاتا تھا۔ ہر دیم کے شہری (دیموت) اپنا ایک مکھیا (دیمارک)، ایک خزانچی اور چھوٹے چھوٹے معاملوں کو طے کرنے کے لئے تیس قاضی منتخب کرتے تھے۔ ہر دیم کے شہریوں کا اپنا الگ مندر اور دیوتا یا ہیروس (heros) ہوتا تھا، جس کے پجاریوں کو چنا جاتا تھا۔ دیم میں اقتدار اعلی دیموتوں کی اسمبلی کے ہاتھہ میں ہوتا تھا۔ مارگن نے صحیح کہا ہے کہ یہ امریکہ کے خودحکومتی بلدی نظم و نسق کی ہی دوسری شکل تھی۔ موجودہ ریاست اپنے ارتقا کی آخری منزل پر پہونچ کر اسی اکائی پر ختم ہو جاتی ہے جس کے ساتھہ ایتھنز میں ریاست کا آغاز ہؤا تھا۔

ان دس اکائیوں (دیموں) کو ملاکر ایک قبیلہ بنتا تھا۔ مگر یہ قبیلہ پرانے گن دستور کے مطابق بنے ہوئے قبیلے (Geschlechtsstamm) سے بالکل مختلف تھا اور مقامی قبیلہ (Ortsstamm) کہلاتا تھا۔ یہ مقامی قبیلہ اپنی حکومت آپ چلانے والا

ایک سیاسی گروہ ھی نہیں تھا بلکہ ایک فوجی گروہ بھی تھا۔ وہ ایک فائیلارک یعنی قبیلہ کا سردار چنتا تھا جو سوار فوج کا کماندار ھوتا تھا، ایک ٹیکسیارک چنتا تھا جو پیدل فوج کا کماندار ھوتا اور ایک اسٹریٹی جوس چنتا تھا جو اس پوری فوج کا، جو اس قبیلہ کے علاقہ میں بھرتی کی جاتی تھی، کماندار ھوتا تھا۔ اس کے علاوہ ھر قبیلہ پانچ جنگی جہاز، ان کو چلانے والے جہازی سپاھی اور کماندار مہیا کرتا تھا ۔ ھر قبیلہ کو ایک اٹیکی دیوتا یعنی ھیروس دے دیا گیا تھا جس کے نام سے قبیلہ جانا جاتا تھا اور جو اس قبیلے کی حفاظت کرتا تھا۔ اور آخری بات یہ کہ یہ مقامی قبیلہ ایتھنز کی کاؤنسل کے لئے پچاس ممبر چنتا تھا۔

کل ملاکر جو چیز بنی، وہ تھی ایتھنز کی ریاست۔ اس کی حکومت پانچ سو آدمیوں کی ایک کاؤنسل چلاتی تھی جس کو دس قبیلے چنتے تھے۔ حکومت کا مکمل اختیار اس سے بھی اوپر عوامی اسمبلی کو تھا جس میں ایتھنز کا ھر شہری شریک ھو سکتا اور ووٹ دے سکتا تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں اور عدالتوں کا کام آرکون اور دوسرے عہدہ دار کیا کرتے تھے۔ ایتھنز میں ایسا کوئی عہدہ دار نہیں تھا جو اعلی ترین انتظامیہ اقتدار کا مالک ھو۔

اس نئے دستور کے ذریعہ اور بہت سے محکوم لوگوں (Schutzverwandter) کو جن میں سے کچھہ باھر سے آئے ھوئے تھے اور کچھہ ایسے غلام تھے جنھیں آزاد کر دیا گیا تھا، شہریوں میں شامل کرکے گن دستور کے اداروں کو امور عامہ

کے دائرے سے ختم کر دیا گیا۔ وہ اب نجی غیر سرکاری
ادارے اور مذہبی جماعتیں بن کر رہ گئے۔ لیکن ان کا اخلاقی
اثر، قدیم گن دستور کے زمانہ کے روایتی خیالات اور تصورات،
بہت دنوں تک زندہ رہے اور رفتہ رفتہ کرکے بہت دنوں
میں مٹے۔ ریاست کے ایک بعد کے ادارے میں یہ بات اچھی
طرح ظاہر ہوئی۔

ہم یہ دیکھہ چکے ہیں کہ ریاست کی ایک ضروری
خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اقتدار عامہ ہے جو عام
لوگوں سے الگ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں ایتھنز میں صرف
ایک عوامی فوج اور ایک جہازی بیڑا تھا جن کے لئے سیدھے
عوام میں سے ہی لوگوں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور عوام ہی ان
کو ہتھیاروں اور ساز و سامان سے لیس کرتے تھے۔ یہی
فوجیں دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرتی تھیں اور غلاموں
کو دبائے رکھتی تھیں۔ اس زمانہ تک غلام آبادی کی اکثریت
بن چکے تھے۔ شہریوں کے لئے شروع میں اس اقتدار عامہ
کا وجود محض پولس کی شکل میں تھا۔ پولس اتنی ہی پرانی
چیز ہے جتنی پرانی ریاست۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں
صدی کے بھولے بھالے فرانسیسی لوگ متمدن قوموں کا نہیں
بلکہ پولس کے ذریعہ منظم قوموں (nations policées) کا ذکر
کرتے تھے۔ اس طرح اپنی ریاست قائم کرنے کے ساتھہ ساتھہ
ایتھنز کے باشندوں نے اپنی پولس بھی بنا ڈالی جس کو تیر کمان
سے لیس پیدل اور سوار سپاہیوں کا دستہ کہنا غلط نہ ہوگا۔

جنوبی جرمنی اور سوئزرلینڈ کی زبان میں کہا جائے تو ایتھنز والوں نے اپنی لینڈ جاگر (Landjäger) بنا ڈالی تھی۔ اس پولس کے سپاھی سب غلام تھے۔ ایتھنز کے آزاد شہری پولس کے کام کو اتنا نیچا سمجھتے تھے کہ ایک ھتھیار بند غلام کے ھاتھوں گرفتار ھونا انہیں پسند تھا مگر یہ پسند نہیں تھا کہ خود اس نفرت انگیز کام کو کریں۔ یہ قدیم گن والی ذھنیت کا ھی اظہار تھا۔ پولس کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن ریاست کی عمر ابھی بہت تھوڑی تھی اور اس کی اتنی اخلاقی ساکھہ نہیں تھی کہ ایک ایسے پیشے کو یعنی پولس کے کام جس کو قدیم گن والے لوگ حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، عزت کا کام بنا سکتی۔

اس طرح ریاست کا ڈھانچہ اور اس کے نمایاں نقوش مکمل ھو چکے تھے۔ وہ ایتھنز کے باشندوں کی نئی سماجی حالت میں کتنی مناسب اور موزوں چیز تھی یہ اس بات سے ظاھر ھے کہ اس کے قائم ھونے کے بعد دولت، تجارت اور صنعت و حرفت کو بڑی تیزی سے ترقی ھوئی۔ اب جس طبقاتی تضاد پر سماجی اور سیاسی اداروں کی بنیاد تھی، وہ شرفاء اور عام لوگوں کا تضاد نہیں تھا بلکہ غلاموں اور آزاد شہریوں کا، محکوموں اور شہریوں کا تضاد تھا۔ جب ایتھنز اپنی دولت اور خوش‌حالی کے عروج پر تھا، تب اس کے آزاد شہریوں کی کل تعداد جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، تقریباً ۹۰۰۰۰ تھی، غلام عورتوں اور مردوں کی تعداد ۳۶۵۰۰۰ تھی اور محکوم لوگوں کی تعداد جس میں غیرملکوں

سے آئے ہوئے لوگ اور آزاد کئے ہوئے غلام دونوں شامل تھے، ۴۵۰۰۰ تھی۔ اس طرح ہر بالغ مرد شہری پر کم سے کم اٹھارہ غلام اور دو سے زیادہ محکوم لوگ تھے۔ غلاموں کی اتنی بڑی تعداد کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے کمروں میں بہت سے غلاموں کو ایک جگہ جمع ہو کر اوورسیر یا ناظر کی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ چند آدمیوں کے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہوتی گئی۔ زیادہ تر آزاد شہری غریبی اور افلاس کے گڑھے میں گر گئے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے: یا تو دستکاری کا کام شروع کریں اور اس طرح غلاموں کی محنت کا مقابلہ کریں جو کہ آزاد شہریوں کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور جس میں کامیابی کی امید بھی بہت کم تھی، اور یا تباہ ہوکر دیوالیہ ہو جائیں۔ اس زمانہ میں جیسے حالات تھے، ان میں تباہ ہونے والی ہی بات ہوئی۔ اور چونکہ ان کی بڑی تعداد تھی اس لئے ان کے دیوالیہ بننے کے ساتھ ساتھ ایتھنز کی پوری ریاست برباد ہو گئی۔ ایتھنز کے زوال کی وجہ جمہوریت نہیں تھی جیسا کہ یورپ کے اسکول ماسٹر جو بادشاہوں کے تلوے چاٹتے ہیں، ہمیں بتایا کرتے ہیں۔ اس کا زوال غلامی کی وجہ سے ہوا جس کی بدولت آزاد شہریوں کی محنت بری چیز سمجھی جانے لگی۔

ایتھنز کے لوگوں میں ریاست کا ظہور جس طرح ہؤا وہ عام طور پر ریاست کے بننے کی ایک ٹھیٹ مثال ہے کیونکہ اس کا ظہور وہاں، ایک طرف تو خالص شکل میں ہؤا جس میں بیرونی یا اندرونی تشدد نے کبھی دخل اندازی نہیں کی (پیسیستراتس کے غصب کا زمانہ بہت تھوڑے دنوں رہا اور اس کے ختم ہونے کے بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا) اور دوسرے وہ ریاست کی ایک نہایت ترقی یافتہ شکل، جمہوری ری‌پبلک کا نمونہ ہے جو براہ راست گن سماج سے نکلی تھی۔ اور آخری بات یہ کہ ہم اس کی تمام ضروری تفصیلات سے واقف ہیں۔

۶

روم میں گن اور ریاست

روما کے قائم ہونے کے بارے میں جو روایت چلی آ رہی ہے اس کے مطابق پہلی بستی متعدد لاطینی گنوں نے بسائی تھی (روایت ہے کہ ان کی تعداد سو تھی) جو مل کر ایک قبیلہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد ایک سیبیلین قبیلہ وہاں آ کر رہنے لگا۔ اس میں بھی ایک سو گن تھے۔ آخر میں مختلف قسم کے لوگوں کا ایک تیسرا قبیلہ بھی آ کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور اس میں بھی سو گن تھے۔ اس پورے قصہ پر ایک نظر ڈالتے ہی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہاں گن کے سوا شاید ہی کوئی چیز فطری ارتقا کی پیداوار مانی جا سکتی ہے۔ اور گن بھی اکثر ایک ہی مادری گن کی شاخیں ہوتے تھے اور وہ مادری گن اس وقت بھی اپنی پرانی جگہ پر بسا ہؤا تھا۔ قبیلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بناوٹی ڈھنگ سے بنائے گئے ہیں۔ پھر بھی زیادہ تر ان میں ایسے عنصر شامل ہوتے تھے جو ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے تھے اور ان کو پرانے زمانہ کے قبیلوں کے نمونہ پر بنایا

گیا تھا جو بناوٹی ڈھنگ سے نہیں بلکہ قدرتی طور پر بڑھ کر بنے تھے۔ بلکہ یہ ناممکن نہیں ہے کہ ان تینوں قبیلوں میں سے ہر ایک کے مرکزہ کا کام کسی پرانے اصلی قبیلے نے کیا ہو۔ قبیلے اور گن کے درمیان کی کڑی فریٹری تھی جس میں دس گن ہوتے تھے اور وہ یہاں «کیوریا» کہلاتی تھی۔ چنانچہ ان کی کل تعداد تیس تھی۔

اسے سب مانتے ہیں کہ روما کے باشندوں کا گن اور یونانیوں کا گن ایک ہی چیز تھی۔ اگر یونانیوں کا گن اسی سماجی اکائی کا سلسلہ تھا جس کی ابتدائی شکل ہمیں امریکہ کے ریڈ انڈینوں میں دکھائی دیتی ہے تو ظاہر ہے کہ رومی گن کے بارے میں یہی بات صادق آتی ہے۔ اس لئے ہم اس کے بیان میں اور بھی اختصار سے کام لے سکتے ہیں۔

شہر روم کے کم سے کم سب سے ابتدائی زمانہ میں رومی گن کا مندرجۂ ذیل دستور تھا:

۱۔ ایک دوسرے کی ملکیت وراثت میں پانے کا حق گن کے ممبروں کو تھا۔ ملکیت گن کے اندر ہی رہتی تھی۔ یونانی گن کی طرح رومی گن میں بھی چونکہ پدری حق قائم ہو چکا تھا، اس لئے عورتوں کی نسل کے لوگ اس حق سے محروم کر دئے گئے تھے۔ بارہ جدول والے قانون کے مطابق، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے روما کا سب سے پرانا لکھا ہؤا قانون یہی ہے، جب کوئی شخص مرتا تھا تو اس کی جائداد پر سب سے پہلے اس کی اپنی اولاد کا حق ہوتا تھا۔ اگر کسی شخص کی اپنی اولاد نہیں ہوتی تو جائداد اگناتیوں

کو (یعنی باپ کی طرف کے مرد رشتہ داروں کو) ملتی تھی۔ اور اگر اگناتی بھی نہ ھوں تو جائداد پر مرنے والے کے گن کے لوگوں کا حق ھوتا تھا۔ ھر حالت میں جائداد گن کے اندر رھتی تھی۔ یہاں ھم دیکھتے ھیں کہ دھن دولت کے بڑھہ جانے اور یک زوجگی کا رواج ھو جانے کی وجہ سے گن دستور کے عمل میں رفتہ رفتہ کچھہ نئے قانون قاعدے داخل ھو گئے تھے۔ پہلے مرنے والے کی جائداد پر گن کے سبھی ممبروں کا یکساں حق ھوتا تھا۔ پھر عملاً یہ حق اگناتیوں تک ھی محدود کر دیا گیا۔ یہ شاید بہت دن پہلے کی بات ھے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے۔ بعد میں یہ حق مرنے والے کی اولاد اور آخرالذکر کی مرد اولاد تک ھی محدود ھو گیا۔ لیکن ظاھر ھے کہ بارہ جدول والے قانون میں یہ بات الٹے سلسلہ سے دی گئی ھے۔

۲ ۔ ھر گن کا ایک مشترک قبرستان ھوتا تھا۔ جب کلوڈیا نامی ایک شرفاء کا (پیٹریشین) گن ریگیلی سے روم میں آ بسا تو اس کو شہر میں زمین کا ایک قطعہ اور ایک مشترک قبرستان ملا۔ آگسٹس کے زمانہ میں بھی جب ٹیوٹوبرگ کے جنگل میں وارس مارا گیا تو اس کے سر کو روم میں لاکر جینٹلیٹیئس ٹیومولس (gentilitius tumulus)* میں دفن کر دیا گیا جس کا مطلب یہ ھے کہ اس کے گن (کوئنک ٹیلیا گن) کے پاس اس زمانہ میں بھی اپنا الگ قبرستان تھا۔

---

* گن کا ٹیلہ۔ (اڈیٹر۔)

۳- گن کے لوگ مل کر مذہبی تیوہار اور رسمیں منایا کرتے تھے- یہ سیکرا جنٹی لیٹیا (sacra gentilitia) کہلاتی تھیں اور کافی مشہور ہیں-

٤- گن کے ممبر گن کے اندر شادی نہیں کر سکتے تھے- روم میں اس پابندی نے کبھی باقاعدہ لکھے ہوئے قانون کا درجہ حاصل نہیں کیا مگر ایک رواج کے طور پر لوگ اسے مانتے رہے- روم کے بےشمار شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے نام ہمیں معلوم ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں شوہر اور بیوی دونوں کے گن کا نام ایک ہو- وراثت کے قانون سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے- شادی ہو جانے پر عورت اگناتیوں کے حق سے محروم ہو جاتی تھی، اپنے گن سے الگ ہو جاتی تھی اور اس کا یا اس کے بچوں کا اس کے باپ اور باپ کے بھائیوں کی جائداد پر کوئی حق نہیں ہوتا تھا- وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے باپ کی جائداد باپ کے گن کے باہر چلی جاتی- ظاہر ہے کہ اس قاعدے کا کوئی مطلب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم یہ مان لیں کہ عورت کو خود اپنے گن کے کسی ممبر سے شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی-

۵- زمین گن کی مشترکہ ملکیت تھی- قدیم زمانہ میں ہمیشہ یہی قاعدہ تھا- پھر قبیلہ کی زمین پہلی بار تقسیم کی گئی- لاطینی قبیلوں میں ہم پاتے ہیں کہ زمین کسی حد تک قبیلے کی ملکیت تھی، کسی حد تک گن کی ملکیت تھی اور کسی حد تک الگ الگ کنبوں کی- ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں

ایک کنبہ یا گھرانے کا مطلب ایک خاندان نہیں تھا۔ کہا جاتا ھے کہ سب سے پہلے رومولس نے الگ الگ افراد کو ایک ھیکٹر (دو جگیرا) فی کس کے حساب سے زمین بانٹی تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی ہم پاتے ھیں کہ کچھہ زمین گن کے پاس رہ گئی۔ اور ریاستی زمین کا تو ذکر ھی کیا ھے۔ روما کی جمہوریت کی ساری اندرونی تاریخ اسی ریاستی زمین کے محور پر گھومتی رھی ھے۔

٦۔ گنوں کے ممبروں کا فرض ھوتا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور کسی کا کوئی نقصان ھو جانے پر اس کی تلافی کی کوشش کریں۔ لکھی ھوئی تاریخ میں اس قاعدے کے کچھہ بچے بچائے اثرات ھی ملتے ھیں۔ رومی ریاست نے شروع ھی سے اتنی اعلی طاقت کا اظہار کیا تھا کہ نقصانوں کی تلافی کی ذمہ داری اسی کے اوپر آ پڑی تھی۔ جب ایپیئس کلوڈیئس گرفتار ھو گیا تھا تو اس کے پورے گن نے حتیٰ کہ اس کے ذاتی دشمنوں نے بھی، غم کے آنسو بہائے تھے۔ دوسری پیونک* جنگ کے موقع پر مختلف گن اپنے ممبروں کو، جو قید کر لئے گئے تھے، تاوان دے کر رہا کرانے کے لئے ایک ھو گئے تھے۔ لیکن سینیٹ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

---

* پیونک۔ رومیوں اور پونوں — یعنی شمالی افریقہ میں واقع شہر کارتھیج کے باشندوں — کے درمیان جو جنگ ٢٦٤ ق-م-سے ١٤٦ ق-م-تک ھوئی تھی وہ پیونک جنگ کہلاتی ھے۔ (اڈیٹر۔)

۷۔ گن کے ممبروں کو اختیار تھا کہ وہ گن کا نام استعمال کریں۔ اس قاعدہ پر شہنشاہوں کے وقت تک عمل ہوتا رہا۔ جو غلام آزاد کر دئیے جاتے تھے، ان کو اپنے سابق مالکوں کے گن کا نام اختیار کرنے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ لیکن انہیں گن کے ممبروں کے اختیارات نہیں ملتے تھے۔

۸۔ گن کو اختیار تھا کہ اجنبیوں کو اپنا ممبر بنا لے۔ یہ انہیں کسی خاندان کا ممبر بنا کر کیا جا سکتا تھا (ریڈ انڈینوں میں بھی یہی رواج تھا)۔ خاندان کا ممبر بن جانے پر انہیں گن کی ممبری بھی مل جاتی تھی۔

۹۔ سرداروں کو چننے اور برطرف کرنے کے اختیار کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن روم کے ابتدائی زمانہ میں منتخب بادشاہ سے لے کر نیچے تک کے سبھی عہدے انتخاب یا تقرر کے ذریعہ پر کئے جاتے تھے اور چونکہ مختلف «کیوریا» اپنے پروہتوں اور پجاریوں کو بھی چنا کرتی تھیں، اس لئے ہمارے لئے یہ مان لینا مناسب ہوگا کہ گنوں کے سرداروں یا پرنسیپیوں (principes) کو بھی اسی طرح مقرر کیا جاتا تھا، خواہ انہیں ایک ہی خاندان کے لوگوں میں سے چننے کا قاعدہ پوری طرح کیوں نہ مانا جاتا رہا ہو۔

یہ تھے رومی گن کے اختیارات۔ ایک پدری حق والی مکمل تبدیلی کو چھوڑکر یہ ہوبہو وہی تصویر ہے جو ایروکواس گن کے حقوق اور فرائض کے بارے میں ہمیں ملی تھی۔ یہاں بھی «ایروکواس ہمیں صاف دکھائی پڑتا ہے»۔

روم کے گن نظام کے بارے میں ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ مستند اور باوثوق مورخوں میں بھی کس طرح کی غلط فہمیاں اور الجھنیں پھیلی ہوئی ہیں، اس کی ایک مثال یہ ہے: جمہوری اور آگسٹینین عہد کے شخصی ناموں کے بارے میں مومسن نے جو مقالہ لکھا ہے («رومی تحقیقات» ــ برلن ۱۸٦٤ء ــ جلد ۱ ــ*)، اس میں اس نے کہا ہے: «گن کا نام نہ صرف گن کے سبھی مرد ممبر استعمال کرتے ہیں، جن میں وہ اجنبی بھی شامل ہیں جو گن کے ممبر بنا لئے گئے ہیں یا جو گن کی پناہ میں رہتے ہیں، بلکہ عورتیں بھی اس کو استعمال کرتی ہیں۔ ہاں، صرف غلاموں کو گن کا نام استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی... قبیلہ (Stamm، جیسا کہ مومسن نے گن کا ترجمہ کیا ہے)... ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جس کے ممبروں کو ایک ہی مورث اعلی کی نسل سے مانا جاتا ہے اور ایک ہی رسم و رواج، ایک قبرستان اور وراثت کے ایک ہی سے قاعدے اسے متحد کئے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مشترک مورث اعلی واقعی کوئی شخص ہو یا اسے محض فرض کر لیا گیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مشترک مورث اعلی کو زبردستی گھڑ لیا گیا ہو۔ انفرادی طور پر سب آزاد افراد کو اور اس لئے عورتوں کو بھی، گن کے ممبروں کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانا پڑتا تھا۔ لیکن کسی شادی شدہ

* Mommsen Th , Römische Forschungen. Ausg. 2. Bd. I—II. Berlin, 1864—1878. (اڈیٹر ــ)

عورت کا گن کا نام طے کرنے میں کچھہ مشکل ہوتی ہے۔
ظاہر ہے کہ جب تک یہ قاعدہ تھا کہ عورتیں اپنے گن کے
ممبروں کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کر سکتی تھیں، تب
تک ان کا گن کا نام طے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی
تھی۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک
عورتوں کے لئے گن کے باہر شادی کرنا، اپنے گن کے اندر
شادی کرنے کے مقابلہ میں بہت دشوار ہوتا تھا۔ چھٹی صدی
تک بھی یہ «جنٹس انپٹیو» (gentis enuptio) یا گن سے باہر شادی
کرنے کا حق بعض خاص اشخاص کو مخصوص ذاتی حق یا
انعام کے طور پر دیا جاتا تھا... لیکن ابتدائی زمانہ میں جب
کبھی عورتوں کا اپنے قبیلے کے باہر بیاہ ہوتا ہوگا تب انہیں
اپنے شوہر کے قبیلے میں شامل کر دیا جاتا ہوگا۔ اس سے
زیادہ یقین کے ساتھہ اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ
قدیم مذہبی شادی کے ذریعہ سے عورت پوری طرح سے اپنے
شوہر کی قانونی اور مذہبی رسوم کی برادری میں شامل ہو
جاتی تھی اور خود اپنی ایسی برادری کو چھوڑ دیتی تھی۔
یہ کون نہیں جانتا کہ شادی شدہ عورت نہ تو اپنے گن کے
رشتہ داروں کی جائداد وراثت میں پا سکتی ہے اور نہ اپنی
جائداد وراثت میں ان کے لئے چھوڑ سکتی ہے۔ جہاں تک
وراثت کا سوال ہے وہ اپنے شوہر، اپنی اولاد اور شوہر کے
گن کے رشتہ داروں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور
اگر اس کا شوہر اسے اپنی اولاد کی مانند قبول کر لے اور

اپنے خاندان میں شامل کر لے، تب وہ اس کے گن سے کیسے الگ رہ سکتی ہے؟» (صفحات ۹-۱۱)

اس طرح مومسن کا کہنا ہے کہ رومی عورتوں کو جو کسی ایک خاص گن کی رکن تھیں شروع میں صرف اپنے گن کے اندر ہی شادی کرنے کی آزادی تھی۔ مطلب یہ کہ مومسن کے خیال کے مطابق رومی گن گوت باہر شادی کرنے والے (exogamous) نہیں بلکہ گوت اندر شادی کرنے والے (endogamous) تھے۔ یہ رائے جوکہ تمام دوسری جاتیوں کے تجربے کے خلاف جاتی ہے، اگر بالکل نہیں تو بڑی حد تک لیوی کی محض ایک عبارت پر مبنی ہے جس کی صحت کے بارے میں ابھی کافی اختلاف ہے۔ لیوی کی تاریخ (جلد ۳۹، باب ۱۹) کی اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ روم کے قائم ہونے کے ۵۶۸ ویں برس میں یعنی ۱۸۶ ق-م- میں سینیٹ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ uti Feceniae Hispallae datio, deminutio, gentis enuptio, tutoris optio item esset quasi ei vir testamento dedisset; utigue ei ingenuo nubere liceret, neu quid ei qui eam duxisset, ob id fraudi ignominiaeve esset — فیسینیا ھسپلا کو اپنی جائداد کو چاھے جسے دے دینے کا، اسے کم کرنے کا، گن کے باھر شادی کرنے کا اور اپنا محافظ چننے کا اسی طرح حق ھوگا جس طرح اس حالت میں ھوتا اگر اس کا (متوفی) شوھر وصیت کرکے اسے یہ تمام اختیار دے گیا ھوتا۔ اسے کسی آزاد مرد کے ساتھہ شادی کرنے کی اجازت دی جاتی ھے اور جو مرد اس سے شادی کرے گا، اس کے لئے یہ کوئی غلط بات یا ذلت کی بات نہیں سمجھی جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ فیسینیا، جس کو غلامی سے آزاد کیا گیا تھا، اسے یہاں گن سے باھر شادی کرنے کی اجازت دی گئی ھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے مطابق، اس کے شوھر کو حق تھا کہ وصیت کر کے اپنی بیوی کو یہ اجازت دے کہ اس کے مرنے پر وہ گن کے باھر شادی کرے۔ لیکن سوال ھے کہ کس گن کے باھر؟

اگر ھر عورت کو اپنے گن کے اندر شادی کرنی پڑتی تھی، جیسا کہ مومسن مان کر چلتا ھے تو وہ شادی کے بعد بھی اسی گن میں رھتی تھی۔ لیکن ایک تو ابھی یہی ثابت کرنا باقی ھے کہ گن صرف اپنے اندر شادی کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ دوسرے اگر عورت کو اپنے گن کے اندر شادی کرنی پڑتی تھی تو مرد کے لئے بھی یہی ضروری تھا ورنہ اسے کوئی عورت ملتی ھی نہیں۔ تب اس کا مطلب یہ ھوتا ھے کہ وصیت کے ذریعہ مرد اپنی بیوی کو ایسا حق دے سکتا تھا جو خود اسے بھی حاصل نہیں تھا۔ قانونی نقطۂ نظر سے یہ ایک بالکل مہمل بات ھے۔ مومسن بھی یہ محسوس کرتا ھے اور اسی لئے یہ اٹکل لگاتا ھے: «بہت ممکن ھے کہ گن کے باھر شادی کرنے کے لئے نہ صرف ذی اقتدار شخص کی بلکہ گن کے سبھی ممبروں کی منظوری لینا ضروری ھو۔» (صفحہ ۱۰، حاشیہ)۔ ایک تو یہاں مومسن نے ایک بہت بڑی بات یونہی فرض کر لی ھے۔ دوسرے، مذکورۂ بالا عبارت میں جو بات صاف لکھی ھے، اس کی اس سے تردید ھوتی ھے۔ فیسینیا کو یہ اختیار اس کے شوھر کی جگہ پر سینیٹ دے رھی ھے۔

فیسینیا کا شوهر اس کو جو اختیار دے سکتا تھا، سینیٹ اسے نہ اس سے کم دے رهی هے اور نہ زیادہ ۔ لیکن سینیٹ جو کچھہ دے رهی هے وہ ایک مکمل اختیار هے، جس پر کوئی پابندی نہیں هے، تاکہ اگر فیسینیا اس اختیار کو استعمال کرے تو اس کے نئے شوهر کو کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ بلکہ سینیٹ موجودہ اور آئندہ کونسلوں اور پریٹروں کو یہ هدایت بھی دیتی هے کہ انہیں اس بات کا همیشہ خیال رکھنا چاهئے کہ اس اختیار سے کام لینے کی وجہ سے فیسینیا کو کوئی تکلیف نہ هو۔ اس لئے مومسن نے جو بات فرض کی هے وہ بالکل غلط معلوم هوتی هے۔

پھر مان لیجئے کہ کوئی عورت کسی دوسرے گن کے ممبر سے شادی کر لیتی هے، لیکن رهتی اپنے گن میں هی هے۔ مذکورۂ بالا واقعہ کے مطابق ایسی صورت میں اس کے شوهر کو اختیار هوگا کہ وہ اپنی بیوی کو گن کے باهر شادی کرنے کی اجازت دے دے۔ مطلب یہ کہ شوهر کو ایک ایسے گن کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کا اختیار هوگا جس کا کہ وہ خود ممبر نہیں هے۔ یہ بات اتنی نامعقول هے کہ اس کے بارے میں مزید کچھہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ایسی حالت میں همارے سامنے یہ مان کر چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رهتا کہ اپنی پہلی شادی کے ذریعہ عورت نے دوسرے گن کے مرد سے بیاہ کیا تھا اور ایسا کرنے پر وہ فوراً اپنے شوهر کے گن کی ممبر هو گئی۔ خود مومسن

بھی مانتا ہے کہ ایسی صورت میں یہی ہوتا تھا۔ اور یہ مانتے ہی گتھی اپنے آپ سلجھ جاتی ہے۔ عورت کو اس کی شادی نے اپنے گن سے علیحدہ کر دیا ہے اور وہ اپنے شوہر کے گن میں شامل ہو گئی ہے۔ اس نئے گن میں اس کی ایک مخصوص حیثیت ہو گئی ہے۔ وہ گن کی ممبر ہے مگر گن کے باقی لوگوں سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جس طریقے سے وہ گن کی ممبر بنائی گئی ہے، اس کی روشنی میں اس پر یہ روک نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ اپنے اس نئے گن کے اندر شادی نہ کرے کیونکہ وہ تو شادی کر کے ہی اس گن میں شامل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گن کی ایک شادی شدہ ممبر سمجھی جاتی ہے اور اپنے شوہر کے مرنے پر اس کی جائداد کا ایک حصہ پانے کی حقدار ہوتی ہے یعنی اس جائداد کو گن کے ایک ساتھی ممبر کی جائداد کہا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ قدرتی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ جائداد کو گن کے باہر نہ جانے دینے کی غرض سے عورت کے لئے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ اپنے پہلے شوہر کے گن کے کسی ممبر سے ہی شادی کرے اور دوسرے کسی گن کے آدمی سے شادی کرنے کا ارادہ نہ کرے؟ لیکن اگر اس قاعدہ سے کسی کو مستثنی کرنا ہے تو اس کی اجازت دینے کا حق اس آدمی سے یعنی عورت کے پہلے شوہر سے زیادہ اور کس کو ہوگا جو اپنی جائداد اس کے لئے چھوڑے جا رہا ہے؟ جس وقت وہ اپنی جائداد کا ایک حصہ اپنی بیوی کے نام وصیت کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے اس بات کی اجازت

دے دیتا ہے کہ وہ چاہے تو شادی کے ذریعہ یا شادی کے نتیجہ کے طور پر یہ جائداد کسی اور گن میں منتقل کر دے، تو اس وقت تک وہی اس جائداد کا مالک تھا۔ یعنی وہ حقیقتاً صرف اپنی جائداد کی وصیت کر رہا تھا۔ جہاں تک عورت کا اپنے شوہر کے گن کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، اسے گن میں لانے والا اس کا شوہر تھا جو اپنی مرضی سے شادی کر کے اسے اپنے گن میں لے آیا تھا۔ چنانچہ یہ بات بھی بالکل قدرتی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کو نئی شادی کر کے اس گن کو چھوڑ دینے کی اجازت دینے والا شخص اس کا شوہر ہی ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جوں ہی ہم رومی لوگوں کے گن کے بارے میں یہ عجیب خیال ترک کر دیتے ہیں کہ وہ اندر شادی کرنے والا گن تھا اور جوں ہی ہم مارگن کی طرح یہ مان لیتے ہیں کہ وہ باہر شادی کرنے والا گن تھا، ویسے ہی یہ سارا معاملہ بہت سیدھا اور صاف معلوم ہونے لگتا ہے۔

آخر میں، ایک اور بھی رائے ہے جس کے حامیوں کی تعداد شاید سب سے زیادہ ہے۔ اس رائے کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ لیوی کے مذکورۂ بالا اقتباس کا مطلب صرف یہ ہے کہ «جو لڑکیاں غلامی سے آزاد کی جاتی ہیں (libertae) وہ بغیر خاص اجازت (e gente enubere) کے، گن کے باہر شادی نہیں کر سکتیں اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہیں جس کا خاندانی حقوق کے خفیف ترین نقصان (capitis deminutio minima) سے تعلق ہونے کے نتیجہ میں لڑکی (liberta) گن سے علیحدہ ہو جائے۔» (لانگے، «رومی آثار قدیم»، برلن، ۱۸۵٦ء، حصہ ۱،

صفحہ ۱۹۵*۔ جو عبارت ہم نے نقل کی ہے اس میں ہشچکے کا ذکر کرتے ہوئے لیوی کے مذکورۂ بالا اقتباس پر رائےزنی کی گئی ہے)۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو لیوی کے اقتباس سے روم کی آزاد عورتوں کے بارے میں تو کچھہ بھی نہیں معلوم ہوتا اور تب یہ ماننے کی اور بھی کم بنیاد رہ جاتی ہے کہ روم کی آزاد عورتوں کو صرف اپنے گن کے اندر شادی کرنی پڑتی تھی۔

انپٹیو گنٹیس «enuptio gentis» (گن کے باہر شادی) کا فقرہ صرف اسی ایک عبارت میں استعمال ہؤا ہے۔ روم کے سارے ادب میں اور کہیں یہ لفظ نہیں ملتے۔ لفظ اینوبرے (enubere) جس کا مطلب باہر شادی کرنا ہوتا ہے، لیوی کی کتاب میں ہی تین مرتبہ ملتا ہے لیکن کہیں بھی اس کا استعمال گن کے سلسلہ میں نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بے بنیاد خیال کہ روم کی عورتوں کو صرف اپنے گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت تھی، محض اس ایک عبارت پر ٹکا ہؤا ہے۔ لیکن اس خیال میں ذرا بھی جان نہیں ہے کیونکہ یا تو اس عبارت میں آزاد کی ہوئی غلام عورتوں کی مخصوص پابندیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ایسی صورت میں اس سے ان عورتوں کے بارے میں کچھہ بھی ثابت نہیں ہوتا جو آزاد پیدا ہوئی تھیں (ingenuae) ۔ اور یا وہ عبارت ان عورتوں پر بھی لاگو

* Lange L., Römische Alterthümer. Bd. I—III, Berlin. 1856—1871. (اڈیٹر۔)

ہوتی ہے جو آزاد پیدا ہوئی تھیں اور ایسی حالت میں اس سے یہ زیادہ ثابت ہوتا ہے کہ گن کے باہر عورتوں کے شادی کرنے کا قاعدہ تھا اور شادی ہونے پر انہیں ان کے شوہروں کے گن میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ اقتباس مومسن کی رائے کے خلاف مارگن کی رائے کو تقویت پہونچاتا ہے۔

روم کے قائم ہونے کے تین سو برس بعد بھی گن کے بندھن اتنے مضبوط تھے کہ فے بین نامی ایک پٹریشین (شرفاء کے) گن نے سینیٹ سے اجازت لےکر پڑوس کے ویئی نامی شہر پر اکیلے ہی چڑھائی کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ تین سو چھہ فے بین چڑھائی کرنے نکلے تھے اور راستے میں چھپے ہوئے دشمن نے ان کا صفایا کر دیا۔ صرف ایک لڑکا زندہ بچا جس نے گن کو آگے چلایا۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، دس گن مل‌کر ایک فریٹری بنتی تھی جو روم میں کیوریا کہلاتی تھی اور اسے یونانی فریٹری سے زیادہ اہم ذمہ داریاں ادا کرنی ہوتی تھیں۔ ہر کیوریا کے الگ مذہبی رسم و رواج، تبرکات اور پروہت پجاری ہوتے تھے۔ یہ پروہت مل‌کر روم کی ایک پروہت منڈلی بناتے تھے۔ دس کیوریا مل کر ایک قبیلہ بنتا تھا جوکہ شروع میں دوسرے لاطینی قبیلوں کی طرح، شاید خود اپنا سردار چنا کرتا تھا۔ یہ سردار جنگ میں قبیلہ کی رہنمائی کرتا تھا اور ساتھہ ہی بڑے پروہت کا بھی کام کرتا تھا۔ تین قبیلے مل‌کر رومی جاتی پوپولس رومینس (populus romanus) کہلاتے تھے۔

اس طرح رومی جاتی میں صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے تھے جو کسی گن کے اور اس لئے کسی کیوریا اور قبیلے کے ممبر تھے ـ ان لوگوں کا پہلا دستور حسب‌ذیل تھا: امور عامہ کا انتظام سینیٹ کے ہاتھہ میں تھا ـ سینیٹ کے ممبر، جیسا کہ نیبور نے سب سے پہلے صحیح بتایا تھا، تین سو گنوں کے سردار ہوتے تھے ـ گنوں کے سرداروں کی حیثیت سے وہ باپ یا پاترے (patres) کہلاتے تھے اور ان سب کا بحیثیت ایک جماعت کے سینیٹ نام تھا (جس کا مطلب ہے بزرگوں کی جماعت، کیونکہ سینکس (senex) کا مطلب ہے بوڑھا) یہاں بھی چونکہ ہر گن کے سردار کو عام طور پر ایک مخصوص خاندان میں سے چننے کا رواج تھا اس لئے ان سے پہلا موروثی شرفاء کا طبقہ پیدا ہؤا ـ یہ خاندان اپنے کو پٹریشین کہتے تھے اور دعوی کرتے تھے کہ سینیٹ کا ممبر ہونے اور ریاست کے مختلف عہدوں پر مقرر ہونے کا حق صرف انہیں کو ہے ـ کچھہ دنوں بعد عوام نے ان کے اس دعوے کو مان لیا اور وہ ایک اصلی حق بن گیا ـ پرانی روایت کے مطابق یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ پہلی بار جو لوگ سینیٹ کے ممبر چنے گئے تھے ان کو اور ان کی آئندہ نسلوں کو رومولس نے پٹریشین (شرفاء کے) طبقہ کا مرتبہ اور اس کے کچھہ مخصوص حق عطا کئے ـ ایتھنز کی بولے (bulê) کی مانند رومی سینیٹ کو بھی بہت سے معاملوں میں فیصلہ کر دینے کا اختیار تھا ـ اور زیادہ اہم معاملوں میں، مثلاً کوئی نیا

قانون بنانے کا سوال اٹھنے پر، ابتدائی بحث سینیٹ میں ہوتی تھی اور فیصلہ عوامی اسمبلی میں کیا جاتا تھا جو کہ comitia curiata (کیوریاؤں کی اسمبلی) کہلاتی تھی۔ اسمبلی میں لوگ اپنی اپنی کیوریا کے ممبروں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ہر کیوریا میں شاید ایک ایک گن کے لوگ ساتھ بیٹھتے تھے اور سوالوں پر فیصلہ کرتے وقت تیسوں کیوریاؤں میں سے ہر ایک کا ایک ووٹ ہوتا تھا۔ کیوریاؤں کی یہ اسمبلی قانون منظور یا رد کرتی تھی، تمام اونچے عہدہ داروں کو چنتی تھی جن میں rex (نام‌نہاد باد شاہ) بھی ہوتا تھا، جنگ کا اعلان کرتی تھی (لیکن صلح سینیٹ کرتی تھی) اور ایک عدالت عالیہ کی حیثیت سے، فریقین کی اپیل پر، ان تمام مقدمات کو، جن میں رومی شہریوں کو موت کی سزا مل سکتی تھی، فیصل کرتی تھی۔ آخر میں سینیٹ اور عوامی اسمبلی کے ساتھ ساتھ rex ہوتا تھا جسے ٹھیک یونانی بیسیلیئس کی مانند سمجھنا چاہئے اور جو اس طرح کا مطلق‌العنان بادشاہ کبھی نہیں تھا جیسا کہ مومسن نے اسے بنا دیا ہے*۔ ریکس فوجی سالار کا، بڑے پروہت کا اور کچھ

* لاطینی زبان کا لفظ rex، کیلٹک آئرش زبان کے righ (قبیلے کا سردار) اور گوتھک زبان کے reiks سے ملتا جلتا ہے۔ جرمن زبان کے لفظ Fürst (انگریزی زبان کا first اور ڈینش کا förste) کی طرح اس لفظ کا بھی شروع میں یہی مطلب تھا۔ گن یا قبیلے کا سردار۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ چوتھی صدی تک گوتھ لوگوں

عدالتوں میں صدراعلی کا کام کرتا تھا۔اس پر کوئی دیوانی کی ذمہ‌داری نہیں تھی۔فوجی سالار کی حیثیت سے ڈسپلن قائم رکھنے کے اختیارات اور عدالتوں کے صدر کی حیثیت سے سزا دینے کے اختیار کے علاوہ اس کو شہریوں کی زندگی، ان کی آزادی اور ان کی جائداد پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ rex کا عہدہ موروثی نہیں تھا۔ اس کے برعکس شروع میں rex کا انتخاب ہؤا کرتا تھا۔ شاید اس کا پیش رو عہدہ دار اسے نامزد کرتا تھا اور کیوریاؤں کی اسمبلی اسے منتخب کرتی تھی اور ایک دوسرے اجلاس میں اسے باقاعدہ گدی پر بٹھایا جاتا تھا۔ اسے گدی سے ہٹایا بھی جا سکتا تھا اور یہ بات ٹارکوئی نیئس سوپربس کے انجام سے ثابت ہے۔

کے پاس بعد کے زمانہ کے بادشاہ کے لئے یعنی پوری جاتی کے فوجی سالار کے لئے ایک خاص لفظ ہو گیا تھا۔ وہ لفظ تھا: thiudans ۔ بائبل کے الفیلا کے ترجمہ میں آردشیر اور ہیرود کو کبھی reiks نہیں کہا گیا ہے بلکہ ان کو ہر جگہ thiudans کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اور شہنشاہ تائی‌بیرئس کی مملکت کو reiki نہیں کہا گیا ہے بلکہ تھیوڈی ناسس (thiudinassus) کہا گیا ہے۔ گوتھک تھیوڈانس یا بادشاہ کے نام میں، جیسا کہ ہم اکثر غلط ترجمہ کرتے ہیں، دو نام ساتھہ ساتھہ چلتے ہیں اور یہ دو نام ہیں تھیوڈیرائکس، تھیوڈورک یعنی ڈائٹریک۔ (اینگلس کا نوٹ۔)

سورمائی عہد کے یونانیوں کی طرح، نام نہاد بادشاہوں کے زمانہ کے رومی لوگ بھی ایک فوجی جمہوریت میں رہتے تھے جو گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں پر مبنی تھی اور اسی سے اس کی نشو و نما ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ کیوریا اور قبیلے ایک حد تک بناوٹی ڈھنگ سے قائم کئے گئے تھے لیکن انہیں اس سماج کے اصلی اور قدرتی نمونوں کے مطابق بنایا گیا تھا جس سماج سے وہ پیدا ہوئے تھے اور جو ان کے قائم ہونے کے وقت بھی چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے تھا۔ اور حالانکہ اس زمانہ تک پٹریشین شرفاء کے طبقہ کا، جس کی نشو و نما قدرتی طور پر ہو گئی تھی، کافی زور ہو گیا تھا اور حالانکہ ریکس یعنی بادشاہ لوگ اپنے اختیارات کا دائرہ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، پھر بھی اس سے دستور کی ابتدائی اور بنیادی شکل نہیں بدلتی۔ اور اہمیت اسی کی ہے۔

اسی دوران میں شہر روم اور رومی علاقے کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ فتوحات کے ذریعہ یہ علاقہ پھیل گیا تھا۔ اس میں نئے اور زیادہ‌تر لاطینی علاقے قبضہ کرکے ملا لئے گئے تھے۔ کچھ تو ان علاقوں کے لوگوں کی وجہ سے آبادی بڑھی اور کچھ یہ بھی ہؤا کہ باہر کے لوگ رومی علاقے میں آکر بس گئے۔ یہ ساری نئی رعایا (فی‌الحال ہم گاہکوں کے سوال سے بحث نہیں کر رہے ہیں) پرانے گنوں، کیوریاؤں اور قبیلوں کے باہر تھی اور اس لئے

populus romanus کا یعنی رومی لوگوں کا حصہ نہیں تھی۔ یہ لوگ انفرادی طور پر آزاد تھے۔ وہ زمین کے مالک ہو سکتے تھے۔ انہیں ٹیکس دینا اور فوج میں کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن انہیں کوئی عہدہ نہیں مل سکتا تھا اور نہ وہ کیوریاؤں کی اسمبلی میں حصہ لے سکتے تھے اور نہ فتح کی ہوئی ریاستی زمین کے بٹوارے میں انہیں کوئی حصہ مل سکتا تھا۔ یہ عام لوگ (پلےبین) تھے جو تمام سرکاری اختیارات اور حقوق سے محروم تھے۔ چونکہ ان کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی، وہ فوجی تربیت پا چکے تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی تھے، اس لئے وہ اس قدیم populus کے لئے ایک خطرہ بن گئے جس نے اب اپنے دروازوں کو بالکل بند کر دیا تھا تاکہ اس کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ populus اور پلےبین لوگوں کے درمیان زمین کا بٹوارہ بڑی حد تک برابر برابر ہوا تھا اگرچہ تجارتی اور صنعتی دولت، جو ابھی بہت کافی نہیں ہوئی تھی، زیادہ‌تر پلےبین لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

رومی تاریخ کی تمام تر افسانوی سی ابتدا بالکل تاریکی میں لپٹی ہوئی ہے۔ بعد کے جن مصنفوں کی کتابوں سے ہمیں روم کی تاریخ کا مواد ملتا ہے، انہوں نے قانون کی تعلیم پائی تھی اور انہوں نے معقولیت پرستی اور عملیت کے نظرئے کے مطابق اس کا مطلب نکالنے کی کوشش کرکے اس تاریکی کو اور گہرا کر دیا ہے۔ اس لئے یقین کے

ساتھ یہ کہنا ناممکن ہے کہ پرانے گن دستور کو جس انقلاب نے ختم کیا وہ کب، کیوں اور کیسے ہوًا تھا۔ اس سلسلہ میں یقین کے ساتھ ہم صرف ایک بات کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اس انقلاب کی تہہ میں پلےبین اور populus کی کشمکش کام کر رہی تھی۔

نیا دستور ریکس سرویئس ٹولیئس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ یونانی دستوروں اور خاص کر سولون کے دستور کے نمونہ پر بنایا گیا تھا۔ اس نے ایک نئی عوامی اسمبلی قائم کی جس میں populus اور پلےبین دونوں طرح کے لوگوں کو بغیر کسی فرق کے صرف اس بنیاد پر حصہ لینے یا نہیں لینے کی اجازت دی جاتی تھی کہ انہوں نے فوجی خدمت انجام دی ہے یا نہیں۔ آبادی کے تمام مردوں کو، جن سے فوجی خدمت لی جا سکتی تھی، دولت کے مطابق چھہ طبقوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ پہلے پانچ طبقوں کے لئے سلسلہ‌وار کم سے کم حسب ذیل قیمت کی جائداد ہونی ضروری تھی: پہلا طبقہ ایک لاکھ اسسے، دوسرا طبقہ ۷۵ ہزار اسسے، تیسرا طبقہ ۵۰ ہزار اسسے، چوتھا طبقہ ۲۵ ہزار اسسے، پانچواں طبقہ ۱۱ ہزار اسسے۔ دیورو دے لہ مال (Dureau de La Malle) کے اندازے کے مطابق یہ تقریباً ۱٤ ہزار، ۱۰۵۰۰، ۷۰۰۰، ۳٦۰۰ اور ۱۵۷۰ مارک کے برابر ہوتے ہیں۔ چھٹا طبقہ پرولتاریوں کا تھا جن کے پاس اس سے بھی کم تھا اور جنہیں فوجی خدمت اور ٹیکسوں سے بری کر دیا گیا تھا۔ سنٹوریاوں کی نئی اسمبلی (comitia centuriata)

میں شہریوں کو فوجی سپاہیوں کی طرح سو سو کی ٹکڑیوں میں (اسی کو سنٹوریا کہتے تھے) صف بند ہوکر بیٹھنا پڑتا تھا اور ہر سنٹوریا کا ایک ووٹ ہوتا تھا۔ پہلا طبقہ ۸۰ سنٹوریا بھیجتا تھا، دوسرا طبقہ ۲۲، تیسرا طبقہ ۲۰، چوتھا طبقہ ۲۲، پانچواں طبقہ ۳۰ اور چھٹا طبقہ بھی رسم ادائیگی کے طور پر ایک سنٹوریا بھیجا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ گھوڑ سواروں کی ۱۸ سنٹوریائیں ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہی لئے جاتے تھے۔ کل ملاکر ۱۹۳ سنٹوریائیں ہوتی تھیں۔ اکثریت حاصل کرنے کے لئے ۹۷ ووٹ ضروری ہوتے تھے۔ مگر گھوڑ سواروں اور پہلے طبقہ کو ہی ملاکر ۹۸ ووٹ ہو جاتے تھے اور اس طرح نئی عوامی اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی۔ جب گھوڑ سواروں اور پہلے طبقہ کے لوگوں میں اختلاف نہیں ہوتا تھا تو وہ دوسروں سے پوچھتے تک نہیں تھے اور خود فیصلہ کر ڈالتے تھے۔ اور ان فیصلوں کو سب کو ماننا پڑتا تھا۔ ✻

اب پرانی کیوریاؤں کی اسمبلی کے سبھی سیاسی اختیارات (محض نام کے لئے کچھہ اختیارات کو چھوڑکر باقی سب) سنٹوریاؤں کی اس نئی اسمبلی کو مل گئے۔ اور تب جیسا ایتھنز میں ہؤا تھا، کیوریاؤں اور گنوں کی حیثیت محض لوگوں کے نجی اور مذہبی اداروں کی رہ گئی اور اس حیثیت سے وہ بہت دنوں تک گھسٹتے ہوئے زندہ رہے حالانکہ کیوریاؤں کی اسمبلی کو لوگ جلد ہی بھول گئے۔ تین پرانے قبیلوں کو بھی جو گن پر مبنی تھے، ریاست سے

الگ کرنے کے لئے چار علاقائی قبیلے بنائے گئے۔ ہر قبیلہ شہر کے ایک چوتھائی حصہ میں رہتا تھا اور اسے کچھ سیاسی اختیارات حاصل تھے۔

اس طرح روم میں بھی خون کے ذاتی رشتوں کی بنیاد پر جو پرانا سماجی نظام قائم تھا، وہ نام نہاد بادشاہت کے ختم ہونے سے پہلے ہی، برباد کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر علاقوں کی تقسیم اور دولت کے فرق کی بنیاد پر ایک نیا دستور، صحیح معنی میں ایک ریاستی دستور قائم ہوا۔ یہاں اقتدار عامہ ان شہریوں کے ہاتھ میں تھا جن سے فوجی خدمت لی جاتی تھی اور اس کا رخ صرف غلاموں کے خلاف نہیں تھا بلکہ پرولتاری کہلانےوالے لوگوں کے خلاف بھی تھا جنہیں فوجی خدمت سے الگ رکھا گیا تھا اور جن کو ہتھیار رکھنے کا حق نہیں تھا۔

جب آخری رومی ریکس، ٹارکوئنی نیئس سوپربس کو، جو طاقت غصب کرکے سچ مچ بادشاہ بن گیا تھا، ملک بدر کر دیا گیا اور ایک ریکس کی جگہ پر دو برابر اختیار رکھنےوالے فوجی کماندار (قونصل) مقرر کئے گئے (جیسا کہ ایروکواس لوگوں میں بھی ہوتا تھا)، تو نئے دستور نے مزید ترقی ہی کی۔ اسی دستور کے دائرے کے اندر رومی جمہوریہ کی تاریخ کا پہیہ گھومتا رہا ہے۔ اسی کے اندر عہدوں اور ریاستی زمین کے حصہ کے لئے پتریشین اور پلےبین لوگوں کی تمام جد و جہد ہوتی رہی ہے۔ اور آخر میں اسی

کے اندر پٹریشین شرفاء، زمین اور نقد روپئے کے ان بڑے بڑے مالکوں کے طبقہ میں گھل مل گئے جنہوں نے فوجی خدمت سے برباد ہونے والے کسانوں کی ساری زمین رفتہ اپنے قبضہ میں کر لی تھی اور اس طرح زمین کے بڑے بڑے رقبے حاصل کرکے غلاموں کی مدد سے کھیتی کرنے لگے تھے، جنہوں نے اٹلی کو ویران کر دیا اور اس طرح نہ صرف شہنشاہوں کی حکومت کے لئے بلکہ ان کے جانشین بربری جرمنوں کے لئے بھی راستہ صاف کر دیا ۔

۷

کیلٹ اور جرمن لوگوں میں گن

جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم گن نظام کے ان اداروں کا تذکرہ نہیں کر سکتے جو موجودہ زمانہ کے بھانت بھانت کے وحشی اور بربری لوگوں میں آج بھی کم و بیش خالص صورت میں پائے جاتے ہیں اور نہ ہم ایشیا کی متمدن قوموں کی قدیم تاریخ میں ان اداروں کے آثار کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ادارے یا ان کے آثار ہر جگہ ملتے ہیں۔ کچھ مثالیں کافی ہونگی۔ جس وقت گن کو پہچانا بھی نہیں گیا تھا، اس وقت اس کا تذکرہ اس آدمی نے کیا تھا اور اس کے بنیادی خد و خال صحیح طور پر بتلائے تھے جس نے اس کو غلط ڈھنگ سے سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ زحمت اٹھائی تھی۔ ہماری مراد میکلینن سے ہے جس نے کالموک، سرکیسین، ساموئڈ (Samojeden) میں اور ہندوستان کی تین جاتیوں — وارلی، ماگر اور منی پوریوں میں گن نظام پایا تھا اور اس کے بارے میں لکھا تھا۔ حال میں میکسم کوالفسکی

نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اسے پشاو، خیوسور، سوانےتین اور قفقاز کے اور متعدد قبیلوں میں اس کا سراغ ملا ہے۔ کیلٹ اور جرمن لوگوں میں بھی گن ہوتے تھے اور یہاں ہم اسی کے بارے میں چند مختصر باتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے۔

قدیم ترین کلٹی قوانین جو ہم تک پہونچے ہیں، یہ بتاتے ہیں کہ گن آج بھی پورے شباب پر ہیں۔ آئرلینڈ[1] میں جہاں انگریزوں نے زبردستی گن نظام کو برباد کر ڈالا ہے، وہ آج بھی کم سے کم نیم شعوری طور پر لوگوں کے ذہن میں زندہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں وہ گذشتہ صدی کے وسط تک پوری توانائی کے ساتھہ پایا جاتا تھا اور وہاں بھی اسے صرف انگریزوں کے ہتھیاروں، قانونوں اور عدالتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے ہیں۔

ویلش کے پرانے قانون انگریزوں کی فتح سے کئی صدی پہلے لکھے گئے تھے۔ وہ گیارھویں صدی تک تیار ہو چکے تھے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں کہیں پورے گاؤں کے گاؤں مل کر کھیتی کرتے تھے حالانکہ اس زمانہ تک یہ چیز ایک پرانے عام رواج کے باقی‌ماندہ اثر کے طور پر ہی کہیں کہیں رہ گئی تھی اور مستثنی حیثیت رکھتی تھی۔ ہر خاندان کے پاس پانچ ایکڑ زمین خود جوتنے کے لئے ہوتی تھی اور ایک ٹکڑا دوسرے خاندانوں کے ساتھہ مل کر جوتنے کے لئے ہوتا تھا۔ اس ٹکڑے کی پیداوار سب میں بٹ جاتی تھی۔ آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ کی اتنی ملتی جلتی

مثالوں کی بنیاد پر اگر ویلش کی ان دیہی برادریوں کا
جائزہ لیا جائے تو اس بات میں ذرہ برابر شبہہ کی گنجائش
نہیں رہےگی کہ وہ یا تو گن کی نمائندہ ہیں یا گن کی
شاخیں ــــ خواہ ویلش کے قانون کی پھر سے چھان بین کرنے
پر، جو میں اس موقع پر وقت کی تنگی کی وجہ سے نہیں
کر سکتا، (میرے نوٹ ۱۸۶۹ء کے ہیں) اس کا کوئی
براہ‌راست ثبوت ملے یا نہ ملے ـ لیکن ویلش اور آئرلینڈ کے
مواد سے جس بات کا براہ راست ثبوت مل جاتا ہے وہ یہ
ہے کہ گیارھویں صدی تک کیلٹ لوگوں میں جوڑا خاندان
کی جگہ یک‌زوجگی کا خاندان پوری طرح قائم نہیں ہؤا
تھا ـ ویلش میں شادی ہونے کے بعد جب تک سات برس
کی مدت پوری نہ ہو جائے، شادی کا رشتہ اٹوٹ نہیں سمجھا
جاتا تھا یا یوں کہا جائے کہ سات برس تک شادی کو کسی
وقت بھی نوٹس دے کر منقطع کیا جا سکتا تھا ـ سات برس
پورے ہونے میں اگر صرف تین راتوں کی کمی ہوتی تھی
تب بھی شادی شدہ جوڑا الگ ہو سکتا تھا ـ ایسا ہونے پر
جوڑے کی جائداد دونوں میں بانٹ دی جاتی تھی ـ عورت
پوری جائداد اور ملکیت کے دو حصے کرتی ـ مرد ایک حصہ
چن لیتا تھا ـ فرنیچر بانٹنے کے کچھ بہت ہی عجیب طریقے
تھے ـ اگر مرد شادی کا رشتہ توڑتا تو اسے عورت کا جہیز
اور کچھ اور چیزیں واپس کر دینی پڑتی تھیں ـ اگر عورت
الگ ہونا چاہتی تھی تو اسے کم ملتا تھا ـ بچوں میں سے
دو مرد کو ملتے تھے ـ ایک منجھلا بچہ عورت کو ملتا تھا ـ

اگر عورت طلاق کے بعد پھر شادی کرتی تھی اور اس کا پہلا شوہر اسے واپس لے جانے کے لئے پہونچ جاتا تھا تو عورت کو، چاھے اس کا ایک پیر نئے شوہر کے بستر میں ھی کیوں نہ ھو، لوٹ جانا پڑتا تھا۔ لیکن اگر عورت مرد سات سال تک ساتھہ رہ چکتے تھے تو انہیں شادی کی رسم پوری ہوئے بغیر ھی شوہر اور بیوی سمجھا جاتا تھا۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کے کنواری رھنے کے بارے میں کوئی خاص سختی نہیں برتی جاتی تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اس معاملے سے تعلق رکھنےوالے قاعدے بہت ھی ھلکے قسم کے ھیں اور بورژوا اخلاق کے بالکل الٹ ھیں۔ اگر کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھہ ھمبستری کرتی تو اس کے شوہر کو اسے پیٹنے کا حق ھوتا تھا۔۔ جن تین صورتوں میں بیوی کو پیٹنے پر بھی شوہر کو سزا کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ ان میں سے ایک وجہ تھی۔۔ لیکن بیوی کو پیٹنے کے بعد شوہر اور کسی قسم کے ھرجانہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ «کسی قصور کا یا تو کفارہ لیا جا سکتا ھے یا بدلہ، لیکن دونوں نہیں لئے جا سکتے»۔ بہتیری وجہیں تھیں جن سے مرد کو عورت طلاق دے سکتی تھی۔ اور ایسا کرنے پر بھی جائداد وغیرہ پر اس کے حق کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تھا۔ مرد کے منہہ سے بدبو آنا بھی طلاق دینے کی ایک کافی وجہ سمجھی جاتی تھی۔ قانونوں میں معاوضہ کی اس رقم کی بہت نمایاں جگہ تھی جو قبیلہ کے . سردار یا بادشاہ کو پہلی رات کے

حق کے بدلہ میں دینی پڑتی تھی (اس حق کو گوبر مرچ (gobr merch) کہتے تھے، جس سے ازمنہ وسطی کا لفظ مارچیتا (marcheta) بنا ــ فرانسیسی میں یہ مارکیت (marquette) ہے) ــ عورتوں کو عوامی اسمبلیوں میں ووٹ دینے کا حق تھا ــ اس کے ساتھہ ساتھہ اگر ہم ان باتوں پر بھی غور کریں کہ آئرلینڈ میں بھی اسی طرح کی حالت پائی جاتی تھی، وقتی شادیوں کا وہاں بھی کافی رواج تھا، اور طلاق کی صورت میں عورت کو بہت ہی واضح اختیارات اور خاص سہولتیں ملتی تھیں، یہاں تک کہ اسے گھریلو کاموں کا بھی معاوضہ ملتا تھا، متعدد بیویوں کے ساتھہ ایک «بڑی بیوی» بھی ہوتی تھی اور کسی متوفی شخص کی جائداد بانٹتے وقت اس کے جائز اور ناجائز بچوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا ــ اگر ہم ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھیں تو ہمارے سامنے جوڑا بیاہ کی ایک ایسی تصویر آتی ہے جس کے مقابلہ میں شادی کی وہ صورت زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے جس کا رواج شمالی امریکہ میں تھا ــ لیکن سیزر کے زمانہ میں جو لوگ گروہوار شادی کی حالت میں تھے، وہ اگر گیارھویں صدی میں جوڑا بیاہ کی حالت میں ہی تھے، تو ان کے لئے وہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی ــ

آئرلینڈ کے گن (اسے وہ سپت (sept) کہتے تھے اور قبیلے کو کلائن (clainne) کہتے تھے جو انگریزی کے لفظ کلان (clan) کے مشابہ ہے) کے وجود کا ثبوت اور اس کا حال نہ صرف قانون کی پرانی کتابوں میں ملتا ہے بلکہ اس کی تصدیق

سترھویں صدی کے ان انگریز ماھرین قانون نے بھی کی ھے
جو آئرلینڈ کے قبیلوں کی زمین کو انگلینڈ کے بادشاہ کی
جاگیر بنانے کے لئے وھاں بھیجے گئے تھے۔ اس زمانہ تک
زمین کلان (قبیلہ) یا گن کی مشترکہ ملکیت ھوتی تھی، سوا
ان جگہوں کے جہاں قبیلے کے سردار نے زمین کو اپنی
ذاتی جاگیر بنا لیا تھا۔ جب گن کا کوئی ممبر مر جاتا تھا
اور اس کی وجہ سے کوئی گھرانہ ٹوٹ جاتا تھا تو گن
کا سردار (انگریز ماھرین قانون اسے کاپٹ کوگنے شیونس
«caput cognationis» کہتے تھے) گن کی ساری زمین کو باقی
گھرانوں میں نئے سرے سے بانٹ دیتا تھا۔ یہ تقسیم بحیثیت
مجموعی انہی اصولوں کے مطابق ھوتی تھی جو جرمنوں میں پائے
جاتے ھیں۔ آئرلینڈ میں آج بھی ایسے گاؤں ملتے ھیں جہاں
زمین پر مشترکہ حق ھے۔ اسے رونڈیل (rundale) کہتے ھیں۔
چالیس یا پچاس سال پہلے ایسے گاؤں کی تعداد بہت بڑی
تھی۔ جس زمین پر کبھی گن کا مشترکہ حق تھا اسے
انگریز فاتحوں نے چھین لیا۔ ھر کسان کو جو اب انفرادی
طور پر کھیتی کرتا تھا، اپنے کھیت کے لئے لگان دینا پڑتا
تھا۔ لیکن اس کے باوجود گاؤں کے سارے کسان اپنی کھیتی
کی اور چراگاھوں کی تمام زمینوں کو ایک جگہ جمع کر
لیتے ھیں اور پھر زمین کی زرخیزی اور عام حالت کا خیال
رکھتے ھوئے، اسے قطعات میں یا جیسا کہ وہ موسیل ندی کے
علاقہ میں کہلاتی ھے، گیوانوں (Cewanne) میں بانٹ لیا جاتا
ھے۔ اور گاؤں کے ھر کسان کو ھر گیوانے (قطعہ) میں

حصه ملتا ھے۔ بنجر زمین اور چراگاہ کا استعمال ساجھے میں ھوتا ھے۔ صرف پچاس سال پہلے کی بات ھے کہ وقتاً فوقتاً، کبھی کبھی ھر سال، گاؤں کی زمین کا نئے سرے سے بٹوارہ ھو جاتا تھا۔ ایسے کسی رونڈیل (rundale) گاؤں کا نقشہ دیکھئے تو معلوم ھوگا کہ موسیل ندی کے علاقہ یا ھوخوالڈ میں کاشتکار گھرانوں کی کسی جرمن بستی (Gehöfersschaft) کا نقشہ ھے۔ «گروھوں» (factions) کی صورت میں بھی گن زندہ ھیں۔ کبھی کبھی آئرلینڈ کے کسان ایسی پارٹیاں بناتے پائے جاتے ھیں جو بالکل مہمل اور بے تکے فرق پر مبنی معلوم ھوتی ھیں اور انگریزوں کی سمجھہ میں بالکل نہیں آتیں۔ ان گروھوں کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں معلوم ھوتا کہ وہ ایک کھیل کھیلنے کے لئے جمع ھوں جو بہت مقبول ھے اور جس میں نہایت اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھہ ایک دوسرے کی خوب مرمت کی جاتی ھے۔ حقیقت میں ان گروھوں کے ذریعہ پرانے گنوں کو بناوٹی ڈھنگ سے دوبارہ زندہ کیا جاتا ھے جو اب برباد ھو چکے ھیں، اور گن کا جو احساس انہیں وراثت میں ملا ھے اسے اپنے عجیب ڈھنگ سے ظاھر کرتے ھیں۔ اتفاق سے بعض علاقوں میں چند گنوں کے ممبر آج بھی اسی جگہ پر رھتے ھیں جو ان کی پرانی جگہ ھے۔ مثال کے لئے اس صدی کی چوتھی دھائی تک موناگھن سرزمین کے زیادہ‌تر باشندوں میں صرف چار خاندانی نام پائے جاتے ھیں۔ مطلب یہ کہ اس

ضلع کے تمام لوگ چار گنوں یا قبیلوں کی اولاد ہیں *۔

---

* آئرلینڈ میں میں نے کچھہ دن گذارے تو ایک بار پھر مجھے اس بات کا احساس ہؤا کہ اس ملک کی دیہاتی آبادی آج بھی کس حد تک گن کے زمانہ کے خیالات اور تصورات سے لپٹی ہوئی ہے۔ زمیندار کو جس سے لگان پر زمین لےکر کسان کھیتی کرتا ہے، وہ اپنے جرگے کا ایسا سردار سمجھتا ہے جو سب کے فائدے کے لئے کھیتی کی دیکھہ بھال کرتا ہے، جسے کسانوں سے لگان کی شکل میں خارج لینے کا حق ہے، پر ساتھہ ہی جس کا یہ فرض بھی ہے کہ ضرورت پڑنے پر کسان کی مدد کرے۔ اسی طرح ہر کھاتے پیتے آدمی کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ جب بھی اس کے غریب پڑوسی مصیبت میں ہوں تو وہ ان کی مدد کرے۔ یہ مدد خیرات نہیں ہے۔ جرگے کے غریب ممبروں کا حق ہے کہ جرگے کے دولتمند لوگ یا جرگے کا سردار ان کی مدد کرے۔ اسی وجہ سے اقتصادیات اور قانون کے پنڈت اکثر یہ شکایت کرتے سنے جاتے ہیں کہ آئرلینڈ کے کسانوں کے دماغ میں بورژوا ملکیت کے جدید خیالات کو جمانا ناممکن ہے۔ آئرلینڈ کے باشندوں کی سمجھہ میں یہ بات کسی طرح آتی ہی نہیں کہ ایسی بھی کوئی ملکیت ہو سکتی ہے جس میں محض اختیارات اور حقوق ہوں اور ذمہداری کوئی نہ ہو۔ کوئی حیرت نہیں کہ گن سماج کے ایسے بھولے بھالے خیالات کو لئے ہوئے آئرلینڈ کے باشندے جب اچانک انگلینڈ یا امریکہ کے بڑے شہروں میں، ایسی آبادی میں پہونچ جاتے ہیں جس کے اخلاق اور قانون کے معیاری اصول بالکل مختلف ہوتے ہیں تو اخلاق اور انصاف

اسکاٹلینڈ میں گن سماج کا زوال ۱۷۴۵ء کی بغاوت کے کچلے جانے کے بعد سے شروع ہؤا۔ اسکاٹلینڈ کے جرگے (کلان) کی اس سماج میں کیا جگہ تھی، وہ اس سلسلہ کی کون سی کڑی تھا، ان باتوں کی چھان‌بین ابھی باقی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس نظام کی کڑی تھا ضرور۔ اسکاٹلینڈ کی پہاڑیوں میں جرگہ کیا چیز تھی، اس کی زندہ تصویر ہمیں والٹر اسکاٹ کے ناولوں میں ملتی ہے۔ مارگن کے لفظوں میں یہ «تنظیم اور سرگرمی کے اعتبار سے گن کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے اور اس بات کا غیرمعمولی ثبوت ہے کہ گن کی زندگی کا اپنے ممبروں پر کتنا اختیار ہوتا ہے... خاندانی جھگڑے ہوتے ہیں۔ خون کا بدلہ خون سے لیا جاتا ہے۔ ان کی جائے رہائش وہی ہوتی ہے جو پہلے ان کے گنوں کی تھی۔ زمین کا جوتنا بونا مشترک طور پر ہوتا ہے۔ جرگے کے لوگوں میں سردار کے لئے اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے بڑی وفاداری ہوتی ہے۔ یہ گن سماج کی عام اور مستقل خصوصیتیں تھیں جو ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نسل مردوں سے چلتی ہے۔ یعنی صرف مردوں کے بچے جرگے کے ممبر مانے جاتے تھے۔ اور عورتوں کے بچے اپنے اپنے باپ کے جرگے کے ممبر سمجھے جاتے

دونوں کے بارے میں ان کے خیالات گڈمڈ ہو جاتے ہیں، انہیں اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور اکثر ان کی ایک بڑی تعداد بددلی اور پست ہمتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ (چوتھے اڈیشن کے لئے نوٹ۔ از اینگلس۔)

تھے۔» پکٹ لوگوں کا شاھی خاندان اس بات کا ثبوت ھے که اسکاٹلینڈ میں پہلے مادری حق قائم تھا۔ بیڈے کی روایت کے مطابق اس شاھی خاندان میں عورتوں کی اولاد کو گدی ملتی تھی۔ ھمیں پونالوان خاندان کے آثار بھی ملتے ھیں جو اسکاٹلینڈ اور ویلش دونوں جگه کے لوگوں میں عہد وسطی تک قائم تھا۔ اس کا اثر پہلی رات کے حق کی صورت میں باقی تھا یعنی جرگے کا سردار یا بادشاہ پہلے زمانه کے مشترک شوھروں کے آخری نمائندے کی حیثیت سے ھر نئی دلہن کے ساتھه پہلی رات ھمبستر ھونے کا مطالبه کر سکتا تھا اور اس کو کچھه معاوضه ادا کرکے ھی اس کے اس دعوے سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا تھا۔

* * *

یه ایک ناقابل انکار حقیقت ھے که ھجرت یا نقل وطن کے زمانه تک جرمن لوگ گنوں میں منظم تھے۔ ھمارے عہد (یعنی عیسوی سن) سے کئی سو سال پہلے ھی یه لوگ ڈنیوب، رائن اور وسٹولا دریاؤں اور شمالی سمندروں کے درمیانی علاقه میں آ کر بسے ھونگے۔ سمبری اور ٹیوٹن لوگوں کی ھجرت کا سلسله زوروں پر تھا، اور سوئیوی لوگوں کو سیزر کے زمانه تک کوئی مستقل جائے رھائش نہیں ملی تھی۔ سیزر نے صاف کہا ھے که ان لوگوں میں گنوں کے ممبر اور خون کے رشتهدار ساتھه ساتھه رھتے تھے (gentibus cognationibusque) اور جب جولیا گن (gens julia) کے ایک

رومی کی زبان سے gentibus کا لفظ نکلتا ہے تو اس کا ایک مخصوص مطلب ہوتا ہے جس کو کسی طرح توڑا مڑوڑا نہیں جا سکتا۔ یہ بات سبھی جرمنوں کے لئے سچ ہے۔ یہاں تک کہ مفتوحہ رومی صوبوں میں بھی جرمن لوگ گنوں کے مطابق بسے ہوئے تھے۔ «المانی قانون» سے یہ بات ثابت ہے کہ دریائے ڈنیوب کے جنوب کے مفتوحہ علاقہ میں جرمن لوگ گنوں (genealogiae) کے مطابق جاکر بسے تھے۔ genealogia لفظ کا استعمال ٹھیک اسی معنی میں ہوتا ہے جس معنی میں بعد میں Mark یا Dorfgenossenschaft * کا استعمال ہوًا۔ حال میں کوالفسکی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ (genealogiae) بڑی بڑی گھریلو برادریاں تھیں جن میں زمین بٹی ہوئی تھی اور جن سے بعد میں چل‌کر دیہی برادریاں بنیں۔ fara کے بارے میں بھی یہی بات سچ ہو سکتی ہے۔ برگنڈی یا لینگوبارڈ لوگ یعنی ایک گوتھہ اور ایک ہرمی‌نونی یا شمالی جرمن قبیلہ اس لفظ fara کو اگر ٹھیک اس چیز کے لئے نہیں تو لگ بھگ اسی چیز کے لئے استعمال کرتا تھا جس کے لئے «المانی قانونوں» کی کتاب میں genealogia کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ چیز اصل میں گن تھی یا گھریلو برادری، اس کے بارے میں ابھی اور چھان‌بین کرنے کی ضرورت ہے۔

تحریری شہادتوں سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ سبھی جرمن گن کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے یا نہیں، اور اگر کرتے تھے تو وہ لفظ کیا تھا۔ علم صرف کی رو سے

* دیہی برادری۔ (اڈیٹر۔)

یونانی genos اور لاطینی gens، گوتھی زبان کا kuni اور وسطی شمالی جرمن زبان کا künne سب متشابہہ الفاظ ھیں اور یہ سب ایک ھی معنی میں استعمال کئے جاتے ھیں ــ اور چونکہ یونانی زبان کا لفظ gyne، سلاف لفظ žena، گوتھی لفظ qvino اور قدیم نارس زبان کا kona یا kuna ــــ عورت کے یہ مختلف نام ایک ھی مادہ سے نکلے ھیں اور اس سے ثابت ھوتا ھے کہ ایک زمانہ ایسا رھا ھوگا جب ان تمام لوگوں میں مادری نظام قائم تھا ــ جیسا کہ اوپر بتایا گیا لینگوبارڈ اور برگنڈی کے لوگوں میں fara کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے بارے میں گریم کا کہنا ھے کہ وہ ایک فرضی مادہ fisan سے نکلا ھے جس کے معنی ھیں: پیدا کرنا ــ میری رائے میں لفظ fara کا تعلق faran یا fahren سے جوڑنا چاھئے ــ یہ ایک مفرد مادہ ھے جس کا مطلب گھومنا یا جاترا کرنا ھے ــ تب فاران کا مطلب ھوگا خانہ بدوش، آوارہ گرد لوگوں کا ایک مخصوص گروہ جس میں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ سبھی ایک دوسرے کے رشتہ دار ھوتے تھے ــ یہ لوگ ایک عرصہ تک پہلے مشرق کی طرف اور پھر مغرب کی طرف گھومتے رھے اور اسی خانہ‌بدوشی کے زمانہ میں رفتہ رفتہ یہ لفظ خود گن سماج کے لئے استعمال ھونے لگا ــ اس کے علاوہ گوتھی لفظ sibja، اینگلو سیکسن لفظ sib، قدیم شمالی جرمن کا لفظ sippia، sippa یا Sippe ھے * ــ قدیم نارس میں صرف صیغۂ جمع

قرابت‌دار ــ (اڈیٹر ــ)

کا لفظ sifjar استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں رشتہ دار۔ صیغۂ واحد کا لفظ Sif، ایک دیوی کا نام ہے۔ آخر میں ہلڈےبرانڈ کے گیت میں اس کا ایک اور استعمال ملتا ہے۔ اس میں ہلڈےبرانڈ ہاڈوبرانڈ سے پوچھتا ہے کہ «جاتی کے لوگوں میں تیرا باپ کون ہے ... یعنی تیرا گھرانا کون سا ہے؟» (eddo huêlîhhes cnuosles du sîs) ۔ اگر گن کے لئے سبھی جرمن ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے تو بہت ممکن ہے کہ یہ لفظ گوتھی زبان کا kuni ہو کیونکہ نہ صرف گوتھی سے ملتی جلتی دوسری زبانوں میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے بلکہ kuning یا König لفظ بھی جس کا مطلب شروع میں گن یا قبیلہ کا سردار تھا، اسی لفظ سے نکلا ہے۔ Sibja یا Sippe کی طرف دھیانؔ دینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کم سے کم قدیم نارس میں sifjar کا مطلب صرف خون کی قرابت داری نہیں ہوتا بلکہ اس کے دائرے میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جن سے شادی کے ذریعہ رشتہ داری قائم ہوتی ہے۔ اس لئے اس لفظ میں کم سے کم دو گنوں کے لوگ شامل ہیں۔ چنانچہ sif کا لفظ گن کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔

میکسیکو کے باشندوں اور یونانیوں کی طرح جرمنوں میں بھی گھوڑسواروں اور پیدل سپاہیوں کے گاؤدم مثلث شکل کے دستے لڑائی میں گن کے لحاظ سے صف‌بند ہوتے تھے۔ جب ٹیسی‌ٹس کہتا ہے کہ خاندانوں اور رشتہ داروں کے اعتبار سے صف‌بندی ہوتی تھی تو وہ اس غیرواضح لفظ

کو اس لئے استعمال کرتا ہے کہ روم میں بہت عرصہ سے گن کوئی زندہ ادارہ نہیں رہا تھا۔

ٹیسی‌ٹس کی وہ عبارت فیصلہ‌کن اہمیت رکھتی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ ماں کا بھائی اپنے بھانجے کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ کچھ لوگوں کی تو یہ رائے ہے کہ ماموں اور بھانجے کا خون کا رشتہ باپ اور بیٹے کے رشتے سے زیادہ مقدس اور قریبی ہے۔ اور چنانچہ جب یرغمال (یعنی ضمانت کے طور پر دشمن کے حوالہ کرنے) کے لئے کسی شخص کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو جس آدمی کو اس طرح پابند کرنا مقصود ہوتا ہے، اس کے بیٹے کے مقابلہ میں اس کے بھانجے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ مادری حق کی اور لہذا ابتدائی گن کی ایک زندہ نشانی ہے۔ اور اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے گویا وہ جرمنوں کی کوئی امتیازی خصوصیت ہے *۔ اگر ایسے کسی گن کا کوئی

---

* ماموں اور بھانجے کے رشتہ کا گہرا تعلق اور اس کی خصوصیت جو بہت سے لوگوں میں مادری حق کی ایک نشانی کے طور پر باقی ہے، یونانیوں میں صرف سورمائی عہد کی دیومالا میں پائی جاتی ہے۔ دیودورس کی جلد ٤، صفحہ ٣٤ میں میلیاگیر اپنی ماں آلتھیا کے بھائیوں، تھیسٹیئس کے بیٹوں کو مار ڈالتا ہے۔ آلتھیا اس قتل کو اتنا سنگین جرم سمجھتی ہے کہ قاتل کو جو خود اس کا بیٹا ہے، سراپ دے ڈلتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ وہ مر جائے۔ لکھا ہے کہ «دیوتاؤں نے اس کی دعا سن لی اور

ممبر اپنے کسی وعدے کی ضمانت کے طور پر اپنے سگے بیٹے کو دے دیتا تھا اور پھر وعدہ پورا نہیں کرتا تھا اور بیٹے کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا تو یہ صرف باپ کا اپنا معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اگر کسی آدمی کی بہن کے بیٹے کی قربانی ہو جاتی تو یہ گن کے نہایت مقدس قانون کی خلاف ورزی سمجھی جاتی تھی۔ ماموں سب سے قریبی رشتہ دار ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ اس کا فرض تھا کہ وہ لڑکے یا نوجوان کی حفاظت کرتا۔ اسے چاہئے تھا کہ یا تو ضمانت میں وہ اس لڑکے (یعنی اپنے بھانجے) کو نہ دیتا یا اپنا وعدہ پورا کرتا۔ اگر جرمنوں میں گن تنظیم کا کوئی اور ثبوت نہ بھی ملتا تو صرف یہ عبارت ہی اس کی کافی شہادت تھی۔

میلیاگیر کی زندگی کو ختم کر دیا۔» اسی مصنف کے قول کے مطابق (دیودورس، جلد ٤، صفحہ ٤٤) جب ہیرکلیز کی رہنمائی میں ارگوناٹ کا گروہ فراکیا (Thracia) میں اترا تو اس نے دیکھا کہ فینیئس نے اپنی دوسری بیوی کے کہنے میں آکر اپنی پہلی بیوی کلیوپیٹرا بوریئڈ سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اپنے ان دونوں بیٹوں کے ساتھ جو اس کے بطن سے تھے، نہایات شرمناک برتاؤ کر رہا ہے۔ لیکن ارگوناٹ کے گروہ میں بھی کچھ بوریئڈ خاندان کے لوگ تھے جو کلیوپیٹرا کے رشتہ کے بھائی ہوتے تھے اور اس طرح ان مصیبت زدہ لڑکوں کے ماموں تھے۔ ماموؤں نے فوراً اپنے بھانجوں کی مدد کی، انہیں قید سے چھٹکارا دلایا اور ان کو قید میں رکھنے والے پہرہ داروں کو مار ڈالا۔ (نوٹ از اینگلس۔)

پرانے نارس «وولوسپا» («Völuspá») ــــ یعنی وہ گیت جن میں دیوتاؤں کی آخری گھڑی اور قیامت یعنی دنیا کی تباھی کا ذکر کیا گیا ھے ــــ ان کا ایک ٹکڑا اس سے بھی زیادہ فیصلہ کن ھے چوں‌کہ وہ آٹھ سو برس بعد کی چیز ھے ــ اس حصہ میں جسے «غیب‌داں عورت کا کشف» کہا گیا ھے اور جس میں جیسا کہ بینگ (Bang) اور بگے (Bugge) نے اب ثابت کر دیا ھے، عیسائیت سے عناصر بھی ملے ھوئے ھیں، بتایا گیا ھے کہ قیامت سے پہلے عام فسق و فجور اور برائی اور بداخلاقی کا ایک زمانہ آئےگا ــ اس زمانہ کا حال بیان کرتے ھوئے ایک جگہ کہا گیا ھے:

Broedhr munu berjask ok at bönum verdask,
munu *systrungar*. sifjum spilla.

«بھائی بھائی ایک دوسرے سے جنگ کریں‌گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں‌گے اور بہنوں کی اولاد خون کی قرابت داری کے تعلق کو توڑےگی» ــ ماں کی بہن کے بیٹے کے لئے Systrungr کا لفظ استعمال کیا گیا ھے اور شاعر کی نظر میں خون کے ایسے رشتہ کو منقطع کرنا بھائیوں کے آپس کے خون خرابے کی انتہا ھے ــ یہ انتہا systrungar لفظ پر پہونچ کر آتی ھے جس میں ماں کی طرف کے خون کے رشتے پر زور دیا گیا ھے ــ اگر اس جگہ پر لفظ syskina-börn یعنی بھائی اور بہن کی اولاد، یا syskina-synir یعنی بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے استعمال کیا جاتا تو پہلے کے مقابلہ میں دوسری سطر چڑھتے ھوئے سروں میں نہیں ھوتی

بلکہ اس کا سر بہت دھیما ہو جاتا۔ چنانچہ وائیکنگ کے زمانہ میں بھی جبکہ «Yöluspä» گیت بنایا گیا تھا، اسکینڈی‌نیویا میں مادری حق کی یاد مٹی نہیں تھی۔

لیکن ٹیسی‌ٹس کے زمانہ میں کم سے کم ان جرمنوں میں جن سے وہ زیادہ واقف تھا، مادری حق کی جگہ پدری حق قائم ہو چکا تھا یعنی باپ کے حقدار اس کے بچے ہوتے تھے اور بچوں کے نہ ہونے پر بھائی اور چچا اور ماموں ہوتے تھے۔ ماموں کو وارث بنانا بھی مذکورۂ بالا رسم و رواج کا ہی نتیجہ ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک جرمنوں میں پدری حق کو قائم ہوئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ عہد وسطی کے اواخر تک بھی ہمیں مادری حق کے آثار ملتے ہیں۔ اس دور میں خاص‌کر زرعی غلاموں میں کسی کے باپ کا پتہ لگانا کافی مشکل کام تھا۔ اور اس لئے کوئی جاگیردار کسی بھاگے ہوئے زرعی غلام کو شہر سے واپس بلوانے کا مطالبہ کرتا تھا تو مثال کے طور پر آگسبرگ، بیسل اور کیزرسلائٹرن جیسے شہروں میں اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ زرعی غلام کی محض ماں کی طرف کے چھہ سب سے قریبی خون کے رشتہ داروں کی حلفیہ گواہی سے یہ ثابت کرے کہ وہ اس کا زرعی غلام تھا۔ (ماؤرر۔ «شہری دستور»۔ جلد ۱*، صفحہ ۳۸۱۔)

---

* Maurer G. L., Geschichte der Städteverfassung in Deutschland, Bd. I-IV. Erlangen, 1869—1871. (اڈیٹر۔)

مادری حق کی ایک اور نشانی تھی جو کہ اس وقت تک مٹنے لگی تھی اور جو روم کے باشندوں کے نقطۂ نظر سے سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ وہ یہ کہ جرمن لوگ عورتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جرمنوں سے اگر کسی وعدے کو پورا کرانا ہوتا تھا تو اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ شریف خاندانوں کی لڑکیوں کو ضمانت کے طور پر رکھ لیا جائے۔ جنگ کے وقت ان کی ہمت اور کسی چیز سے اس قدر جوش میں نہیں آتی تھی جتنی اس خوفناک خیال سے کہ اگر انہیں شکست ہوئی تو دشمن ان کی بہو بیٹیوں کو پکڑ کر لے جائیں گے اور اپنی باندیاں بنا لیں گے۔ جرمن لوگ عورت کو مقدس مانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس میں مستقبل کو دیکھ لینے کی طاقت موجود ہے۔ چنانچہ وہ سب سے اہم معاملوں میں عورتوں کی صلاح پر عمل کرتے تھے۔ لپے ندی کے کنارے رہنے والی بروکٹرین پجارن، ویلیڈا بٹاویا کی اس پوری بغاوت کی روح رواں تھی جس کی بدولت جرمنوں اور بلجینوں نے سوی لس کی رہنمائی میں گول علاقہ میں رومی حکومت کی بنیاد ہلا ڈالی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے اندر عورتوں کی مطلق العنان حکومت تھی۔ ٹیسی ٹس کہتا ہے کہ عورتوں کو، بوڑھوں اور بچوں کے ساتھ سارا کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ مرد شکار کرنے جاتے تھے، شراب پیتے تھے اور آوارہ گردی کرتے تھے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ کھیت کون جوتتا تھا اور چونکہ یہ اس نے صاف کہا ہے کہ

غلاموں کو صرف خراج ادا کرنا پڑتا تھا اور ان سے زبردستی کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس لئے معلوم ھوتا ھے کہ کھیتی کا تھوڑا بہت جو کام ھوتا تھا اسے بالغ مردوں کی بڑی تعداد ھی کرتی تھی۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے شادی کی شکل جوڑا بیاہ کی تھی جو رفتہ رفتہ یک زوجگی میں بدلتی جا رھی تھی۔ ابھی سختی کے ساتھہ یک زوجگی پر عمل نہیں ھوتا تھا کیونکہ شرفاء کے لئے کئی بیویوں کی اجازت تھی۔ بحیثیت مجموعی (کیلٹ لوگوں کے برخلاف) جرمن لوگ لڑکیوں کی پاک دامنی پر زور دیتے تھے۔ ٹیسی‌ٹس اس بات کا بڑے جوش کے ساتھہ ذکر کرتا ھے کہ جرمنوں میں شادی کا رشتہ اٹوٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ بتاتا ھے کہ طلاق کی اجازت صرف اسی صورت میں ملتی تھی جب عورت نے کسی اور مرد کے ساتھہ ھمبستری کی ھو۔ لیکن ٹیسی‌ٹس کی رپورٹ میں کئی خامیاں ھیں۔ اور اس کے علاوہ یہ بات بھی ھے کہ نیک چلنی کی مثال سامنے رکھہ کر وہ بدچلن رومیوں کو اخلاق کا سبق پڑھانے کی کوشش کرتا ھے۔ اتنی بات تو ھم یقین کے ساتھہ کہہ سکتے ھیں کہ جرمن اپنے جنگلوں میں بھلے ھی نیک چلنی اور اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی کا نمونہ رھے ھوں لیکن باھری دنیا کا ذرا سا تعلق ھی انہیں دوسرے اوسط یورپینوں کی سطح پر کھینچ لانے کے لئے کافی تھا۔ رومی زندگی کے تیز بھنور میں پڑ کر جرمنوں کی اخلاقی پاکیزگی جرمن زبان سے بھی

زیادہ تیزی سے مٹ گئی اور اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں بچا۔ اس کے لئے تورس کے گریگری کی کتاب کو پڑھنا کافی ہوگا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جرمنی کے قدیم جنگلوں میں وہ لطافت اور نزاکت بھری عیاشی ممکن ہی نہیں تھی جو روم میں ہوتی تھی۔ اس لئے اس معاملہ میں بھی جرمن لوگ رومیوں پر فوقیت رکھتے تھے لیکن اس کے لئے ان کی طرف یہ بات منسوب کرنے کی ضرورت نہیں کہ نفسانی خواہشیں انہیں چھو نہیں گئی تھیں اور وہ تقوی اور پرہیزگاری کا نمونہ تھے کیونکہ بحیثیت مجموعی کوئی قوم بھی کبھی ایسی نہیں رہی۔

گن نظام سے ہر شخص پر یہ فرض عائد ہؤا کہ وہ اپنے باپ اور رشتہ داروں کے دشمنوں کو اپنا دشمن مانے اور ان کے دوستوں کو اپنا دوست۔ اسی سے ,ویرگلڈ، کا رواج ہؤا جس میں کسی کو قتل یا زخمی کرنے کی پاداش میں جرمانہ ادا کرنے سے کام چل جاتا تھا اور خونی انتقام کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ایک پشت پہلے ,ویرگلڈ، کو ایک ایسا رواج مانا جاتا تھا جو خاص طور پر جرمنوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خونی انتقام کی یہ زیادہ ہلکی صورت سینکڑوں جاتیوں میں پائی جاتی ہے اور وہ گن نظام سے پیدا ہوئی ہے۔ مثال کے لئے مہمان نوازی کی طرح یہ رواج بھی امریکہ کے انڈینوں میں پایا جاتا ہے۔ جرمنوں میں مہمان نوازی کا جو حال ٹیسی ٹس نے بیان کیا ہے («جرمنیا» ۔ باب (۲۱) وہ چھوٹی موٹی باتوں

میں بھی تقریباً وھی ھے جو مارگن نے اپنے امریکی انڈینوں کے بارے میں بیان کیا ھے۔

ایک زمانہ میں اس بات پر بڑی گرم بحث چھڑی ھوئی تھی جو کبھی ختم ھونے کا نام ھی نہ لیتی تھی کہ ٹیسی ٹس کے وقت تک جرمنوں نے کھیتی کی زمین کا آخری طور پر بٹوارہ کر ڈالا تھا یا نہیں، اور اس سوال سے متعلق ٹیسی ٹس نے جو کچھ لکھا ھے اس کا کیا مطلب لگایا جائے۔ اب یہ بحث پرانی ھو چکی۔ اب یہ ثابت ھو گیا ھے کہ تقریباً سبھی قوموں میں شروع میں پورا گن اور بعد میں قدیم کمیونسٹی خاندانی برادریاں مل کر کھیتی کرتی تھیں اور سیزر نے اس وقت تک سوئیوی لوگوں میں یہ رواج پایا تھا۔ بعد میں زمین تقسیم کرنے کا رواج ھوا۔ اور تھوڑے دنوں بعد الگ الگ خاندانوں میں زمین کو نئے سرے سے بانٹ دیا جاتا تھا۔ جرمنی کے کچھ حصوں میں تو کھیتی کی زمین کو ایک مقررہ میعاد کے بعد پھر سے بانٹ دینے کا یہ رواج آج تک پایا جاتا ھے۔ یہ سب ثابت ھو جانے کے بعد اب اس بحث میں اور سر کھپانے کی ضرورت نہیں رھتی۔ سیزر کے زمانہ سے ٹیسی ٹس کے زمانہ تک کے ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں اگر جرمن لوگ اجتماعی کھیتی سے — سیزر نے صاف لفظوں میں کہا ھے کہ سوئیوی لوگوں میں زمین کا بٹوارہ یا انفرادی کھیتی نہیں ھوتی تھی — آگے بڑھ کر ھر سال زمین کو پھر سے بانٹنے اور انفرادی طریقے سے کھیتی کرنے لگے تھے تو ماننا پڑے گا

که انہوں نے کافی ترقی کی تھی۔ اتنے کم عرصہ میں اور بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اس حالت سے آگے بڑھ کر زمین کی مکمل طور پر نجی ملکیت کی منزل پر پہونچ جانا بالکل ناممکن تھا۔ لہذا میں ٹیسی ٹس کے لفظوں کا صرف یہی مطلب لگاتا ہوں جو اس نے لکھا ہے اور اس نے لکھا یہ ہے: جرمن لوگ ہر سال کھیتی کی زمین کو بدل دیتے ہیں (یا پھر سے بانٹ لیتے ہیں) اور ایسا کرنے کے دوران میں کافی اجتماعی زمین بچ جاتی ہے۔ کھیتی اور زمین کی ملکیت کی یہ حالت جرمنوں کے اس زمانہ کے گن دستور سے بالکل میل کھاتی ہے۔

مذکورۂ بالا پیراگراف کو میں نے بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح چھوڑ دیا ہے جس طرح وہ اس کتاب کے پرانے اڈیشنوں میں چھپا ہے۔ لیکن اس دوران میں سوال کا ایک اور پہلو سامنے آ گیا ہے۔ کوالفسکی نے یہ ثابت کر دیا ہے (دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ٤٤ *) کہ پدری اقتدار والی گھریلو برادری، مادری حق والے کمیونسٹی خاندان اور موجودہ زمانہ کے الگ الگ رہنے والے خاندان کو ملانے والی ایک درمیانی کڑی تھی اور اس حیثیت سے اگر یہ ہر جگہ نہیں پائی جاتی تو بھی اس کا بہت وسیع رواج تھا۔ جب سے یہ ثابت ہؤا ہے تب سے بحث اس بات پر نہیں رہی کہ زمین

* اینگلس نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ چوتھے جرمن اڈیشن کا ہے۔ دیکھئے اس جلد کا صفحہ ١١١ ۔ (اڈیٹر۔)

سب کی مشترکہ ملکیت تھی یا نہیں، جس پر ماؤرر اور
وئیز میں اب تک مباحثہ ہو رہا تھا، بلکہ اب سوال یہ ہے
کہ مشترکہ ملکیت کی کیا شکل تھی۔ اس میں ذرا بھی
شک نہیں کہ سیزر کے زمانہ میں سوئیوی لوگوں میں زمین
کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی بلکہ سب لوگ مل کر ساجھے
کی کھیتی کرتے تھے۔ ان لوگوں کی اقتصادی اکائی کیا
تھی، گن، گھریلو برادری یا خون کے رشتوں پر مبنی کوئی
درمیانی کمیونسٹی گروہ، یا زمین کے مختلف مقامی حالات کے
مطابق یہ تینوں ہی شکلیں پائی جاتی تھیں — ان سوالوں پر
ابھی بہت دنوں تک بحث چلتی رہے گی۔ کوالفسکی کا کہنا
ہے کہ ٹیسی ٹس نے جن حالات کا ذکر کیا ہے وہ مارک
یا دیہی برادری پر دلالت نہیں کرتے بلکہ گھریلو برادری
پر دلالت کرتے ہیں جو بہت آگے چل کر آبادی کے بڑھ
جانے کی وجہ سے دیہی برادری میں بدل گئی۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ رومیوں کے زمانہ میں جس
علاقہ میں جرمن بسے ہوئے تھے اور بعد میں جس علاقہ کو
انہوں نے رومیوں سے چھینا، وہاں جرمنوں کی بستیاں گاؤں
کی شکل میں نہیں تھیں بلکہ بڑی بڑی خاندانی برادریوں
کی شکل میں تھیں جن میں کئی پشت کے لوگ رہتے تھے،
جو زمین کے ایک کافی بڑے علاقے پر کھیتی کرتے تھے
اور اردگرد کی صحرائی زمین کو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ
مل کر مشترکہ مارک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ

بات صحیح مان لی جائے تو کھیتی کی زمین کو بدلنے کے بارے میں ٹیسی ٹس میں جو عبارت ہے، اس کا زرعی مفہوم لگانا ہوگا یعنی ہر گھریلو برادری ہر سال نئی زمین پر کھیتی کرتی تھی اور پچھلے سال کی جوتی ہوتی زمین کو ہل چلاکر خالی چھوڑ دیتی تھی یا اسے بالکل کام میں نہ لاتی تھی۔ چونکہ آبادی بہت کم تھی اس لئے صحرائی زمین کی کوئی کمی نہ تھی اور اس لئے زمین کے لئے کسی کو جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں کے بعد جب گھرانے کے ممبروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پیداوار کی اس وقت جو حالت تھی اس میں مل‌کر کھیتی کرنا ناممکن ہو گیا، تب کہیں ان گھریلو برادریوں کا شیرازہ منتشر ہوا۔ پہلے جو ساجھے کے کھیت اور چراگاہیں تھیں، انہیں ان الگ الگ گھرانوں میں جو اس وقت تک بن چکے تھے، مروجہ طریقہ کے مطابق بانٹ دیا گیا۔ شروع میں یہ بٹوارہ ایک مقررہ وقفہ کے بعد بار بار ہوتا تھا، پھر یہ ایک بار ہمیشہ کے لئے ہو گیا لیکن جنگل، چراگاہ، ندی نالے اور تالاب سبھی کی مشترکہ ملکیت رہے۔

جہاں تک روس کا تعلق ہے، ارتقاء کا یہ سلسلہ یہاں بھی تاریخی طور پر پوری طرح ثابت معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک جرمنی اور پھر ان ملکوں کا تعلق ہے جن میں جرمن لوگ رہتے تھے، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹیسی ٹس کے زمانہ میں بھی دیہی برادری کا وجود ماننے

کے پرانے خیال کے مقابلہ میں یہ خیال بنیادی مواد کی
زیادہ اچھی توجیہہ کرتا ہے اور مشکلات کو زیادہ آسانی
سے حل کرتا ہے۔ جرمنوں کی سب سے پرانی دستاویزوں
کو ــ مثال کے طور پر Codex Laureshamensis * کو ــ دیہی
مارک برادری کے مقابلہ میں گھریلو برادری کی بنیاد پر
زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اس خیال
سے نئی دشواریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور نئے مسائل
اٹھہ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہے۔ یہ
معاملہ مزید چھان بین کے بعد ہی طے ہو سکےگا۔ لیکن
میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بہت ممکن ہے کہ
جرمنی، اسکینڈینیویا اور انگلینڈ میں گھریلو برادری ایک
درمیانی منزل بھی رہی ہو۔

جہاں سیزر کے زمانہ میں جرمنوں نے ابھی حال میں
کسی حد تک بستی بناکر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی
اور کسی حد تک وہ مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے
مناسب جگھہ کی تلاش میں تھے، وہاں ٹیسی ٹس کے زمانہ
میں انہیں بستیوں میں جم کر رہتے ہوئے ایک پوری صدی
گذر چکی تھی۔ اس سے ذرائع زندگی کی پیدائش میں جو
ترقی ہوئی، اسے کوئی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ
لکڑی کے لٹھوں سے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔
ان کے لباس ابھی تک ابتدائی جنگلیوں کے سے تھے۔ وہ

---

* Codex Laureshamensis ۔ لارخ شہر کا زمینی رجسٹر۔
(اڈیٹر۔)

موٹے اونی لبادے اور جانوروں کی کھالیں پہنتے تھے۔ عورتیں اور شرفاء زیر جامہ کے لئے سن کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ ان لوگوں کی غذا تھی دودھ، گوشت، جنگلی پھل اور جیسا کہ پلینی نے بتایا ہے، جئی کا دلیا (جوکہ آج بھی آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ میں کیلٹ لوگوں کی قومی غذا ہے)۔ ان کی دولت گائے بیل تھی۔ مگر ان کی نسل اچھی نہیں تھی اور جانور چھوٹے چھوٹے، بےڈھنگے، بےڈول اور بغیر سینگوں کے ہوتے تھے۔ ان کے گھوڑے چھوٹے چھوٹے ٹٹوؤں جیسے ہوتے تھے جو تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ سکہ کا بہت کم استعمال ہوتا تھا اور وہ بھی بہت تھوڑی تعداد میں۔ صرف رومی سکہ ہی چلتا تھا۔ جرمن لوگ سونے یا چاندی کے سامان نہیں بناتے تھے اور نہ وہ ان دھاتوں کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ لوہے کی بہت کمی تھی اور کم سے کم رائن اور ڈنیوب دریاؤں کے کنارے رہنے والے لوگ اپنی ضرورت کا سارا لوہا باہر سے منگواتے تھے اور خود زمین سے نہیں نکالتے تھے۔ رونک رسم الخط (جو یونانی اور لاطینی حروف کی نقل کرکے لکھا جاتا تھا) صرف ایک خفیہ اشارتی ابجد کے طور پر محض مذہبی جادو ٹونے کے کام آتا تھا۔ انسانوں کی قربانی کرنے کی رسم ابھی تک جاری تھی۔ مختصر یہ کہ اس زمانہ میں جرمنوں نے بربریت کے درمیانی دور سے نکل‌کر آخری دور میں حال ہی میں قدم رکھا تھا۔ جن جرمن قبیلوں سے روم کے باشندوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا تھا اور

18—1093

اس لئے جو آسانی سے روم والوں کی صنعتی پیداوار حاصل
کر سکتے تھے، وہ دھات یا کپڑے کی خود اپنی صنعتیں
نہیں قائم کر پائے تھے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں
کہ بحیرۂ بالٹک کے ساحل پر رہنے والے شمال مشرقی قبیلوں
نے یہ صنعتیں قائم کر لی تھیں۔ شلزوگ کے دلدلی علاقہ
میں زرہ‌بکتر کے جو ٹکڑے ملتے ہیں — لوہے کی لمبی
تلوار، بکتر، چاندی کا خود وغیرہ جو چیزیں دوسری صدی
کے آخر کے رومی سکوں کے ساتھ ملی ہیں — اور لوگوں
کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے جرمنوں کے بنائے
ہوئے دھات کے سامان جو چاروں طرف پھیل گئے ہیں، وہ
سب ایک مخصوص قسم کی عمدہ کاریگری کے نمونے پیش
کرتے ہیں اور یہی بات ان چیزوں پر بھی صادق آتی ہے
جو رومی چیزوں کے نمونہ پر بنائی گئی تھیں۔ مگر جب
جرمن لوگ ترک وطن کرکے متمدن رومن ایمپائر میں آ بسے
تو ایک انگلینڈ کے سوا باقی سب جگہ ان کی اپنی صنعتیں
ختم ہو گئیں۔ ان صنعتوں کی ابتدا اور ان کی نشو و نما
کس قدر ایک ڈھنگ سے اور یکساں طور پر ہوئی تھی اس
کا ایک اچھا ثبوت ہے کانسے کا بنا ہوا بروچ۔ برگنڈی
میں، رومانیا میں اور آزف سمندر کے ساحل پر جو نمونے
ملے ہیں، وہ دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا وہ بھی
برطانیہ اور سویڈن کے کارخانوں میں بنائے گئے ہوں اور اس
میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی جرمن کاریگری کی پیداوار ہیں۔

ان لوگوں کا دستور بھی بربریت کے آخری دور کے
حسب حال تھا۔ ٹیسی ٹس کی روایت کے مطابق سرداروں

(principes) کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی جو کم اہمیت کے معاملوں کو طے کر دیتی تھی اور زیادہ اہم سوالوں کو عوامی اسمبلی کے سامنے فیصلہ کے لئے پیش کر دیتی تھی۔ بربریت کے ابتدائی دور میں کم سے کم ان لوگوں میں جن کی ہمیں واقفیت ہے، یعنی امریکہ کے انڈینوں میں، عوامی اسمبلی صرف گن میں ہوتی تھی۔ اس زمانہ تک قبیلے میں یا قبیلوں کے وفاق میں عوامی اسمبلی کا رواج نہیں شروع ہوا تھا۔ ایروکواس لوگوں کی طرح جرمنوں میں بھی کاؤنسل میں بیٹھنے والے سردار (principes) ابھی تک زمانۂ جنگ کے سرداروں (duces) سے صاف طور پر ممیز کئے جا سکتے تھے۔ ایک کو اپنے قبیلہ کے لوگوں سے تحفہ کے طور پر مویشی، غلہ وغیرہ ملنے لگا تھا اور وہ ابھی سے، ایک حد تک، اسی پر گذارا کرنے لگے تھے۔ امریکہ کی طرح یہاں بھی یہ لوگ ایک ہی خاندان سے چنے جاتے تھے۔ یونان اور روم کی طرح یہاں بھی پدری حق قائم ہو جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ تبدیلی ہوئی کہ جن عہدوں کے لئے پہلے انتخاب ہوا کرتا تھا، وہ اب موروثی بن گئے۔ اس طرح ہر گن میں شرفاء کا ایک خاندان پیدا ہو گیا۔ اس قدیم، نام نہاد قبائلی شرفاء کے طبقہ کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے نقل وطن یا ہجرت کے دوران میں یا اس کے تھوڑے ہی دنوں کے اندر ختم ہو گیا۔ فوجی قائد یا رہنما محض اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر چنے جاتے تھے۔ اس میں یہ خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ ان کی پیدائشی حیثیت کیا ہے۔ ان

کو اختیار بہت کم تھا اور اپنی بات منوانے کے لئے خود کام کرکے مثال پیش کرنی ہوتی تھی۔ جیسا کہ ٹیسی ٹس نے صاف لکھا ہے فوج کے اندر ڈسپلن قائم رکھنے کا اصلی اختیار پجاریوں کے ھاتھہ میں تھا۔ اصلی اقتدار عوامی اسمبلی کے ھاتھہ میں تھا۔ بادشاہ یا قبائلی سردار صدارت کرتا تھا۔ فیصلہ عوام کرتے تھے۔ زیرلب بڑبڑانے کا مطلب ہوتا تھا «نہیں» اور زور سے نعرے لگانے اور ہتھیار کھڑکھڑانے کا مطلب ہوتا تھا «ھاں»۔ عوامی اسمبلی عدالت کا کام بھی کرتی تھی۔ اس کے سامنے شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور ان کا فیصلہ کیا جاتا تھا اور سزائے موت تک دی جاتی تھی۔ موت کی سزا صرف بزدلی، غداری اور غیرفطری اخلاقی برائیوں کے لئے دی جاتی تھی۔ گن اور دوسری شاخیں بھی مقدموں کی شنوائی کرتی تھیں۔ ان کا سردار صدارت کرتا تھا۔ جرمنوں کی سبھی ابتدائی عدالتوں کی طرح یہاں بھی صدر کا کام صرف عدالت کی کارروائی کو چلانا اور جرح کرنا تھا۔ جرمنوں میں ہر جگہ اور ھمیشہ یہی رواج تھا کہ کسی جرم کی سزا پورا سماج دیتا تھا۔

سیزر کے زمانہ سے قبیلوں کے وفاق بننے لگے۔ ان میں سے بعضوں میں بادشاہ بھی ہونے لگے تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کی طرح ان لوگوں میں بھی سب سے بڑا سپہ سالار جلد ھی مطلق‌العنان حکمراں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی ان کے حوصلے پورے ہو جاتے تھے۔ اس طرح جو لوگ اقتدار حکومت غصب کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے

وہ اپنی مطلق‌العنان حکومت نہیں قائم کر پاتے تھے - لیکن پھر بھی وہ گن دستور کی بندشوں کو توڑنے لگے - جن غلاموں کو آزاد کر دیا جاتا تھا، ان کی گن دستور میں حیثیت عام طور پر نیچی ہوتی تھی کیونکہ وہ کسی گن کے ممبر نہیں ہو سکتے تھے - لیکن نئے بادشاہوں کی مہربانی سے یہ لوگ اکثر اونچے عہدے، دولت اور اعزاز حاصل کرتے تھے - رومن ایمپائر کی فتح کے بعد، ان فوجی رہنماؤں کے سلسلہ میں جو بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ بن گئے تھے، یہی بات ہوئی - فرینک لوگوں میں بادشاہ کے غلاموں اور آزاد کئے ہوئے لوگوں کا شروع میں دربار میں اور بعد میں پوری ریاست میں بڑا دبدبہ تھا - نئے امراء اور شرفاء کی ایک بڑی تعداد انہیں کی اولاد میں تھی -

بادشاہت کے ارتقاء میں ایک ادارے سے بہت مدد ملی اور وہ ادارہ تھا افراد کی اپنی اپنی فوج - ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح امریکی انڈینوں میں گنوں کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر جنگ چلانے کے لئے نجی جماعتیں بنائی جانے لگی تھیں - جرمنوں میں ان نجی جماعتوں نے مستقل حیثیت اختیار کر لی - اگر کوئی سپہ سالار شہرت حاصل کر لیتا تو لوٹ کے مال کے شوق میں جنگجو نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو جاتی - یہ لوگ ذاتی طور پر اس سے وفاداری کا عہد کرتے تھے اور وہ سپہ سالار ان سے - وہ انہیں کھانا دیتا تھا، تحفے تحائف دیتا تھا اور ایک درجہ کے نیچے دوسرے درجہ کے اصول پر ان کی تنظیم

کرتا تھا ۔ ایک باڈی گارڈ یا محافظ دستہ، چھوٹی موٹی لڑائیوں میں حصہ لینے کے لئے اور فوری طور پر میدان میں اتر آنے کے لئے ایک ٹکڑی اور بڑی لڑائیوں کے لئے فوجی افسروں کا تربیت یافتہ جتھہ ہوتا تھا ۔ یہ نجی فوجیں اگرچہ کافی کمزور ہوتی تھیں اور بعد میں یہ بات ثابت بھی ہو گئی ۔ مثال کے لئے اٹلی میں اوڈوآکر (Odoacer) کے تحت بھی ان کی کمزوری ثابت ہو گئی ــ لیکن پھر بھی انہوں نے قدیم عوامی آزادیوں کے لئے گھن کے کیڑے کا کام کیا اور لوگوں کی ہجرت یا نقل وطن کے دوران میں اور اس کے بعد بھی انہوں نے یہی کام پورا کیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو بادشاہت کے ارتقاء کے لئے انہوں نے مناسب زمین تیار کی اور دوسرے جیسا کہ ٹیسی ٹس نے کہا ہے، ان فوجوں کو بنائے رکھنے کے لئے انہیں ہمیشہ لڑائی اور لوٹ مار کی مہموں میں مصروف رکھنا ضروری تھا ۔ لوٹنا ان کا اصلی مقصد بن گیا ۔ اگر فوجی سردار کو اپنے آس پاس کے علاقہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں دکھائی دیتی تھی تو وہ اپنی فوجوں کو لے کر دوسرے ملکوں پر چڑھائی کر دیتا جہاں جنگ کرنے اور لوٹ کا مال حاصل کرنے کی گنجائش ہوتی ۔ جرمن امدادی فوجیں جو رومی جھنڈے کے نیچے خود جرمنوں سے بھی بڑی تعداد میں لڑتی تھیں، ایسے ہی نجی دستوں اور ٹکڑیوں سے بنی تھیں ۔ یہی وہ پہلا بیج تھا جس سے آگے چل کر

لینڈس کنخت* نظام کی پیدائش ہوئی جو جرمنوں کے لئے کلنک اور لعنت ثابت ہوا۔ رومی سامراج کی فتح کے بعد بادشاہوں کے یہ نجی فوجی بھی غلاموں اور روم کے درباریوں کی طرح بعد کے زمانہ کے شرفاء کا حصہ بن گئے۔

غرضکہ عام طور پر جرمن قبیلوں نے بھی مل کر جاتیوں کی شکل اختیار کی اور ان کا وہی دستور تھا جو سورمائی عہد کے یونانیوں میں اور رومیوں میں نام نہاد بادشاہوں کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ یعنی ان میں بھی اسی طرح کی عوامی اسمبلی، گن سرداروں کی کاؤنسل اور فوجی کمانڈر ہوا کرتے تھے جو سچ مچ کے بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ یہ ایک نہایت ترقی یافتہ دستور تھا جو کسی گن سماج میں قائم ہو سکتا تھا۔ وہ بربریت کے آخری دور کا معیاری دستور تھا۔ جیسے ہی سماج ان حدود کے باہر نکل گیا جن کے لئے وہ دستور موزوں تھا، ویسے ہی گن نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ گن نظام ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ ریاست نے لے لی۔

---

* لینڈس کنخت (Landsknecht) ۔ تنخواہ دار سپاہی ۔(اڈیٹر۔)

۸

جرمن لوگوں میں ریاست کا آغاز

ٹیسی‌ٹس کا کہنا ہے کہ جرمن لوگوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ الگ الگ جرمن جاتیوں کی تعداد کا کم و بیش اندازہ سیزر نے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اوسی‌پیٹن اور ٹینکٹیرن لوگوں کی تعداد عورتوں اور بچوں کو ملاکر ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ یہ لوگ دریائے رائن کے بائیں کنارے پر آ بسے تھے۔ اسی طرح ہر جاتی میں تقریبا ایک لاکھ آدمی ہوتے تھے*۔ ایروکواس

---

* دیودورس نے گال علاقہ کے کیلٹ لوگوں کے بارے میں جو بات لکھی ہے، اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے لکھا ہے: «گال علاقہ میں غیر مساوی قوت رکھنے والی کئی جاتیاں رہتی ہیں۔ سب سے بڑی جاتی کی تعداد دو لاکھ اور سب سے چھوٹی کی پچاس ہزار ہے۔» (Diodorus Siculus پانچواں باب، صفحہ ۲۵ -) اس سے سوا لاکھ کا اوسط نکلتا ہے۔ چونکہ کئی گال جاتیاں زیادہ ترقی کر چکی تھیں، اس لئے ان کی تعداد جرمنوں سے زیادہ رہی ہوگی۔ (نوٹ از اینگلس۔)

لوگ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی تعداد میں اس سے کہیں کم تھے۔ ان کی تعداد جب بیس ہزار بھی نہیں تھی تو وہ بڑی جھیلوں سے لےکر اوھیو اور پوٹومک تک کے پورے ملک میں لوگوں کے لئے ایک دھشت کی چیز بنے ہوئے تھے۔ اگر ہم رائن علاقہ کی الگ الگ جاتیوں کو جن کے بارے میں رپورٹوں کی بدولت ہماری واقفیت زیادہ ہے، نقشہ پر جمع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر جاتی اوسطاً پرشیا (Prussia) کے ایک موجودہ انتظامی ضلع کے برابر یعنی دس ہزار مربع کیلومیٹر یا ۱۸۲ جغرافیائی مربع میل کے علاقہ میں بسی ہوئی تھی۔ لیکن روم والے جس کو Germania Magna * کہتے تھے، جس کی سرحد دریائے وسٹولا تک پہونچتی تھی، اس کا رقبہ کم و بیش پانچ لاکھ مربع کیلومیٹر تھا۔ اگر ایک جاتی کے لئے اوسطاً ایک لاکھ کا حساب رکھا جائے تو Germania Magna کی کل آبادی ۵۰ لاکھ ہو جاتی ہے جو بربریت کی جاتیوں کے ایک گروہ کے لئے ذرا بڑی تعداد ہے، حالانکہ فی مربع کلومیٹر دس آدمی یا ایک جغرافیائی مربع میل کے لئے ۵۵۰ کی آبادی آج کل کی حالت کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ لیکن اس تعداد میں اس زمانہ کے تمام جرمن شامل نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گوتھہ نسل کی جرمن جاتیاں، یعنی باسترنین، پیوکی‌نین اور دوسری

---

*Germania Magna (جرمنیا میگنا) یعنی عظیم تر یا زیادہ بڑا جرمنی۔ (اڈیٹر۔)

جاتیاں کارپےتھین پہاڑوں کے کنارے کنارے دریائے ڈنیوب کے دھانے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کی تعداد اتنی بڑی تھی کہ پلینی نے انہیں جرمنوں کا پانچواں بنیادی قبیلہ کہا تھا۔ ۱۸۰ ق-م- میں یہ لوگ مقدونیہ کے بادشاہ پرسیئس کے تنخواہ دار سپاہیوں کا کام کرنے لگے تھے اور آگسٹس کے عہد حکومت کے شروع میں وہ ایڈریانوپل کے پاس تک بڑھ آئے تھے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان کی تعداد صرف دس لاکھ تھی تو سن عیسوی کے شروع میں جرمنوں کی کل تعداد ساٹھ لاکھ سے کم نہیں رہی ہوگی۔

جرمنی (Germanien) میں بس جانے کے بعد آبادی نہایت تیزی سے بڑھی ہوگی۔ اوپر جس صنعتی ترقی کا ذکر ہؤا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ شلیزوگ کے دلدل میں جو چیزیں ملی ہیں وہ تیسری صدی کی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کے ساتھ جو رومن سکے برآمد ہوئے ہیں، وہ اسی زمانہ کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری صدی تک بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں پر دھات اور کپڑے کی صنعت کافی ترقی کر چکی تھی، سلطنت روم کے ساتھ کافی تجارت ہوتی تھی اور دولتمند طبقہ نہایت عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ تمام باتیں بتاتی ہیں کہ آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اسی زمانہ میں جرمنوں نے دریائے رائن، رومن سرحدی فصیل اور دریائے ڈنیوب تک کی پوری سرحد پر، بحرشمالی سے

بحیرہ اسود تک عام دھاوا بول دیا۔ یہ اس بات کا براہ راست
ثبوت ہے کہ برابر بڑھتی ہوئی آبادی اپنے علاقوں سے باہر
نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کشمکش کے تین سو برس
کے عرصہ میں گوتھہ لوگوں کی اصلی جماعت (اسکینڈی‌نیویا
کے گوتھہ لوگوں اور برگنڈیوں کو چھوڑ کر) جنوب
مشرق کی طرف بڑھہ گئی اور اس حملہ کے مورچہ کا یہی
بایاں بازو بنا۔ شمالی جرمن لوگ (ھرمی‌نونین) اس مورچہ
کے وسط میں اوپری ڈنیوب تک بڑھہ آئے اور استی‌وونین
لوگ جو اس زمانہ تک فرینک کہلانے لگے تھے، دریائے
رائن کے کنارے کنارے اس مورچہ کے دائیں حصہ میں
بڑھہ آئے۔ برطانیہ کو فتح کرنے کا کام انگیوونی لوگوں
کے حصہ میں پڑا۔ پانچویں صدی کے آخر میں روم کی
کمزور و ناتوان اور بے یار و مددگار سلطنت کے دروازے جرمن
حملہ‌آوروں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کے ابواب میں ہم قدیم یونانی اور رومی تمدن
کے گہوارے کے پاس کھڑے تھے۔ اب ہم اس کی قبر کے
پاس کھڑے ہیں۔ کئی صدیوں سے بحیرۂ روم کے تمام ملکوں
پر روم کی عالمگیر طاقت کا رندا چل‌چل‌کر ان کی تمام
امتیازی خصوصیات مٹاتا جا رہا تھا۔ ان چند جگہوں کو چھوڑ کر
جہاں یونانی زبان نے اس کا مقابلہ کیا، تمام قومی زبانیں
ایک خراب اور بگڑی ہوئی لاطینی سے مغلوب ہوکر پیچھے
ہٹ گئیں۔ قومیتوں کا کوئی امتیاز اور فرق باقی نہیں
رہا۔ نہ کوئی گال تھا، نہ ایبیرین، نہ لیگورین تھا اور نہ

ناریکن ـــ سب رومن ہو گئے تھے ـ رومی نظم و نسق اور رومی قانون نے ہر جگہ خون کے رشتوں یا سگوتری کی پرانی جماعتوں کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا، اور مقامی اور قومی خود اختیاری کے آخری آثار کو بھی مٹا دیا تھا ـ نوساختہ اور نوایجاد رومنیت اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی تھی ـ یہ کسی قومیت کا نہیں بلکہ قومیت نہ ہونے کا اظہار تھا ـ نئی قوموں کی تعمیر کے عناصر ہر جگہ موجود تھے ـ مختلف صوبوں کی لاطینی بولیوں کا فرق روز بروز بڑھتا گیا ـ جن قدرتی سرحدوں نے کسی زمانہ میں اٹلی، گال، اسپین، افریقہ کو الگ الگ آزاد ملک بنایا تھا، وہ آج بھی موجود تھیں اور ان کا اثر بھی پڑ رہا تھا ـ پھر بھی کہیں کوئی ایسی قوت نہیں تھی جو ان عناصر کو ملا کر نئی قوموں کی تخلیق کرتی ـ ترقی کی صلاحیت کے کہیں کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے تھے اور نہ مقابلہ کی کہیں کوئی طاقت نظر آتی تھی ـ ایسی صورت میں تخلیقی قوت کی بھلا کیا گنجائش ہو سکتی تھی ـ اس وسیع علاقہ کی کثیر انسانی آبادی کو ایک شیرازہ میں باندھہ رکھنے والی چیز ایک ہی تھی اور وہ تھی رومی ریاست اور وہی کچھہ زمانہ گذرتے گذرتے ان کی بدترین دشمن اور ان پر ظلم ڈھانے والی بن گئی تھی ـ صوبوں نے روم کو برباد کر دیا تھا ـ روم خود بھی اور شہروں کی طرح ایک صوبائی شہر بن گیا ـ اسے کچھہ مخصوص حقوق اب بھی حاصل تھے مگر اب وہ حکومت نہیں کرتا تھا، وہ اب ایک عالمگیر سلطنت کا مرکز نہیں تھا، وہ اب شہنشاہوں اور

نائب شہنشاہوں کی راجدھانی بھی نہیں تھا کیونکہ وہ تو اب قسطنطنیہ، تریویس اور میلان میں رہنے لگے تھے۔ رومی ریاست اب ایک بھاری بھرکم اور پیچیدہ مشین ہو گئی تھی جس کا واحد مقصد اپنی رعایا کا استحصال کرنا تھا۔ ریاست ان سے ٹیکس اور خدمتیں لیتی اور طرح طرح کے محصول وصولتی تھی جس کی وجہ سے لوگ روزبروز افلاس کے گڑھے میں دھنستے گئے۔ سلطنت کے پروکیوریٹر، ٹیکس وصولنے والے افسر اور سپاہی عوام کے ساتھ جیسی زبردستی کرتے تھے، اس سے یہ دباؤ اور بوجھ اور بھی ناقابل برداشت ہو گیا۔ روم کی ریاست نے اپنا عالمگیر تسلط قائم کرکے یہ حالت کر رکھی تھی۔ اس کے قائم رہنے کا جواز یہ بتلایا جاتا تھا کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور ملک کو باہر کے بربریوں کے حملوں سے بچانے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا نظم اور امن و امان بدترین بدنظمی اور بدامنی سے بھی بدتر تھا۔ اور جن بربر لوگوں سے ریاست اپنے شہریوں کو بچانے کا دعوی کرتی تھی، ان کو انہیں شہریوں نے اپنا نجات دھندہ سمجھا اور ان کا خیرمقدم کیا۔

سماجی حالات بھی کم خراب نہیں تھے۔ ری‌پبلک کے آخری برسوں میں ھی رومی حکومت کی بنیاد مفتوحہ صوبوں کے بدترین استحصال پر تھی۔ شہنشاہوں نے اس استحصال کو ختم نہیں کیا تھا بلکہ الٹے اسے منظم اور باقاعدہ کر دیا۔ جتنا زیادہ سلطنت کا زوال ہوتا گیا اتنا ھی زیادہ ٹیکس اور جبری خدمتیں بڑھتی گئیں اور سرکاری افسر اتنا ھی

زیادہ بے شرمی کے ساتھہ لوگوں کو لوٹنے اور ستانے لگے۔
تجارت اور صنعت سے رومیوں کو کبھی کوئی تعلق نہیں
تھا ۔ وہ تو پوری کی پوری قوموں پر حکم چلایا کرتے تھے ۔
وہ صرف سود خوری میں اپنے پہلے اور بعد کے سبھی لوگوں سے
بڑھے ہوئے تھے ۔ تھوڑی بہت تجارت جو تھی اور جس نے
کچھہ دنوں تک کسی طرح اپنے آپ کو قائم رکھا تھا، وہ
سرکاری لوٹ کھسوٹ کی بدولت برباد ہو رہی تھی ۔ جو
کچھہ بچ رہی تھی وہ سلطنت کے مشرقی یعنی یونانی حصہ
میں تھی لیکن وہ ہمارے موجودہ مطالعہ کے دائرے سے باہر
ہے ۔ افلاس عام تھا ۔ تجارت، دستکاری، فنون اور آبادی کا
زوال ہو رہا تھا، شہر انحطاط پذیر تھے، زراعت میں بھی
تنزل ہو رہا تھا اور وہ نیچے درجہ پر پہونچ چکی تھی ۔
رومیوں کے عالمگیر تسلط کا آخری نتیجہ یہی تھا ۔

قدیم زمانہ میں ہر جگہ پیداوار کی سب سے اہم اور
فیصلہ‌کن شاخ زراعت تھی ۔ اس کی اہمیت اب پہلے سے
کہیں زیادہ بڑھہ گئی ۔ اٹلی میں بڑی بڑی جاگیروں (لیٹی‌فنڈیا)
کو جو ری‌پبلک کے خاتمہ کے زمانہ سے تقریباً سارے علاقہ
پر چھائی ہوئی تھیں، دو طرح سے استعمال کیا جاتا تھا ۔
ایک تو چراگاہ کے طور پر، جس پر سے آبادی کو ہٹاکر
بھیڑیں اور بیل پالے جانے لگے تھے جن کی دیکھہ بھال کے
لئے بہت تھوڑے سے غلاموں کی ضرورت تھی ۔ اور یا ایسی
جاگیروں کے طور پر جن پر بہت سے غلاموں کی مدد سے
بڑے پیمانہ پر باغبانی کی جاتی تھی ۔ ان کی پیداوار کچھہ

تو مالکوں کے اپنے عیش و آرام کی ضرورت پوری کرنے کے کام آتی تھی اور کچھ شہروں کے بازاروں میں فروخت کی جاتی تھی۔ بڑی بڑی چراگاہوں کو قائم رکھا گیا تھا اور کسی حد تک بڑھایا بھی گیا تھا۔ لیکن مالکوں کے افلاس اور شہروں کے زوال کی بدولت یہ جاگیریں اور باغبانیاں بھی تباہی کا شکار ہو گئیں۔بڑی بڑی جاگیروں (لیٹی‌فنڈیا) کا یہ اقتصادی نظام جس کی بنیاد غلاموں کے کام پر تھی، اب نفع بخش نہیں رہا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں بڑے پیمانہ پر کھیتی کا کام کرنے کی یہی ایک ممکن صورت تھی۔چھوٹے پیمانہ کی کھیتی ھی ایک بار پھر اس کی تنہا نفع بخش صورت رہ گئی۔ یکے بعد دیگرے بڑی بڑی کھیتیاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئیں اور انہیں موروثی اسامیوں کے ہاتھوں پٹے پر دے دیا گیا جو ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے یا partiarii کے سپرد کر دیا گیا جو اسامی نہیں بلکہ زراعت کے مینجر ہؤا کرتے تھے اور جنہیں اپنے کام کے لئے چھ میں صرف ایک یا نو میں صرف ایک حصہ ملتا تھا۔ لیکن زیادہ‌تر یہ چھوٹے چھوٹے قطع کولونی (coloni) کو دئے جاتے تھے جو سالانہ ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔ وہ زمین سے وابستہ ہوتے تھے اور انہیں ان قطعات کے ساتھ ھی فروخت کیا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ غلام نہیں تھے لیکن وہ آزاد بھی نہیں تھے۔ وہ آزاد شہریوں سے شادی بیاہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آپس کی شادی، شادی نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ جیسا کہ غلاموں میں ہوتا تھا اس کی حیثیت محض

داشتہ گیری (contubernium) کی تھی۔ وہ ازمنۂ وسطی کے زرعی غلاموں کے پیش‌رو تھے۔

قدیم زمانہ کا غلامی کا نظام متروک ہو گیا۔ نہ تو دیہات کی بڑے پیمانہ کی کھیتی میں اور نہ شہروں کے دستی صنعت و حرفت کے کارخانوں میں اس غلامی کے نظام سے کوئی قابل ذکر منافع ہوتا تھا۔ اس کی پیداوار کے لئے کوئی بازار نہیں رہ گیا تھا۔ چھوٹے پیمانہ کی زراعت یا دستکاری میں زیادہ غلاموں کی گنجائش نہیں تھی۔ اور سلطنت کی خوشحالی کے زمانہ کی عظیم‌الشان پیداوار اب گھٹ کر چھوٹے پیمانہ کی زراعت اور دستکاری کی صورت میں رہ گئی تھی۔ سماج میں غلاموں کی ضرورت صرف امیروں کے گھریلو کاموں اور عیش و آرام کے لئے تھی۔ لیکن غلامی کا دم توڑتا ہوا نظام اب بھی اتنا جاندار تھا کہ پیداوار کا تمام کام بظاہر غلاموں کا کام معلوم ہوتا تھا جو آزاد رومنوں کے شایان شان نہیں تھا۔ اور اب ہر شخص ایک آزاد رومن تھا۔ ایک تو یہ وجہ تھی جس سے غیرضروری طور پر غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور یہ غلام چونکہ ایک بوجھ بن گئے تھے اس لئے انہیں آزاد کر دیا گیا۔ دوسری طرف کولونی اور بھک منگے آزادوں کی تعداد بڑھی۔ (ان بھک منگوں کی حیثیت وہی تھی جو امریکہ کی سابقہ غلام رکھنے والی ریاستوں میں افلاس زدہ سفیدفام لوگوں «poor whites» کی تھی)۔ قدیم غلامی کے اس طرح رفتہ رفتہ مٹنے کا عمل عیسائیت کا مرہون منت نہیں

ہے۔ عیسائیت نے صدیوں تک سلطنت روم میں غلامی کے نظام کے مزے لوٹے اور بعد میں بھی عیسائیوں کی غلاموں کی تجارت کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ نہ تو شمال میں جرمنوں کی، نہ بحیرۂ روم میں وینیشیا والوں کی تجارت کو اور نہ بعد کے زمانہ میں حبشی غلاموں کی تجارت کو روکنے کے لئے کچھہ کیا*۔ غلام رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا اور اس لئے یہ نظام مٹ گیا۔ لیکن مرتی ہوئی غلامی نے اپنا زہریلا اثر چھوڑا جس کی وجہ سے پیداوار کا سارا کام آزاد مردوں کے لئے ذلت‌آور رسوائی کا کام سمجھا جانے لگا۔ رومیوں کی دنیا ایک اندھی گلی میں پھنس گئی جس سے نکل‌کر آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ غلامی کا نظام اقتصادی حیثیت سے ناممکن ہو چکا تھا لیکن آزاد آدمیوں کے کام کرنے کو اخلاقی طور پر معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان میں سے پہلی چیز اب سماجی پیداوار کی بنیادی شکل رہ نہیں سکتی تھی، اور دوسری ابھی اس کی بنیادی شکل بن نہیں سکتی تھی۔ ایسی صورت میں صرف ایک مکمل انقلاب ہی کچھہ مدد کر سکتا تھا۔

صوبوں میں بھی حالات اس سے کچھہ بہتر نہیں تھے۔ ہمارے پاس جو رپورٹیں ہیں وہ زیادہ‌تر گال کے متعلق

---

*کریمونا کے پادری لیوٹپراند کا کہنا ہے کہ دسویں صدی میں وردون کی یعنی مقلس جرمن شہنشاہیت کی سب سے اہم صنعت ہیجڑے یا خواجہ سرا تیار کرنا تھا، جنہیں مور لوگوں کے حرم سرا کے لئے اسپین بھیج‌کر بہت نفع حاصل کیا جاتا تھا۔ (نوٹ از اینگلس۔)

ہیں۔ کولونی کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے آزاد کسان ابھی وہاں موجود تھے۔ سرکاری افسروں، ججوں اور سودخوروں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کے لئے اکثر وہ ذی‌اقتدار اور طاقتور لوگوں کی پناہ اور سرپرستی میں چلے جاتے تھے۔ اور ایسا وہ الگ الگ انفرادی طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ پورا کا پورا گروہ یا برادری کرتی تھی۔ اور اس کا رواج اتنا بڑھا کہ چوتھی صدی میں شہنشاہوں کو اکثر یہ فرمان صادر کرنا پڑتا تھا کہ ایسا کرنے کی ممانعت ہے۔ جو لوگ پناہ قبول کرتے تھے انہیں اس سے کیا مدد ملتی تھی؟ سرپرست کی شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمینوں کا حق ملکیت اس کے نام منتقل کر دیں اور اس کے بدلے میں وہ انہیں زندگی بھر اس زمین پر کھیتی کرنے کا حق دیتا تھا۔ یہ چال مقدس کلیسا کو بھی یاد تھی اور نویں اور دسویں صدی میں اس نے خدا کی عظمت اور اپنی زمینداری دونوں کو بڑھانے کے لئے نہایت آزادی سے اس سے کام لیا۔ لیکن اس زمانہ میں یعنی ۴۷۵ء کے لگ بھگ مارسیلیز کے پادری سالویانس نے اس لوٹ کی بڑی سختی سے مذمت کی۔ اس نے بتایا ہے کہ رومن افسروں اور بڑے زمینداروں کے مظالم اس حد تک ناقابل برداشت ہو چکے تھے کہ بہت سے «رومن» بھاگ کر ان ضلعوں میں چلے گئے جن پر بربریوں کا قبضہ تھا اور وہاں جو رومن شہری آ بسے تھے وہ کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا دوبارہ رومن حکومت کی ماتحتی میں جانے سے۔ غریب

ماں باپ اس زمانہ میں اکثر اپنے بچوں کو غلام بناکر بیچ دیا کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو روکنے کے لئے ایک قانون بنایا گیا تھا۔

رومیوں کو خود ان کی ریاست سے آزاد کرنے کے معاوضہ میں بربر جرمنوں نے ان کی زمین کا دو تہائی حصہ خود لے لیا اور اس کو آپس میں بانٹ لیا۔ یہ بٹوارہ گن نظام کے قاعدے کے مطابق کیا گیا۔ فاتحوں کی تعداد چونکہ نسبتاً کم تھی، اس لئے بہت سی زمینوں کا بٹوارہ نہیں ہؤا اور وہ کچھ تو پوری جاتی کی اور کچھ قبیلوں اور گنوں کی اجتماعی ملکیت رہیں۔ ہر گن میں کھیت اور چراگاہوں کو قرعہ ڈال کر مساوی حصوں میں مختلف انفردای گھرانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس زمانہ میں بٹوارہ بار بار ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن بہرحال رومی صوبوں میں یہ رواج تھوڑے ہی دنوں میں بند ہو گیا۔ اور الگ الگ گھرانوں کو جو زمین دی گئی تھی وہ ان کی نجی ملکیت ہو گئی جسے ایلوڈیم کہتے تھے۔ جنگل اور چراگاہ کا بٹوارہ نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں سب مل کر ساجھے میں استعمال کرتے تھے۔ اس کا استعمال اور تقسیم کی ہوئی زمین پر کھیتی کرنے کا طریقہ قدیم رواج اور پورے سماج کی رائے سے طے کیا جاتا تھا۔ کوئی گن اپنے گاؤں میں جتنے زیادہ دنوں تک رہ جاتا تھا اور زمانہ گذرنے پر جرمن اور رومن جتنا زیادہ آپس میں گھل مل جاتے تھے اتنا ہی زیادہ یک جدی رشتہ یا سگوتری کا ناتہ، ایک جگہ رہنے کے

تعلق کے مقابلہ میں کمزور ہوکر پیچھے ہٹتا گیا۔ مارک کمیونٹی میں گن گم ہو گئے لیکن اس میں ممبروں کی ابتدائی یک‌جدی رشتہ داری کے کافی اثرات دکھائی دیتے تھے۔ غرضکہ کم سے کم ان ملکوں میں جہاں مارک کمیون کو قائم رکھا گیا تھا یعنی شمالی فرانس، انگلینڈ، جرمنی اور اسکینڈی نیویا میں گن دستور کو غیرمحسوس طریقے پر علاقائی دستور میں بدل دیا گیا اور اس طرح وہ اس قابل ہو گیا کہ ریاست کے ساتھہ میل کھا سکے۔ پھر بھی اس کی فطری جمہوریت باقی رہی جوکہ پورے گن نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ غرضکہ اس طرح بعد کے اس زمانہ میں بھی جبکہ اسے زبردستی انحطاط کے گڑھے میں دھکیل دیا گیا تھا، اس نے گن دستور کے ایک ٹکڑے کو بچائے رکھا اور اس طرح مظلوموں کے ھاتھہ میں ایک ایسا حربہ چھوڑ دیا جو موجودہ زمانہ میں بھی استعمال کے لئے تیار ہے۔

گن میں خون کے رشتوں کی اہمیت اتنی جلدی ختم ہو گئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قبیلے میں اور پوری جاتی میں بھی سلطنت روم کو فتح کر لینے کے بعد وہ ادارے کمزور پڑ گئے جو خون کے رشتوں پر مبنی تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ محکوم لوگوں پر حکومت کرنا گن دستور سے میل نہیں کھاتا۔ یہاں یہ بات بہت بڑے پیمانہ پر دکھائی پڑتی ہے۔ جرمن جاتیاں اب رومی صوبوں کی مالک تھیں۔ انہیں اپنی فتح کو منظم شکل دینی تھیں۔ لیکن رومیوں کی کثیر آبادی کو وہ نہ تو اپنے گن کے اداروں میں شامل کر سکتے تھے اور نہ ان

اداروں کی مدد سے ان پر حکومت کر سکتے تھے۔ رومیوں کے مقامی حکومتی ادارے شروع میں جرمنوں کی فتح کے بعد بھی کام کرتے رہے تھے۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ ان کے اوپر کوئی ایسی تنظیم ہو جو رومی ریاست کی جگہ لے سکے۔ یہ دوسری ریاست ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے گن دستور کے اداروں کو ریاست کے اداروں میں بدلنا ضروری تھا اور حالات کے دباؤ کی بدولت اسے بہت جلدی میں کرنا پڑا۔ لیکن فاتح جاتی کا پہلا نمائندہ ایک فوجی کمانڈر تھا۔ مفتوحہ علاقہ کی اندرونی اور بیرونی حفاظت کا تقاضہ تھا کہ اس کے اختیارات کو بڑھایا جائے۔ فوجی قیادت کو بادشاہت میں بدلنے کا وقت آ گیا تھا۔ یہ کر دیا گیا۔

فرینک لوگوں کی سلطنت کو لیجئیے۔ یہاں نہ صرف رومی ریاست کا وسیع علاقہ فاتح سالین جاتی کو مل گیا تھا بلکہ زمین کے تمام ایسے بہت بڑے بڑے قطعات بھی، خاص کر بڑے بڑے جنگل جو بڑی یا چھوٹی گاؤ اور مارک برادریوں میں نہیں بانٹے گئے تھے، انہیں مل گئے تھے۔ ان پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔ فرینک لوگوں کے بادشاہ نے جو ایک معمولی فوجی کمانڈر سے بڑھ کر سچ مچ کا بادشاہ بن گیا تھا، پہلا کام یہ کیا کہ عوام کی اس ملکیت کو شاہی جاگیر بنا دیا، اس زمین کو عام لوگوں سے چھین لیا اور اسے اپنے ذاتی خدمت گذاروں کو انعام یا جاگیر کے طور پر دے دیا۔ اس کے ذاتی خدمتگذاروں میں پہلے صرف اس کی نجی فوج کے سپاہی اور فوج کے باقی تمام نائب سالار ہؤا کرتے تھے۔ بعد

میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ان میں نہ صرف روم کے لوگ یعنی گال علاقہ کے وہ باشندے شامل ہو گئے جو رومی بن گئے تھے اور بادشاہ کے لئے بہت ضروری ہو گئے تھے کیونکہ وہ لکھنے کا فن جانتے تھے، پڑھے لکھے تھے اور ملک کے قوانین کے ساتھ ساتھ روم والوں کی بول چال کی زبان اور ادبی لاطینی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں ان کے علاوہ غلام، زرعی غلام اور غلامی سے آزاد کئے ہوئے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ وہ بادشاہ کے درباری بن گئے تھے اور انہیں میں سے وہ اپنے پسندیدہ مصاحب چنا کرتا تھا۔ انہیں تمام لوگوں کو عوامی زمین کے قطعات دئے گئے — پہلے زیادہ‌تر عطیہ کے طور پر اور بعد میں بینی‌فس* کی صورت میں۔ شروع میں یہ زمینیں زیادہ‌تر بادشاہ کی زندگی بھر کے لئے دی جاتی تھیں۔ اور اس طرح عوام کی لوٹ پر شرفاء کے ایک نئے طبقہ کی بنیاد رکھی گئی۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی سلطنت پر قدیم گن دستور کے مطابق حکومت نہیں کی جا سکتی تھی۔ سرداروں کی کاؤنسل، اگر بہت پہلے متروک نہ بھی ہو گئی ہو، تو اب منعقد نہیں کی جا سکتی تھی اور جلد ہی بادشاہ کے مستقل خدمتگذاروں اور مصاحبوں نے اس کی جگہ لے لی۔ قدیم عوامی اسمبلی کو بظاہر اب بھی قائم

---

* بینی‌فس — زمین کا عطیہ جو فرانکی بادشاہ اپنے خدمتگذاروں کو بطور انعام دیا کرتے تھے۔ (اڈیٹر۔)

رکھا گیا مگر وہ زیادہ سے زیادہ فوج کے نائب کمانڈروں اور
نئے ابھرتے ہوئے عمائدین کی مجلس بنتی گئی۔ جس طرح
روم کے کسان ری پبلک کے آخری دنوں میں برباد ہو گئے
تھے اسی طرح متواتر خانہ جنگیوں اور غیرملکی جنگوں کی
بدولت، خاص کر شارلی مین کے عہد میں زمین کے مالک آزاد
کسان یعنی کثیر فرینک عوام افلاس اور تنگدستی کا شکار
ہو گئے۔ ابتدا میں پوری فوج انہیں کسانوں پر مشتمل تھی۔
فرینکی علاقہ کی فتح کے بعد بھی وہی اس کی ریڑھ کی
ہڈی تھے۔ لیکن نویں صدی کی ابتدا میں وہ اس قدر افلاس زدہ
ہو چکے تھے کہ بمشکل پانچ میں سے ایک اپنے لئے
سامان جنگ فراہم کر سکتا تھا۔ پہلے کی سی فوج جس میں
براہ راست بادشاہ کی طلب پر آزاد کسان آتے تھے، اب نہیں
رہی۔ اس کی جگہ ایک ایسی فوج نے لے لی جو نوخیز
دولتمند جماعت کے تنخواہ دار خدمتگذاروں پر مشتمل تھی۔ ان
میں ویلین بھی تھے جو ان کسانوں کی اولاد تھے جو پہلے
بادشاہ کے سوا اور کسی کو اپنا آقا نہیں مانتے تھے اور اس
سے بھی کچھ پہلے کسی کو اپنا آقا نہیں مانتے تھے، بادشاہ
کو بھی نہیں۔ شارلی مین کے جانشینوں کے عہد میں فرینکی
کسانوں کی بربادی مکمل ہو گئی۔ اس کی وجہ کچھ تو
اندرونی جنگیں تھیں، کچھ شاہی اقتدار کی کمزوری تھی اور
اس کے ساتھ ساتھ دولتمندوں کا غاصبانہ رویہ تھا جن کی صف
میں اب گاؤ کاؤنٹ (gau counts) بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ لوگ
شارلی مین کے بنائے ہوئے تھے اور اپنے عہدے کو موروثی

شکل دینا چاھتے تھے۔ اور آخر میں نارمنوں کے حملوں نے جو کمی تھی پوری کر دی۔ شارلی مین کی موت کے پچاس برس بعد فرینکی سلطنت نارمنوں کے قدموں پر اسی طرح لاچار پڑی تھی جس طرح چار سو برس پہلے رومی سلطنت فرینکوں کے قدموں تلے پڑی تھی۔

فرینکی سلطنت اس وقت صرف بیرونی حملہ‌آوروں کے سامنے ھی بے بس نہیں تھی۔ سماج کے اندرونی نظام یا سچ پوچھئے تو بدنظمی کا بھی یہی حال تھا۔ آزاد فرینکی کسانوں نے اپنے آپ کو اسی حالت میں پایا جس میں ان کے پہلے کے لوگ یعنی رومن کولونی تھے۔ جنگ اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے برباد ھونے پر انہیں مجبوراً نئے دولتمند لوگوں یا کلیسا کی پناہ لینی پڑی کیونکہ شاھی اقتدار بہت کمزور تھا اور ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں اس پناہ اور حفاظت کی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اپنے سے پہلے کے گال کسانوں کی مانند انہیں بھی اپنی زمین میں ملکیت کا حق اپنے سرپرستوں کو دے دینا پڑا اور انہیں یہ زمین مختلف اور متفرق صورتوں میں آسامی کی حیثیت سے جوتنے کے لئے واپس مل گئی۔ لیکن ھمیشہ شرط یہ ھوتی تھی کہ وہ اپنے سرپرست کی خدمتگذاری کریں اور لگان ادا کریں۔ ایک مرتبہ جب وہ اس طرح کی محتاجی کی حالت میں پڑ گئے تو رفتہ رفتہ ان کی ذاتی آزادی ختم ھو گئی۔ چند پشت کے بعد ان میں سے زیادہ‌تر لوگ زرعی غلام بن گئے۔ کتنی تیزی سے

آزاد کسانوں کا زوال ہوا، اس کا اندازہ ایبے سینٹ ژرمین دی پرنے کی زمین کے بارے میں ارمینان کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ یہ جگہ اس زمانہ میں پیرس کے قریب تھی، اب اس کے اندر ہے۔ شارلی مین کی زندگی میں بھی اس ایبے کی وسیع و عریض جاگیر پر جو آس پاس کے گاؤں میں دور تک پھیلی ہوئی تھی، ۲۷۸۸ گھرانے آباد تھے۔ یہ تقریباً سب کے سب فوینکی گھرانے تھے مگر ان کے نام جرمن تھے۔ ان میں سے ۲۰۸۰ کولونی تھے، ۳۵ لیتی تھے، ۲۲۰ غلام تھے اور صرف ۸ آزاد گھرانے تھے! وہ رواج جس کی بدولت سرپرست نے کسانوں کی زمین اپنے نام منتقل کر لی تھی اور انہیں صرف زندگی بھر استعمال کرنے کا حق دیا تھا، وہ رواج جسے سالویانس نے گناہ قرار دیا تھا اور اس کی مذمت کی تھی، اب عام ہو گیا تھا اور کسانوں سے معاملہ کرنے میں کلیسا ہر جگہ اسی پر عمل کرتا تھا۔ سامنتی غلامی اور خدمتگذاری کی شکل جس کا اب زیادہ سے زیادہ رواج ہوتا جا رہا تھا، رومی «انگاریئے» (angariae) یعنی ریاست کے لئے جبری خدمات کے نمونے سے اسی حد تک مشابہ تھی جس حد تک جرمن مارک کی خدمت کے نمونہ سے، جس میں مارک کے ممبر پل اور سڑک بنانے اور اجتماعی مقصد کے دوسرے کاموں کے لئے محنت کرتے تھے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چار سو برس کے بعد آبادی کی کثیر تعداد اسی جگہ پہونچ گئی جہاں سے چلی تھی۔

لیکن اس سے دو ہی باتیں ثابت ہوتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ سلطنت روم کے زوال کے زمانہ میں سماج کی طبقہ بندی اور ملکیت کی تقسیم جس طرح ہوئی وہ اس وقت کی زراعت اور صنعت کی پیداوار کی حالت کے عین مطابق تھی اور اس لئے ناگزیر تھی۔ دوسرے یہ کہ اگلے چار سو برس کے دوران میں پیداوار کی اس حالت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی، نہ تو اس میں کوئی انحطاط ہؤا اور نہ ترقی ہوئی۔ اور اس لئے اس کی بدولت ناگزیر طور پر ملکیت کی وہی تقسیم اور آبادی کی وہی طبقاتی درجہ بندی قائم ہوئی۔ سلطنت روم کی آخری صدیوں میں دیہات پر شہر کا غلبہ ختم ہو چکا تھا۔ اور جرمن حکومت کی ابتدائی صدیوں میں بھی یہ غلبہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زراعت نہایت پس ماندہ حالت میں تھی۔ اور یہی حال صنعت کا بھی تھا۔ اس عام حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف بڑے بڑے حکمران زمیندار ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ماتحت چھوٹے چھوٹے کسان ہوتے ہیں۔ ایسے سماج میں نہ تو غلاموں کی محنت کے سہارے چلنے والی بڑی بڑی جاگیروں (latifundian) کی رومی معیشت کا قلم لگایا جا سکتا ہے اور نہ وہاں زرعی غلاموں کی محنت کے سہارے بڑے پیمانے کی نئی کھیتی کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہے کہ شارلیمین نے اپنی مشہور شاہی جاگیروں پر بڑے پیمانے کی کھیتی کے جو تجربے کئے، ان کا بعد میں کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ صرف خانقاہوں

نے ان تجربوں کو جاری رکھا اور صرف انہیں کے لئے وہ نفع بخش ثابت ہوئے۔ لیکن عیسائی مذہب کی یہ خانقاہیں غیرمعمولی قسم کے سماجی ادارے تھے جن کی بنیاد رہبانیت اور تجرد پر رکھی گئی تھی۔ وہ سماج کی عام نشوونما سے الگ غیرمعمولی کام کر سکتے تھے اور خود محض ایک مستثنی حیثیت رکھتے تھے۔

پھر بھی ان چار سو برسوں میں کچھ ترقی ضرور ہوئی۔ اس عہد کے آخر میں اگرچہ ہمیں تقریباً وہی خاص طبقے دکھائی دیتے ہیں جو شروع میں دکھائی دئے تھے تب بھی اتنا ضرور ہوا تھا کہ یہ طبقے جن لوگوں سے مل کر بنے تھے وہ لوگ بدل گئے تھے۔ پرانی غلامی ختم ہو چکی تھی۔ وہ افلاس زدہ اور تنگدست آزاد شہری بھی نہیں رہے تھے جو کام کو غلامی کی علامت سمجھتے تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ روم کے کولونی اور نئے زرعی غلاموں کے درمیان آزاد فرینکی کسان کھڑا تھا۔ مرنے والی رومنیت کی «لاحاصل یادیں اور بے سود جھگڑے» کب کے مر چکے تھے اور انہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ نویں صدی کے سماجی طبقوں کی تشکیل کسی انحطاط پذیر تمدن کے دلدل میں نہیں بلکہ ایک نئے تمدن کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ نئی نسل کے لوگ کیا مالک اور کیا خدمت گار، دونوں ہی اپنے رومی پیش رؤوں کے مقابلہ میں مرد تھے۔ ان کے مقابلہ میں یہ مردوں کی نسل تھی۔ طاقتور زمینداروں اور خدمت کرنے والے کسانوں کا تعلق رومیوں کے لئے قدیم دنیا کے زوال کی ایک

صورت تھی جس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن نئی نسل والوں کے لئے یہی تعلق ایک نئے ارتقاء کے آغاز کا نقطہ تھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ یہ چار سو برس کا زمانہ بظاہر بے ثمر معلوم ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے بعد ایک بڑی چیز چھوڑی ہے اور وہ چیز ہے: جدید قومیتیں یعنی تاریخ کے آنے والے زمانہ کے لئے مغربی یورپ کی انسانیت کی نئی تشکیل اور نئی گروہ بندی۔ سچ پوچھئے تو جرمنوں نے یورپ میں نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جرمن عہد میں ریاستوں کے ٹوٹنے کا یہ نتیجہ نہیں ہؤا کہ نارس سارا سن غلامی قائم ہوئی بلکہ یہ ہؤا کہ شاہی عطیوں اور سرپرستی (سپردگی) سے ترقی کرکے سامنتی یا جاگیرداری نظام قائم ہؤا اور آبادی میں اتنا زبردست اضافہ ہؤا کہ مشکل سے دو صدی کے بعد صلیبی جنگوں میں جتنی خونریزی ہوئی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہونچا۔

وہ کون سا جادو تھا جس کی مدد سے جرمنوں نے مرتے ہوئے یورپ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی؟ کیا یہ جرمن نسل کی کوئی پیدائشی باطنی قوت تھی جیسا کہ ہمارے متعصب قوم پرست مورخین کہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمن ایک نہایت باصلاحیت آریائی قبیلے کے لوگ تھے جو خاص کر اس زمانہ میں نہایت پرزور ترقی کے دور سے گذر رہے تھے۔ یورپ کے ناتواں جسم میں جس چیز نے نئی جان ڈالی وہ جرمنوں کی مخصوص

قومی خصوصیتیں نہیں تھیں بلکہ محض ان کی بربریت تھی، ان کا گن دستور تھا۔

ان کی ذاتی صلاحیت اور دلیری، آزادی سے ان کی محبت، ان کی جمہوریت پسندی جس کی وجہ سے وہ تمام امور عامہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے تھے ــ مختصر یہ کہ وہ سبھی خصوصیتیں جن کو روم والے کھو چکے تھے اور محض جن کی مدد سے ہی روم کی دنیا کے کیچڑ سے نئی ریاستیں بنائی جا سکتی تھیں اور نئی قومیتوں کی تعمیر ہو سکتی تھی۔ یہ خصوصیتیں اگر بربریت کے آخری دور کی نمایاں خصوصیتیں، ان کے گن دستور کا نتیجہ نہیں تھیں تو اور کیا تھیں؟

اگر جرمنوں نے یک زوجگی کی قدیم صورت میں تبدیلی کی، خاندان کے اندر مرد کی حکومت میں نرمی پیدا کی اور عورتوں کو زیادہ اونچا درجہ دیا جو قدیم کلاسیکی عہد میں اسے حاصل نہیں تھا تو یہ سب کرنے کی صلاحیت دراصل انہیں اپنی بربریت سے، اپنے گن رسم و رواج سے اور مادری حق کے زمانہ کے اثرات سے جو اس وقت بھی زندہ تھے، ملی تھی۔ ان کے علاوہ یہ صلاحیت انہیں اور کہاں سے مل سکتی تھی؟

کم سے کم تین سب سے اہم ملکوں میں یعنی جرمنی، شمالی فرانس اور انگلینڈ میں اگر وہ گن کے اصلی دستور کا ایک حصہ مارک برادریوں کی صورت میں قائم رکھنے میں اور سامنتی ریاست تک لے جانے میں کامیاب ہوئے، اور اس طرح مظلوم طبقہ یعنی کسانوں کو زمانہ وسطی کی زرعی

غلامی کے سخت ترین حالات میں بھی مقامی شیرازہ بندی اور
مقابلہ کرنے کے وہ ذرائع عطا کر سکے جو نہ تو قدیم زمانہ
کے غلاموں کو میسر تھے اور نہ موجودہ زمانہ کے مزدور
طبقہ کو تیار ملے ہیں — تو یہ اگر ان کی بربریت، ان کے
گنوں میں بسنے کے خالص بربری طریقے کی بدولت نہیں
تو اور کس چیز کی بدولت ہے؟

اور آخر میں اگر وہ غلامی کی اس نسبتاً ہلکی شکل کو
ترقی دےکر سبھی ملکوں میں رواج دے سکے، جس کا خود
ان کے وطن میں رواج تھا اور جس نے خود سلطنت روم میں
بھی غلامی کو رفتہ رفتہ ہٹاکر اس کی جگہ لی تھی۔ اور جس
نے جیسا کہ فورئیے نے پہلی بار بتلایا تھا مظلوموں کو وہ
اوزار دیا جس سے وہ بحیثیت ایک طبقہ کے رفتہ رفتہ آزاد
ہو سکیں — (fournit aux cultivateurs des moyens d'affranchissement
collectif et progressif) — اور جو اسی لئے غلامی سے کہیں زیادہ
بہتر تھا کیونکہ جہاں غلامی کے نظام میں غلام کو محض ایک
فرد کی حیثیت سے آزادی مل سکتی تھی اور کوئی عبوری
دور ممکن نہیں تھا (قدیم زمانہ میں کامیاب انقلاب کے ذریعہ
کبھی غلامی کے نظام کو ختم نہیں کیا جا سکا)، وہاں زمانہ
وسطی کے زرعی غلاموں نے رفتہ رفتہ ایک طبقہ کی حیثیت
سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا — اگر جرمن یہ سب کر سکے تو
اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ بربریت
کی حالت میں تھے جس کی بدولت وہ قدیم زمانہ کی عام
محنت کی غلامی یا مشرقی ملکوں کی گھریلو غلامی، دونوں

میں سے کسی ایک شکل میں بھی مکمل غلامی کے نظام تک نہیں پہونچ پائے تھے؟

جرمنوں نے روم کی دنیا کو جو کچھہ دیا اس میں جو حصہ جاندار اور حیات بخش تھا، وہ بربریت کا نتیجہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف بربری لوگوں میں ہی یہ طاقت ہو سکتی تھی کہ ایک ایسی دنیا کو جو ایک مرتے ہوئے تمدن کی آغوش میں تڑپ رہی تھی، نئی حیات بخش سکیں۔ اور اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں بربریت کی آخری اور اعلی ترین منزل تھی جس میں جرمن لوگ قوموں کی ہجرت یا نقل وطن سے پہلے ہی پہونچ چکے تھے۔ اس سے ہر بات صاف ہو جاتی ہے۔

۹

بربرّیت اور تمدّن

یونانی، رومی اور جرمن، ان تینوں بڑی مثالوں میں علیحدہ علیحدہ ہم گن سماج کے زوال کی تصویر دیکھ چکے۔ اب ہم آخر میں ان عام اقتصادی حالات کا مطالعہ کریں گے جنہوں نے عہد بربریت کے آخری دور میں ہی گن سماج کی نیو ہلا ڈالی تھی اور جن کی بدولت تمدن کے عہد کے شروع ہوتے ہوتے گن نظام بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے مطالعہ کے لئے مارکس کی کتاب «سرمایہ» اتنی ہی ضروری ہے جتنی مارگن کی کتاب۔

گن عہد وحشت کے درمیانی دور میں پیدا ہوئے اور اس کے آخری دور میں انہوں نے مزید ترقی کی اور جہاں تک ہمارے موجودہ مواد سے اندازہ ہوتا ہے بربریت کے ابتدائی دور میں وہ اپنے عروج پر پہونچ گئے تھے۔ لہذا اسی دور سے ہم اپنا مطالعہ شروع کریں گے۔

اس دور میں، جس کے لئے ہمارے پاس بس ایک امریکی انڈینوں کی مثال ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ گن نظام پوری طرح

ترقی کر چکا تھا۔ قبیلہ متعدد گنوں میں لیکن زیادہ‌تر دو گنوں میں بٹا ہؤا تھا۔ آبادی کے بڑھنے پر یہ ابتدائی گن پھر کئی دختر گنوں میں تقسیم ہو گئے جن کے مقابلہ میں مادر گن فریٹری کہے جانے لگے تھے۔ خود قبیلہ ٹوٹ کر کئی قبیلوں میں بٹ گیا، جن میں سے ہر ایک میں ہمیں زیادہ‌تر وہی پرانے گن ملتے ہیں۔ کم سے کم بعض صورتوں میں قرابت‌دار قبیلے ایک وفاق میں متحد ہوتے تھے۔ یہ سادہ تنظیم ان سماجی حالات کے لئے بالکل کافی تھی جن میں اس کا جنم ہؤا تھا۔ اس کی حیثیت ایک مخصوص فطری گروہ‌بندی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ ان سبھی اندرونی جھگڑوں کو حل کر سکے جو اس طرح کے سماج میں اٹھہ سکتے تھے۔ بیرونی معاملات میں جھگڑوں کا نبٹارا جنگ کے ذریعہ کیا جاتا تھا جس کا انجام یہ تو ہو سکتا تھا کہ ایک قبیلہ بالکل برباد ہو جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ غلامی کو قبول کر لے۔ گن نظام کی عظمت اور اسی کے ساتھہ ساتھہ اس کی کمزوری بھی یہی تھی کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہوتا تھا اور نہ کوئی محکوم۔ اندرونی معاملات میں حقوق اور فرائض کا فرق نہیں پیدا ہؤا تھا۔ انڈینوں کے سامنے کبھی یہ سوال ہی نہیں اٹھا کہ امور عامہ میں حصہ لینا، خونی انتقام لینا یا نقصانوں کی تلافی کرنا گن کے لوگوں کا حق ہے یا فرض۔ یہ بات ان کو اتنی ہی مہمل معلوم ہوتی جتنا یہ سوال کہ کھانا، پینا، سونا اور شکار کرنا حق ہے یا فرض۔ کوئی قبیلہ یا گن طبقوں میں نہیں بٹ

سکتا تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ ان حالات کی اقتصادی بنیاد کیا تھی۔

آبادی بہت کم اور بکھری ہوئی تھی۔ وہ صرف قبیلوں کے رہنے کی جگہوں میں گنجان ہوتی تھی، جس کے چاروں طرف شکارگاہ ہوتی تھی اور اس کے آگے غیرمقبوضہ جنگل جو اسے دوسرے قبیلوں سے دور رکھتا تھا۔ محنت کی تقسیم محض ایک فطری چیز تھی۔ یہ تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی۔ مرد لڑائی پر جاتے تھے، شکار کرتے تھے، مچھلی پکڑتے تھے، غذا کے لئیے کچا مال لاتے تھے، اور ان کاموں کے لئیے ضروری اوزار بناتے تھے۔ عورتیں گھر سنبھالتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں اور کپڑا بنتی اور سیتی تھیں۔ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے کام کے شعبہ میں آپ اپنے مالک تھے۔ جنگل میں مرد اور گھر میں عورت کا بول بالا تھا۔ مرد ہتھیاروں اور شکار کرنے اور مچھلی پکڑنے کے سامان کے مالک تھے اور عورت گھر کے ساز و سامان اور برتنوں کی۔ گھرانا کمیونسٹی تھا جس میں کئی اور اکثر بہت سے خاندان ہؤا کرتے تھے*۔ جو کچھہ مشترک طور پر کیا جاتا تھا اور

---

* خاص کر امریکہ کے شمال مغربی ساحل پر یہی حالت تھی۔ (دیکھئیے بینکرافٹ۔) جزائر کوئین چارلٹ کے ہائیداس لوگوں میں تو یہ حالت تھی کہ بعض گھرانوں میں ایک چھت کے نیچے سات سو افراد تک اکٹھے رہتے تھے۔ نوتکا لوگوں میں پورے کے پورے قبیلے ایک چھت کے نیچے رہتے تھے۔ (نوٹ از اینگلس۔)

جسے سب مل کر استعمال کرتے تھے وہ سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔ گھر، باغ، لمبی کشتی سبھی مشترکہ ملکیت تھی۔ چنانچہ وہ «کمائی ہوئی جائداد» ہمیں یہیں اور صرف یہیں ملتی ہے جسے قانون اور اقتصادیات کے ماہروں نے غلط طور پر متمدن سماج کی طرف منسوب کر دیا ہے اور جو آخری جھوٹا قانونی حیلہ ہے جس پر جدید سرمایہ دارانہ ملکیت کی بنیاد اٹھائی گئی ہے۔

لیکن انسان ہر جگہ اس منزل میں نہیں رہا۔ ایشیا میں اسے ایسے جانور مل گئے جنہیں پالا جا سکتا تھا اور جن کی نسل بڑھائی جا سکتی تھی۔ جنگلی گائے بھینس کا شکار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پلی ہوئی گائے سال میں ایک بار بچہ بھی دیتی تھی اور دودھ تو دیتی ہی تھی۔ کئی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قبیلوں مثلاً آریائی، سامی اور شاید تورانی قبیلوں نے بھی جانوروں کو پالتو بنانا، بعد میں ان کی نسل بڑھانا اور دیکھ بھال کرنا اپنا خاص کام بنا لیا۔ گلہ بان قبیلوں نے اپنے آپ کو بربری لوگوں کی عام آبادی سے الگ کر لیا۔ یہ محنت کی پہلی بڑی سماجی تقسیم تھی۔ یہ گلہ بان قبیلے غذا کا صرف زیادہ سامان ہی نہیں پیدا کرتے تھے بلکہ دوسرے بربری لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مختلف النوع غذا کا سامان تیار کرتے تھے۔ ان کے پاس دوسروں کے مقابلہ میں صرف دودھ، دودھ کی بنی ہوئی چیزیں اور گوشت ہی زیادہ مقدار میں نہیں تھا بلکہ کھال، اون، بکرے کے بال، اون کے کتے اور بنے ہوئے کپڑے بھی تھے۔ کچے مال کی مقدار

بڑھنے سے ان چیزوں کا استعمال عام ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہؤا کہ پہلی بار باقاعدگی کے ساتھ تبادلہ ہونے لگا۔ ابتدا میں چیزوں کا تبادلہ کبھی کبھار ہی ہو سکتا تھا۔ ہتھیاروں اور اوزاروں کے بنانے میں اگر کسی نے غیرمعمولی مہارت دکھائی تو اس سے محنت کی ایک عارضی تقسیم قائم ہوئی ہوگی۔ چنانچہ عہدحجرجدید کے پتھر کے اوزار بنانے کے کئی کارخانوں کے نشان ملے ہیں جن کے بارے میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ان کارخانوں میں جن کاریگروں نے مہارت پیدا کی وہ غالباً پورے سماج کے لئے کام کرتے تھے جیسا کہ انڈین گن سماجوں میں مستقل قسم کے دستکار آج بھی کرتے ہیں۔ بہر حال اس منزل پر قبیلہ کے اندر کے تبادلہ کے سوا اور کسی طرح کا تبادلہ ممکن نہیں تھا اور وہ بھی ایک مستثنی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن گلہ بانی کرنے والے قبیلے جب اچھی طرح قائم ہو گئے تو اس کے بعد ہمیں وہ سبھی حالات ملتے ہیں جن میں مختلف قبیلوں کے لوگوں میں چیزوں کا تبادلہ ہو سکتا تھا اور اس کو مزید ترقی ہو سکتی تھی اور یہ ایک باقاعدہ رواج کی حیثیت سے مستقل صورت اختیار کر سکتا تھا۔ ابتدا میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے اپنے اپنے گن سرداروں کے ذریعہ چیزوں کا تبادلہ کرتا تھا۔ لیکن جب جانوروں کے ریوڑ الگ الگ افراد کی ملکیت بننے لگے تو رفتہ رفتہ زیادہ تر تبادلہ افراد کے درمیان ہونے لگا حتی کہ آخر میں یہی تبادلہ کی واحد صورت ہو گئی۔ گلہ بان قبیلے تبادلہ میں اپنے ہمسایوں

کو جو خاص چیز دیتے تھے وہ مویشی تھے۔ مویشی ھی وہ جنس بن گئے جن سے تمام دوسری جنسوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا اور لوگ ھر جگہ تمام دوسری چیزوں کے مقابلہ میں اسے بڑے شوق سے قبول کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ مویشی سے زر یا روپیہ کا کام لیا جانے لگا تھا اور اس دور میں اسی کو روپیہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جنسوں کے تبادلہ کی ابتدا میں ھی ایک جنس زر کی مانگ اتنے لازمی طور پر اور اتنی تیزی کے ساتھہ پیدا ھو گئی۔

عہد بربریت کے ابتدائی دور کے ایشیائیوں کو غالباً باغبانی کا علم نہیں تھا لیکن اس کے درمیانی دور میں تو ضرور ھی وہ باغبانی کرنے لگے تھے۔ لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک پیشرو کی تھی جس نے کھیت بناکر کھیتی کرنے کا راستہ صاف کیا۔ توران کے مرتفع خطوں میں جہاں لمبا اور سخت جاڑا پڑتا تھا، چارے کا انتظام کئے بغیر گلہ بانی کی زندگی بسر کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے وھاں گھاس اگانا اور اناج پیدا کرنا بہت ضروری تھا۔ بحیرۂ اسود کے شمال کے میدانوں پر بھی یہی بات صادق آتی ھے اور جب ایک بار مویشیوں کے لئے اناج پیدا کیا جانے لگا تو پھر وہ جلد ھی انسان کے کھانے کے کام بھی آنے لگا۔ کھیتی کی زمین اس وقت تک قبیلہ کی ملکیت تھی۔ اور پہلے یہ گنوں کے سپرد کی جاتی تھی جو بعد میں اپنے طور پر اسی گھریلو برادریوں میں ان کے استعمال کے لئے بانٹ دیا کرتے تھے۔ اور آخر میں یہ افراد کو دی جانے لگی تھی۔ انہیں ملکیت

کے بعض حقوق حاصل ہونگے مگر اس سے زیادہ کچھہ نہیں۔

اس دور کے صنعتی کارناموں میں دو چیزیں خصوصیت کے ساتھہ اہم ہیں۔ ایک ہے کرگھا اور دوسرا ہے کچی دھاتوں کو پگھلاکر صاف کرنا اور آخری، تیار شکل دینا۔ تانبا، ٹین اور ان کو ملاکر بنائے جانے والے کانسے کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ کانسے سے بڑے کام کے اوزار اور ہتھیار بنتے تھے۔ لیکن وہ پتھر کے اوزاروں کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان کی جگہ تو صرف لوہا لے سکتا تھا لیکن اس وقت تک لوہے کی پیداوار کا کسی کو علم نہیں تھا۔ سونا اور چاندی زیور بنانے اور آرائش کے لئے استعمال ہونے لگے تھے اور اس وقت بھی ان کی قدر و قیمت تانبے اور کانسے سے زیادہ ہوگی۔

جب مویشی پالنے، کھیتی اور گھریلو دستکاری غرضکہ سبھی شاخوں میں پیداوار بڑھی تو انسان کی استعداد محنت کو قائم رکھنے کے لئے جتنا پیدا کرنے کی ضرورت تھی، وہ اس سے زیادہ پیدا کرنے لگی۔ ساتھہ ہی گن یا گھریلو برادری کے یا الگ الگ خاندان کے ہر ممبر کو روز جتنا کام کرنا پڑتا تھا، اس میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ کہیں سے اور استعداد محنت حاصل کی جائے۔ وہ جنگ سے حاصل ہوئی۔ جنگ میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے اب ان کو غلام بنایا جانے لگا۔ اس زمانہ کے عام تاریخی حالات میں پہلی بڑی سماجی تقسیم محنت

جو ہوئی وہ محنت کی زرخیزی کو بڑھا کر یعنی دولت میں اضافہ کرکے اور پیداوار کے دائرے کو بڑھا کر لازمی طور پر اپنے پیچھے پیچھے غلامی کو لے آئی۔ محنت کی پہلی بڑی سماجی تقسیم سے سماج کی پہلی بڑی تقسیم پیدا ہوئی۔ وہ دو طبقوں میں بٹ گیا — ایک طرف مالک تھے اور دوسری طرف غلام، ایک طرف استحصال کرنے والے اور دوسری طرف وہ جن کا استحصال کیا جاتا تھا۔

ہم یہ آج تک نہیں جان سکے ہیں کہ جانوروں کے ریوڑ اور جھنڈ کب اور کیونکر قبیلے یا گن کی مشترکہ ملکیت سے بدل کر الگ الگ خاندانوں کے سرداروں کی ملکیت بن گئے۔ لیکن بڑی حد تک یہ اسی دور میں ہوا ہوگا۔ مویشی کے گلوں اور دولت کے اور دوسرے نئے سامان کی بدولت خاندان میں ایک انقلاب نمودار ہوا۔ روزی حاصل کرنا ہمیشہ مرد کا کام ہوا کرتا تھا۔ وہی ذرائع زندگی پیدا کرتا تھا اور وہی ان کا مالک ہوتا تھا۔ روزی حاصل کرنے کا نیا ذریعہ مویشی کا گلہ تھا اور شروع میں ان کو پالتو بنانا اور پھر ان کی دیکھ بھال کرنا مرد کا کام تھا۔ اس لئے وہ مویشی کا مالک ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں جو چیزیں اور غلام حاصل ہوتے تھے ان کا مالک بھی وہی تھا۔ چنانچہ پیداوار سے جو کچھ فاضل پیدا ہوتا اور بچ رہتا تھا وہ سب مرد کے حصہ میں آیا۔ عورت کا ان کے استعمال میں حصہ تھا مگر ان کی ملکیت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ «وحشی»، جنگجو اور شکاری گھر

میں عورت کو فوقیت دےکر خود اپنی ثانوی حیثیت سے مطمئن تھے۔ لیکن «زیادہ مہذب» گلہ بان اپنی دولت کے سہارے آگے بڑھہ آیا، خود بڑی حیثیت حاصل کر لی اور عورت کو دھکیل کر ثانوی حیثیت پر پہونچا دیا۔ اور بےچاری عورت شکایت کا ایک حرف تک زبان پر نہیں لا سکی۔ خاندان کے اندر محنت کی تقسیم سے مرد اور عورت کے درمیان جائداد کی تقسیم اور اس کا بٹوارہ ہوٗا تھا۔ اس تقسیم محنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، پھر بھی چونکہ خاندان کے باہر محنت کی تقسیم بدل چکی تھی اس لئے اس نے پہلے کے خاندانی تعلقات کو الٹ پلٹ کر دیا۔ وہی چیز جس نے پہلے عورت کو گھر کی مالکہ بنایا تھا — یعنی اس کا گھریلو کاموں تک محدود رہنا — وہی چیز گھر کے اندر مرد کے تسلط کی بنیاد بنی۔ روزی حاصل کرنے کے لئے مرد کے کام کے مقابلہ میں عورت کے گھریلو کام کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ روزی حاصل کرنا ہی سب کچھہ تھا۔ گھر کے کام کاج کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ یہیں پر ہمیں یہ دکھائی دینے لگتا ہے کہ عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھہ ان کی مساوات اس وقت تک ناممکن ہے اور ناممکن رہےگی جب تک عورتوں کو سماجی پیداوار کے کام سے الگ رکھا جائےگا اور خانہ داری کے کام تک جو کہ نجی کام ہے، محدود رکھا جائےگا۔ عورتوں کی آزادی اسی وقت ممکن ہوگی جب عورتیں ایک بڑے سماجی پیمانہ پر پیداوار میں حصہ لے سکیں‌گی اور جب گھریلو کاموں پر انہیں بہت کم

دھیان دینا پڑے گا۔ اور یہ اب محض بڑے پیمانہ کی صنعت کی وجہ سے ممکن ھؤا ھے جو نہ صرف یہ کہ عورتوں کے لئے بہت بڑی تعداد میں پیداوار کے کام میں حصہ لینے کی گنجائش پیدا کرتی ھے بلکہ سچ پوچھئے تو اس پر زور دیتی ھے اور اس کے علاوہ نجی گھریلو کام کو بھی ایک عام صنعت بنانے کی کوشش کرتی ھے۔

گھر کے اندر مرد کے واقعی تسلط نے اس کی مطلق العنانی کے راستے سے آخری رکاوٹ بھی دور کر دی۔ مادری حق کے خاتمے، پدری حق کے رواج اور جوڑا خاندان سے یک زوجگی تک کی تدریجی تبدیلی نے اس مطلق العنانی پر مہر لگا دی اور اسے پائدار بنا دیا۔ پرانے گن سماج میں اس سے ایک دراڑ پڑ گئی۔ یک زوجگی کا خاندان ایک طاقت بن گیا اور گن کے خلاف ایک خطرہ بن کر اٹھہ کھڑا ھؤا۔

دوسرا قدم ھمیں بربریت کے آخری دور میں پھونچا دیتا ھے۔ یہ وھی دور ھے جس میں سبھی متمدن قومیں اپنے سورمائی عہد سے گذرتی ھیں۔ یہ لوھے کی تلوار کا ھی نہیں بلکہ لوھے کے ھل اور کلہاڑی کا بھی دور ھے۔ لوھا آدمی کا خادم بن گیا اور یہ تمام کچے مال میں سب سے اھم کچا مال ھے—اور اگر آلو کو چھوڑ دیا جائے تو سب سے آخری بھی—جس نے تاریخ میں ایک انقلابی خدمت انجام دی ھے۔ لوھے کی وجہ سے کھیت بناکر بڑے پیمانہ پر کھیتی کرنا اور جنگل کے بڑے بڑے قطعات کو کھیتی کے لئے صاف کرنا ممکن ھؤا۔ اس نے کاریگر کے ھاتھوں میں ایسا اوزار

دیا جس کی سختی اور تیزی کا مقابلہ نہ تو پتھر کر سکتا
تھا اور نہ کوئی اور دھات جس کو لوگ اس وقت تک
جانتے تھے۔ یہ سب بہت دھیرے دھیرے ہؤا۔ سب سے
پہلے جو لوھا تیار کیا جاتا تھا وہ اکثر تانبے سے بھی زیادہ
نرم ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ آہستہ آہستہ پتھر کے ھتھیار
رخصت ھو گئے۔ پتھر کی کلہاڑیاں صرف ھلڈے براند کے
گیتوں میں ھی نہیں بلکہ ۱۰۶۶ء میں ھیسٹنگز کی لڑائی
میں بھی استعمال ھوئی تھیں۔ لیکن اب جو ترقی ھو رھی
تھی اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں رخنے کم ھی
پڑتے تھے اور اس کی رفتار تیز تھی۔ قبیلے یا متعدد قبیلوں
کے وفاق کا مرکزی مقام شہر بن گیا جس میں پتھر یا
اینٹوں کے بنے ھوئے مکان ھوتے تھے اور جو چاروں طرف
سے میناروں اور چھجوں اور پتھر کی فصیلوں سے گھرے
ھوتے تھے جن میں گولی چلانے کے لئے سوراخ بنے ھوتے
تھے۔ یہ شہر جہاں ایک طرف فن تعمیر کی تیز ترقی کی
گواھی دے رھے تھے وھاں دوسری طرف وہ اس بات کی
علامت تھے کہ خطرہ بڑھ گیا ھے اور حفاظت کی ضرورت
پیدا ھو گئی ھے۔ دولت میں تیزی سے اضافہ ہؤا لیکن یہ
الگ الگ افراد کی دولت تھی۔ کپڑا بننے کے فن، دھات
کے کام اور دوسری دستکاریوں سے، جن میں سے ھر ایک
میں اب مخصوص مہارت کی ضرورت تھی، انواع و اقسام کا
سامان نہایت فن‌کارانہ خوبصورتی سے تیار ھوتا تھا۔ کھیتی
سے اب نہ صرف اناج، پھلیاں اور پھل ملتے تھے بلکہ تیل

اور شراب بھی ملتی تھی کیونکہ اب تیل نکالنے اور شراب بنانے کا فن لوگ سیکھہ گئے تھے۔ اب کوئی ایک فرد اتنے مختلف قسم کے کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اب دوسری بڑی تقسیم محنت ہوئی اور دستکاری کھیتی سے الگ ہوئی۔ پیداوار میں لگاتار اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھہ ساتھہ محنت کی پیدآور قوت میں بھی جو ترقی ہو رہی تھی اس نے انسانی قوت محنت کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ غلامی جو اس سے پہلے کی منزل میں محض نوزائیدہ شکل میں اور بس کہیں کہیں پائی جاتی تھی اب سماجی نظام کا ایک ضروری حصہ بن گئی تھی۔ غلام اب محض مددگار نہیں رہ گئے تھے بلکہ اب انہیں بیسیوں کی تعداد میں کھیتی اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ھانکا جانے لگا تھا۔ کھیتی اور دستکاری، ان دو بڑی شاخوں میں پیداوار کے بٹ جانے سے تبادلہ کے لئے پیداوار کی ابتدا ہوئی۔ فروخت کرنے کے لئے مال پیدا کیا جانے لگا۔ اور اس کے ساتھہ ساتھہ نہ صرف اپنے علاقہ کے اندر، نہ صرف مختلف قبیلوں کے علاقوں کی سرحد پر بلکہ سمندر پار کرکے بھی تجارت کی جانے لگی۔ ان سب چیزوں کا ارتقاء ابھی بہت کم ہوا تھا۔ عالمگیر زر کے لئے سونے چاندی کو ترجیح دی جانے لگی تھی لیکن ابھی تک سکہ نہیں ڈھالا گیا تھا اور تبادلہ محض وزن کے اعتبار سے ہوتا تھا۔

آزاد اور غلام کے ساتھہ دولتمند اور مفلس کے ایک اور فرق کا اضافہ ہوا۔ محنت کی نئی تقسیم کے ساتھہ ایک

اور تقسیم بھی ہوئی۔ سماج طبقوں میں بٹ گیا۔ پرانی کمیونسٹی گھریلو برادریاں جہاں کہیں باقی رہ گئی تھیں، وہ مختلف خاندانوں کے سرداروں کی دولت کے فرق کی وجہ سے ٹوٹ گئیں۔ اور اس کے ساتھہ سماج کے لئے زمین کی مشترکہ کھیتی کا خاتمہ ہو گیا۔ کھیتی کی زمین استعمال کے لئے مختلف خاندانوں کو دی جانے لگی۔ پہلے یہ زمین ایک محدود عرصہ کے لئے دی جاتی تھی اور بعد میں ہمیشہ کے لئے۔ مکمل نجی ملکیت تک کا تغیر رفتہ رفتہ اور جوڑا بیاہ سے یک زوجگی تک کی تبدیلی کے ساتھہ ساتھہ عمل میں آیا۔ انفرادی خاندان سماج کی اقتصادی اکائی بننے لگا۔

آبادی پہلے سے زیادہ گنجان ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ضروری ہؤا کہ اندرونی اور بیرونی کاموں کے لئے لوگوں میں اور زیادہ قریبی اتحاد ہو۔ ہر جگہ قرابت دار قبیلوں کا وفاق بنانا ضروری ہو گیا۔ اور اس کے بعد جلد ہی یہ قبیلے آپس میں گھل مل گئے۔ اور اس طرح الگ الگ قبیلوں کے علاقے مل کر ایک قومیت کا علاقہ بن گیا۔ جاتی کا فوجی کماندار—rex, basileus, thiudans— ایک ضروری اور مستقل عہدہ دار بن گیا۔ جہاں کہیں عوامی اسمبلی نہیں تھی اسے قائم کیا گیا۔ گن سماج کی نشو و نما ایک فوجی جمہوریت کی شکل میں ہوئی تھی اور فوجی کماندار، کاؤنسل اور عوامی اسمبلی اسی فوجی جمہوریت کے مختلف ادارے تھے۔ یہ فوجی جمہوریت تھی کیونکہ جنگ اور جنگ کی تیاری اور اس کا انتظام اب لوگوں کی زندگی کا ایک باقاعدہ اور

مستقل کام بن گیا تھا۔ اپنے پڑوسیوں کی دولت دیکھ کر لوگوں کے دل میں لالچ پیدا ہونے لگا تھا کیونکہ دولت حاصل کرنے کو وہ زندگی کا سب سے اہم مقصد سمجھنے لگے تھے۔ وہ بربری لوگ تھے۔ ان کی نظر میں محنت کرکے کچھ پیدا کرنے سے زیادہ آسان لوٹ مار کرنا تھا اور وہ زیادہ قابل عزت کام بھی تھا۔ پہلے جنگ محض اس لئے کی جاتی تھی کہ حملہ کا انتقام لینا ہوتا تھا یا اپنے علاقہ کو جو ناکافی ہو چلا تھا، بڑھانا تھا۔ اب جنگ کا مقصد محض لوٹ مار کرنا تھا۔ اور یہ ایک باقاعدہ پیشہ بن گیا۔ نئے قلعہ بند شہروں کے چاروں طرف بڑی بڑی فصیلیں یونہی بے مطلب نہیں کھڑی کی گئی تھیں۔ ان کے گرد خندقیں منہہ پھاڑے کھڑی تھیں جن میں گن دستور دفن ہو گیا۔ اور ان کے مینار تمدن کی بلندیوں تک پہونچ گئے تھے۔ اندرونی معاملات میں بھی اسی طرح کی تبدیلی ہوئی۔ لوٹ مار کی جنگوں نے سپہ سالار اعظم کی طاقت بھی بڑھائی اور اس کے نائب سپہ سالاروں کی بھی۔ جانشینوں کو ایک ہی خاندان سے منتخب کرنے کا قاعدہ رفتہ رفتہ موروثی جانشینی کا قاعدہ بن گیا۔ یہ تبدیلی خصوصیت کے ساتھ پدری حق قائم ہونے کے بعد ہوئی۔ شروع میں لوگ اسے برداشت کر لیتے تھے۔ بعد میں ہر مرنے والے کا وارث اس کی جانشینی کا دعوے دار ہونے لگا۔ اور آخر میں اس نے زبردستی یہ حق غصب کر لیا۔ اس طرح موروثی بادشاہی اور موروثی شرفاء کے طبقہ کی

بنیاد پڑی۔ اس طرح رفتہ رفتہ گن دستور کے اداروں کی جڑیں جو عوام کے اندر، گن، فریٹری اور قبیلے میں پھیلی ہوئی تھیں، کاٹ دی گئیں اور پورے گن نظام میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ بالکل اپنی پہلی شکل سے برعکس چیز بن گیا۔ وہ قبیلوں کی ایک تنظیم تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے معاملوں کا انتظام کر سکے لیکن اب وہ ایک ایسی تنظیم بن گیا جس کا مقصد اپنے پڑوسیوں کو لوٹنا اور ان پر ظلم کرنا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ گن کے ادارے جن کا مقصد عوام کی رائے پر عمل کرنا تھا اب خود اپنے لوگوں پر حکومت اور ظلم کرنے کے ادارے بن گئے۔ یہ کبھی نہ ہوتا اگر دولت کے لالچ نے گن کے ممبروں کو امیر اور غریب میں نہ بانٹا ہوتا، اگر "گن کے اندر ملکیت کے فرق نے گن کے ممبروں کے مفاد کے اتحاد کو باہمی تضاد میں نہ بدل دیا ہوتا" (مارکس)، اور اگر غلامی کی نشو و نما نے ذریعۂ معاش حاصل کرنے کے لئے محنت کرنے کو ایک غلامانہ اور لوٹ مار کرنے سے بھی زیادہ شرمناک کام نہ بنا دیا ہوتا۔

• • •

اس کے بعد ہم تمدن کے دروازے پر آ پہونچتے ہیں۔ تقسیم محنت کی مزید ترقی سے اس دور کی ابتدا ہوتی ہے۔بربریت کے ابتدائی دور میں انسان اپنی فوری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مال پیدا کرتا تھا۔ تبادلہ کبھی کبھار ہوتا تھا، جب اتفاق سے کوئی چیز فاضل بچ رہی

ھو۔ بربریت کے درمیانی دور میں ھم دیکھتے ھیں کہ گلہ‌بان قوموں کو مویشی کی صورت میں ایک ایسی ملکیت مل گئی تھی جس میں کافی بڑے بڑے ریوڑ اور جھنڈ ھوتے تھے اور ان کے پاس اپنی ضرورتوں سے زیادہ فاضل مال برابر رھا کرتا تھا۔ اور ھم یہ بھی دیکھتے ھیں کہ گلہ‌بان لوگوں میں اور پچھڑے ھوئے قبیلوں میں جن کے پاس ریوڑ نہیں تھے، ایک طرح کی تقسیم‌محنت ھوئی جس کی وجہ سے پیداوار کی دو مختلف حالتیں ساتھہ ساتھہ قائم ھو گئیں۔ اس سے مستقل اور باقاعدہ تبادلہ کے لئے موافق حالات پیدا ھو گئے۔ بربریت کے آخری دور میں زراعت اور دستکاری میں مزید تقسیم‌محنت قائم ھوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ھؤا کہ اجناس کا برابر بڑھتا ھؤا حصہ خصوصیت کے ساتھہ تبادلہ کے لئے پیدا کیا جانے لگا حتی‌کہ الگ الگ مال پیدا کرنے والوں میں تبادلہ اتنا بڑھہ گیا کہ سماج کے لئے ایک نہایت ضروری چیز بن گیا۔ محنت کی ان تمام تقسیموں کو تمدن نے مستحکم کیا اور آگے بڑھایا۔ خاص‌کر اس نے شہر اور دیہات کے فرق کو اور گہرا کر دیا (یا تو قدیم زمانہ کی طرح دیہات پر شہر کا اقتصادی غلبہ تھا یا ازمنۂ‌وسطی کی طرح شہر پر دیہات کا غلبہ تھا) اور ایک تیسری تقسیم محنت کا اضافہ ھؤا جو تمدن کے عہد کی خصوصیت ہے اور فیصلہ‌کن اھمیت رکھتی ھے — اس نے ایک ایسے طبقہ کو جنم دیا جو عمل پیداوار میں قطعی کوئی حصہ نہیں لیتا اور محض پیداوار کا تبادلہ کیا کرتا ھے — یہ تاجروں

کا طبقه هے۔ اس سے پہلے جتنے ادھورے طور پر بنے
ہوئے طبقے پائے جاتے ہیں، ان سب کا تعلق محض پیداوار
سے تھا۔ پیداوار میں لگے ہوئے لوگوں کو یه نا مکمل سی
طبقاتی ساخت مینیجروں اور کام کرنے والوں، یا بڑے پیمانه
پر پیدا کرنے والوں اور چھوٹے پیمانه پر پیدا کرنے والوں،
میں بانٹا کرتی تھیں۔ لیکن اب پہلی مرتبه ایک ایسا طبقه
نمودار هؤا جو پیداوار میں کوئی حصه نہیں لیتا تھا مگر
اس کے باوجود اس نے بحیثیت مجموعی پیداوار کے سارے
انتظام کو اپنے قبضه میں کر لیا اور پیدا کرنے والے کو
اقتصادی طور پر اپنی حکمرانی میں لے لیا۔ یه ایسا طبقه
هے جو دو قسم کا مال پیدا کرنےوالوں کے درمیان کی ایک
ضروری اور لازمی کڑی بن جاتا هے اور دونوں کا استحصال
کرتا هے۔ پیدا کرنےوالوں کو تبادله کی پریشانی اور اس
کے خطروں سے بچانے کے بہانے، ان کے مال کے لئے دور
دور کے ملکوں میں منڈی تلاش کرنے کے بہانے اور اس
طرح سماج کا سب سے کارآمد طبقه ہونے کا دعوی کرکے،
طفیلیوں کا ایک طبقه سامنے آتا هے۔ یه سچ مچ سماجی
کاسه لیسوں کا گروہ هے جو حقیقت میں نہایت معمولی خدمتوں
کے عوض ملک کے اندر اور باهر کی پیداوار کا سب سے
اچھا حصه دودھ کی بالائی کی طرح خود نکال لیتا هے، تیزی
سے کثیر دولت کا مالک بن بیٹھتا هے اور اسی کی مناسبت
سے سماجی اثر پیدا کرتا هے۔ اور اسی وجه سے تمدن کے
عہد میں اسے نت نئے اعزاز ملتے رہتے ہیں اور پیداوار پر

اس کی گرفت زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے حتی کہ آخر میں وہ خود بھی اپنی ایک چیز پیدا کرتا ہے ـــ میعادی تجارتی بحران۔

ہم ترقی کے جس دور کی بات کر رہے ہیں اس میں تاجر طبقہ کو جو ابھی نوعمر تھا، اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مستقبل کے بطن میں اس کے لئے کتنی بڑی بڑی چیزیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس نے اپنی تشکیل کر لی اور اپنے آپ کو ناگزیر بنا دیا۔ اور اتنا کافی تھا۔ مگر اس کے ساتھ فلزاتی زر، دھات کے ڈھالے ہوئے سکے کا استعمال شروع ہؤا۔ یہ ایک نیا حربہ تھا جس کی مدد سے پیدا کرنے والے پر اور اس کی پیداوار پر نہ پیدا کرنے والے کی حکومت ہو سکے۔ سب اجناس کی ایک جنس جو اپنے اندر تمام اجناس کو چھپائے رکھتی ہے، ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ ایک جادو کی پڑیا تھی جو جب چاہے اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے کسی چیز کا روپ دھارن کر سکتی تھی۔ وہ جس کے قبضہ میں ہوتی اس کا پیداوار کی دنیا پر قبضہ ہوتا۔ اور وہ سب سے زیادہ کس کے قبضہ میں تھی؟ تاجروں کے۔ ان کے ہاتھوں میں روپیہ کی پرستش کا دھرم محفوظ تھا۔ اس نے یہ بات صاف کر دی کہ سبھی اجناس کو اور اس لئے سبھی اجناس کے پیدا کرنے والوں کو زر کے سامنے خاک پر سر رکھنا ہوگا۔ اس نے یہ عملاً ثابت کر دیا کہ دولت کی دوسری سبھی شکلیں دولت کے اس اوتار یعنی زر، کے سامنے محض پرچھائیاں ہیں۔ زر کی طاقت نے اپنی نوجوانی کے اس دور میں جس بھونڈے پن اور تشدد کا

مظاہرہ کیا ویسا کبھی اور نہیں کیا۔ زر کے بدلے میں اجناس کی فروخت کے بعد زر کو قرض دینے کا رواج ہوا اور اس کے ساتھ سود خوری شروع ہوئی۔ اور قدیم ایتھنز اور روما کے قانون نے قرض‌دار کو جس بے رحمی کے ساتھ ہاتھ پیر باندھ کر سود خوار مہاجن کے سامنے ڈال دیا اس کی مثال بعد کے زمانہ میں بھی کبھی نہیں ملتی۔ ان دونوں جگہوں کے قانون اپنے آپ نمودار ہوئے تھے۔ وہ عام قانون تھا جس کی تہہ میں اقتصادی قوت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔

اجناس اور غلاموں کی دولت اور زر کی دولت کے علاوہ دولت کی ایک اور شکل پیدا ہوئی — زمین کی دولت۔ شروع میں زمین کے قطعات گن یا قبیلے کی طرف سے افراد کو استعمال کے لئے دئے جاتے تھے۔ مگر ان پر ان افراد کا حق اتنی مضبوطی سے قائم ہو چکا تھا کہ زمین کے وہ ٹکڑے ان کی موروثی ملکیت بن گئے۔ اس سے پہلے وہ جس چیز کی سب سے زیادہ کوشش کر رہے تھے، وہ یہ تھی کہ زمین کے اس ٹکڑے پر گن سماج کا دعوی ختم ہو جائے، اس دعوے سے زمین کو چھٹکارا مل جائے۔ یہ دعوی ان کے پیروں کی زنجیر بن گیا تھا۔ انہیں اس زنجیر سے چھٹکارا مل گیا — لیکن تھوڑے ہی دنوں میں نئی زمینی جائداد سے بھی چھٹکارا ملا۔ کیونکہ زمین کی پوری اور آزادانہ ملکیت کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ بلا روک ٹوک اور بلا کسی پابندی کے قبضہ قائم ہو گیا ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ اسے اپنے پاس سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک

زمین گن کی ملکیت تھی ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن
جب زمین کے نئے مالک نے گن اور قبیلہ کے دعوے کی
زنجیر کو توڑ دیا تو اس نے وہ رشتہ بھی توڑ دیا جو آج
تک اسے زمین سے اٹوٹ طریقے سے وابستہ کئے ہوئے تھا۔
اور یہ بات زر نے صاف کر دی کہ اس کا کیا نتیجہ ہو
سکتا ہے۔ زر بھی اسی وقت زمین میں نجی ملکیت کے ساتھہ
ساتھہ نمودار ہؤا تھا۔ زمین اب ایک جنس تبادلہ بن گئی
جسے فروخت کیا جا سکتا تھا اور رہن رکھا جا سکتا تھا۔
زمین پر نجی ملکیت کو قائم ہوئے مشکل سے کچھہ دن
گذرے ہونگے کہ رہن اور گروی رکھنے کا رواج ہو گیا۔
(دیکھئے ایتھنز کی مثال)۔ جس طرح یک زوجگی کے پیچھے
پیچھے هتیائرازم اور عصمت‌فروشی لگی رهی اسی طرح اب
زمین کی ملکیت کے پیچھے رہن رکھنے کا رواج لگ گیا۔
تم زمین کی ملکیت چاهتے تھے، آزاد، مکمل اور قابل منتقلی
ملکیت — تو لو، یہ رهی ایسی ملکیت — «تمہیں اس کی خواهش
تھی، جارج ڈینڈن!»

تجارت کی توسیع، سکہ کا چلن، سود خوری، زمین پر
نجی ملکیت اور رہن کا رواج — ان سب چیزوں کے ساتھہ
ایک طرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے هاتھہ میں دولت کا
اجتماع اور ارتکاز ہوتا رہا اور دوسری طرف عام لوگوں کا
افلاس بڑھتا گیا اور گداگروں اور مفلسوں کی تعداد بہت
بڑھہ گئی۔ دولتمندوں کا یہ نیا طبقۂ شرفاء جس حد تک
شروع سے هی پرانے قبائلی شرفاء سے مختلف تھا اس حد

تک اس نے آخرالذکر کو ھمیشه کے لئے پیچھے دھکیل دیا (ایتھنز میں، روم میں، جرمنوں میں)۔ اور اس طرح دولت کی بنیاد پر آزاد لوگوں کے مختلف شہریوں میں بٹ جانے کے ساتھه ان غلاموں کی تعداد میں زبردست اضافه هؤا* جن کی جبری محنت کی بنیاد پر سارے سماج کا اوپری ڈھانچه کھڑا کیا گیا تھا۔ یونان میں خاص طور پر ایسا هؤا تھا۔

آئیے اب هم یه دیکھیں که اس سماجی انقلاب کی بدولت گن دستور کا کیا حشر هؤا۔ وہ ان نئے عناصر کے مقابله میں بالکل بےبس تھا جو اس کی مدد کے بغیر هی پیدا هو گئے تھے۔ اس کا وجود اس بات پر منحصر تھا که گن یا یوں کہنا چاهئے که قبیلے کے سبھی ممبر ایک علاقه میں ساتھه ساتھه رهیں اور کوئی دوسرا اس علاقه میں نه رهے۔ لیکن یه حالت تو بہت دن پہلے ختم هو چکی تھی۔ گن اور قبیلے هر جگه مخلوط هو گئے تھے، هر جگه آزاد شہریوں کے ساتھه ساتھه غلام، ماتحت لوگ اور غیرملکی لوگ رهنے

---

* ایتھنز میں غلاموں کی تعداد جاننے کے لئے دیکھئے اس کتاب کا صفحه ۱۱۷۔کورنتھه شہر کے عروج کے زمانه میں وهاں غلاموں کی تعداد ۴۶۰۰۰۰ اور ایجنه میں ۴۷۰۰۰۰ تھی۔ دونوں شہروں میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں کی تعداد کے مقابله میں دس گنا زیادہ تھی۔ (نوٹ از اینگلس۔) اینگلس نے یہاں چوتھے جرمن اڈیشن کے صفحه کا حواله دیا هے۔ دیکھئے اس اردو اڈیشن کے صفحات ۲۳۶-۲۳۷ (اڈیٹر۔)

لگے تھے۔ بربریت کے درمیانی دور کے آخر میں ھی لوگوں
نے ایک جگہ جم کر رھنا شروع کر دیا تھا مگر تجارت کے
دباؤ، لوگوں کے پیشوں کے بدلتے رھنے اور زمین کی ملکیت
میں تبدیلی ھوتے رھنے کی وجہ سے انہیں بار بار اپنا وطن
بدلنا پڑا۔ اب گن تنظیم کے ممبروں کے لئے ممکن نہیں
تھا کہ اپنے اجتماعی معاملوں کو نبٹانے کے لئے ایک جگہ
جمع ھو سکیں۔ اب صرف نہایت کم اھمیت کے معاملے، مثال
کے لئے مذھبی تقریبیں وغیرہ ھی مل کر انجام دی جاتی
تھیں اور وہ بھی بےدلی سے۔ گن سماج کے ادارے جن
ضرورتوں اور مفاد کی دیکھہ بھال کے لئے بنائے گئے تھے
اور جن کی دیکھہ بھال کرنے کی صلاحیت ان میں تھی، ان
کے علاوہ اب کچھہ نئی ضرورتیں اور نئے مفاد سامنے آ گئے
تھے۔ لوگ جن حالات میں روزی کماتے تھے، ان میں انقلاب
آ گیا تھا اور اس کی بدولت سماج کا ڈھانچہ بدل گیا تھا۔
نئی ضرورتیں اور نئے مفاد انہیں تبدیلیوں سے پیدا ھوئے
تھے۔ قدیم گن نظام کے لئے وہ نہ صرف اجنبی تھے بلکہ
اس کے راستے میں ھر طرح کی رکاوٹ پیدا کر رھے تھے۔
محنت کی تقسیم سے دستکاروں کی جو نئی جماعتیں پیدا ھو
گئی تھیں، ان کے مفاد کے لئے اور دیہات کے مقابلہ میں
شہروں کی مخصوص ضرورتوں کے لئے نئے اداروں کی
ضرورت تھی۔ لیکن ان میں سے ھر گروہ ایسے لوگوں پر
مشتمل تھا جو مختلف گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں سے آئے
تھے۔ ان میں غیرملکی لوگ بھی شامل تھے۔ اس لئے لازم

تھا کہ یہ نئے ادارے گن دستور کے باہر بنیں، وہ اس کے متوازی ہوں اور اس کا مطلب ہے کہ اس کے خلاف ہوں۔ اور پھر ہر گن تنظیم میں مفادوں کے ٹکراؤ کا اثر اس وقت محسوس ہؤا اور اسی وقت وہ اپنی انتہا کو پہونچا جب ایک ہی گن اور ایک ہی قبیلے میں امیر اور غریب، سود خوار اور مقروض دونوں طرح کے لوگ جمع ہو گئے۔ پھر ان کے علاوہ نئے باشندوں کی کثیر تعداد تھی جو گن کی تنظیموں کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ وہ لوگ ملک کے اندر ایک طاقت بن گئے تھے جیسا کہ روم میں ہؤا۔ اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں رفتہ رفتہ یک جدی گنوں اور قبیلوں میں ضم بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عام لوگوں کی اس کثیر تعداد کے لئے گن کی تنظیمیں کچھ تھوڑے سے لوگوں کی اپنی مخصوص تنظیمیں تھیں جن کو خاص حقوق حاصل تھے۔ یعنی جو چیز ابتدا میں فطری طور پر قائم ہونے والی جمہوریت تھی وہ بدل کر شرفاء کی ایک نہایت قابل نفرت جماعت بن گئی۔ پھر آخری بات یہ کہ گن دستور نے ایک ایسے سماج میں جنم لیا تھا جس میں اندرونی تضاد نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ایسے ہی سماج کے لئے موزوں تھا۔ رائے عامہ کے سوا اس کے پاس جبر کرنے کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ لیکن اب ایک ایسا سماج جنم لے چکا تھا جو اپنے وجود کی تمام اقتصادی حالتوں کے دباؤ سے مجبور ہوکر آزاد شہریوں اور غلاموں میں، استحصال کرنے والے امیروں اور استحصال کئے جانے والے غریبوں میں

بٹ چکا تھا ـ یہ سماج نہ صرف ان تضادوں کو سلجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کو روز بروز اور آگے بڑھا رہا تھا ـ ایسا سماج یا تو اس حالت میں زندہ رہ سکتا تھا کہ یہ طبقے ایک دوسرے کے خلاف مسلسل کھلم کھلا جد و جہد کرتے رہیں یا ایک تیسری طاقت کی حکمرانی ہو جو بظاہر ان بر سر پیکار طبقوں کے اوپر کھڑی ہو، ان کی کھلی کشمکش کو کچل دیتی ہو اور زیادہ سے زیادہ اقتصادی میدان میں اور یوں کہئے کہ قانونی شکل میں طبقاتی کشمکش ہونے دیتی ہو ـ گن دستور کی افادیت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا ـ محنت کی تقسیم اور اس کے نتیجے یعنی مختلف طبقوں میں سماج کی تقسیم نے اس کے پرخچے اڑا دئیے ـ اس کی جگہ ریاست نے لی ـ

* * *

گن دستور کے کھنڈر پر ریاست کی تعمیر تین خاص شکلوں میں ہوئی ـ اوپر ہم نے تینوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے ـ ایتھنز اس کی سب سے خالص اور سب سے ٹکسالی (کلاسیکل) شکل ہے ـ یہاں ریاست براہ راست اور بڑی حد تک ان طبقاتی تضادوں سے پیدا ہوئی جو گن سماج میں ابھر رہے تھے ـ روم میں گن سماج شرفاء کا ایک مخصوص طبقہ بن گیا جو عوام کی کثیر تعداد کے درمیان کھڑا تھا ـ عوام اس سے باہر تھے ـ ان کے حقوق کچھ نہیں تھے ـ صرف فرائض ہی فرائض تھے ـ عوام (پلیبین) کی فتح نے

پرانے گن دستور کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کے کھنڈروں پر ریاست کی عمارت کھڑی کی جس میں گن کے شرفاء اور عوام (پلے بین) دونوں ھی تھوڑے دنوں میں جذب ہو گئے۔ اور آخر میں سلطنت روم کے جرمن فاتحوں میں ریاست کا ظہور غیرملکوں کے بڑے بڑے علاقوں کی فتح کا براہ راست نتیجہ تھا۔ گن دستور کے پاس ان علاقوں پر حکومت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن ان علاقوں کو فتح کرنے میں وھاں کے قدیم باشندوں کے ساتھہ کسی گمبھیر کشمکش کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور نہ زیادہ آگے بڑھی ہوئی تقسیم محنت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ فاتح اور مفتوح دونوں اقتصادی نشو و نما کی ایک ھی سطح پر تھے۔ چنانچہ سماج کی اقتصادی بنیاد وھی رھی جو پہلے تھی۔ لہذا ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوًا کہ گن دستور ذرا بدلی ہوئی علاقائی شکل میں کئی صدیوں تک قائم رہا۔ یہ مارک دستور کی شکل تھی۔ بعد کے برسوں کے شرفاء اور اعلی نسب کے (پیٹریشین) خاندانوں کی شکل میں، یہاں تک کہ کسان خاندانوں کی شکل میں بھی، جیسے ڈتمارشچن (Dithmarschen) * میں، وہ کچھہ عرصہ کے لئے نہایت کمزور طریقے سے نئی زندگی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوًا۔

---

* نیبور پہلا مورخ تھا جو گن نوعیت کے بارے میں کم و بیش صحیح رائے قائم کر سکا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ڈتمارشچن خاندانوں کے بارے میں واقفیت تھی حالانکہ میکانکی طریقے سے ان کی نقل کرنے کی وجہ سے اس نے کئی غلطیاں بھی کر ڈالیں۔ (نوٹ از اینگلس۔)

اس لئیے ریاست کوئی ایسی طاقت یا اقتدار نہیں ہے جو سماج پر اوپر سے مسلط کی گئی ہو۔ اور نہ وہ «اخلاقی عین کی حقیقت» ہے اور نہ «عقل کا عکس اور اس کی حقیقی صورت» ہے، جیسا کہ ہیگل کہتا ہے۔ بلکہ یہ تو سماج کی نشوونما کی ایک خاص منزل پر سماج کی پیداوار ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ سماج ایک ایسے اندرونی تضاد میں پھنس گیا ہے جو حل نہیں ہو سکتا اور وہ ایسی مخالفتوں اور دشمنیوں میں الجھ گیا ہے جن کو ختم کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ مخالفتیں، یہ متضاد اقتصادی مفاد رکھنے والے طبقے اپنی بے نتیجہ کشمکش میں ایک دوسرے کو اور پورے سماج کو برباد نہ کر ڈالیں، اس کے لئیے ایک ایسی طاقت ضروری ہو گئی جو بظاہر دیکھنے میں سماج کے اوپر کھڑی ہو، جو اس کشمکش کو کم کرے اور اسے «امن و امان» کے دائرے میں محدود رکھے اور یہی طاقت جو سماج سے پیدا ہوئی مگر سماج کے اوپر مسلط ہو گئی اور روز بروز اپنے آپ کو اس سے الگ کرتی رہی ہے، ریاست ہے۔

قدیم گن تنظیم کے برعکس ریاست اپنی رعایا کو پہلے علاقہ کے اعتبار سے بانٹتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پرانی گن جماعتیں، جو خون کے رشتوں کی بنیاد پر بنی تھیں اور جن کی شیرازہ بندی اسی سے ہوئی تھی، ناکافی ہو چکی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ مان کر چلتی تھیں کہ ان کے ممبر ایک علاقہ سے وابستہ

هیں اور دراصل یہ وابستگی بہت دن پہلے ختم ہو چکی تھی۔ علاقہ اپنی جگہ پر قائم رہا لیکن لوگ نقل مقام کرنے لگے تھے۔ اس لئے بٹوارے کے لئے علاقہ کو نئی بنیاد بنایا گیا اور شہریوں کو اجازت دی گئی کہ جہاں وہ بسے ہوئے ہوں وہیں اپنے حقوق اور فرائض کو انجام دیں، چاہے وہ کسی بھی گن یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں۔ مقام کے اعتبار سے شہریوں کی یہ تنظیم تمام ریاستوں کی مشترک خصوصیت ہے۔ اسی لئے ہمیں یہ قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہم دیکھ آئے ہیں کہ گن کے اعتبار سے شہریوں کی پرانی تنظیم کو ہٹا کر اس کی جگہ لینے میں اس کو ایتھنز اور روم میں کتنی طویل اور سخت جد و جہد کرنی پڑی تھی۔

دوسری چیز اقتدار عامہ کا قیام ہے۔ یہ اب براہ راست پوری آبادی پر منطبق نہیں ہوتا جو ایک مسلح قوت کی شکل میں منظم ہوتی تھی۔ یہ خاص اقتدار عامہ اس لئے ضروری ہے کہ طبقات کی تقسیم کے بعد آبادی کی کوئی ایسی ہتھیاربند تنظیم ممکن نہیں رہی جو آپ ہی آپ عمل کر سکے۔ اب غلام بھی آبادی کا ایک حصہ تھے۔ ۳۶۵۰۰۰ غلاموں کے مقابلہ میں ایتھنز کے ۹۰۰۰۰ شہری محض ایک ایسا طبقہ تھے جس کو خاص حقوق اور رعایتیں حاصل تھیں۔ شرفاء اور امراء کا اقتدار عامہ جو غلاموں کے خلاف تھا اور انہیں دبا کر رکھتا تھا، ایتھنز کی جمہوریت کی عوامی فوج تھی۔ لیکن شہریوں کو بھی دبائے رکھنے کے لئے جلد ہی ایک ژاندارمی (پولیس) کی ضرورت ہو گئی، جیسا کہ ہم

اوپر بتا آئے ہیں۔ یہ اقتدار عامہ ہر ریاست میں موجود ہے۔ اس کا مطلب صرف ہتھیاربند لوگ ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے مادی لوازمات بھی ہیں، قیدخانہ اور جبر کے ہر قسم کے ادارے بھی ہیں جو گن سماج کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ جن سماجوں میں طبقاتی تضاد ابھی تک پوری طرح نہیں ابھرے ہیں اور جو جگہیں دوسروں سے الگ تھلگ ایک طرف کو پڑی ہیں، ان میں ابھی تک یہ بہت چھوٹی اور گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بعض بعض زمانوں میں اور بعض بعض علاقوں میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن جیسے جیسے کسی ریاست میں طبقاتی تضاد زور پکڑتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے آس پاس کی ریاستیں رقبہ اور آبادی میں بڑھتی جاتی ہیں، ویسے ہی ویسے یہ اقتدار عامہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہمارے اپنے زمانہ کے یوروپ کو دیکھنا کافی ہوگا، جہاں طبقاتی جد و جہد اور فتوحات کی رقابت اور مقابلہ نے اقتدار عامہ کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ پورے سماج اور خود ریاست کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس اقتدار عامہ کو قائم رکھنے کے لئے شہریوں سے پیسہ وصولنا یعنی ٹیکس لینا ضروری ہو گیا۔ گن سماج میں ٹیکس کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ لیکن آج کون ہے جو اس سے واقف نہ ہو۔ جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا جاتا ہے یہ ٹیکس ناکافی ہوتے جاتے ہیں۔ تب ریاست مستقبل کے ٹیکسوں کی ہنڈی پر روپیہ لینا، یعنی روپیہ

ادھار لینا، سرکاری قرض لینا شروع کرتی ہے۔ قدیم یوروپ ان قرضوں کے بارے میں بھی ایک پوری داستان سنا سکتا ہے۔

حکومت کے افسر یا عہدہ‌دار لوگ جن کے قبضہ میں اقتدارعامہ ہوتا ہے اور جنہیں ٹیکس عائد کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اب سماج کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گن دستور کے عہدہ‌داروں کی عزت لوگ بلا کسی جبر و اکراہ کے اپنے آپ کرتے تھے۔ وہ عزت اگر حکومت کے ان افسروں کو حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ اس سے مطمئن نہ ہوتے۔ وہ ایک ایسی طاقت کے کل پرزے تھے جو سماج کے لئے اجنبی اور اس سے الگ ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس لئے یہ ضروری تھا کہ خاص قانون بنا کر لوگوں کو ان کا احترام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ان قانونوں کے ذریعہ سرکاری افسروں کو ایک خاص تقدس اور احترام عطا کیا جاتا ہے۔ گن سماج کے تمام عہدہ داروں کو ملا کر بھی جتنا اختیار حاصل نہیں تھا، اس سے زیادہ «اختیار» ایک متمدن ریاست کے ادنی ترین پولیس افسر کو ہوتا ہے۔ لیکن گن سماج کے چھوٹے سے چھوٹے سردار کو بلا کسی دباؤ اور بغیر کسی بحث و تکرار کے جو عزت نصیب تھی، اس پر تمدن کے عہد کے سب سے طاقتور بادشاہ اور مدبر بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ایک سماج کے درمیان، اس کے بیچ میں کھڑا تھا، دوسرا مجبور ہے کہ ایک ایسی چیز کی نمائندگی کا دعوی کرے جو سماج کے باہر اور اس کے اوپر ہے۔

چونکہ ریاست طبقاتی تضاد کو دبائے رکھنے کی ضرورت سے پیدا ہوئی لیکن اسی کے ساتھہ وہ ان طبقوں کی کشمکش کے دوران میں پیدا ہوئی، اس لئے وہ عام طور پر سب سے زیادہ طاقتور، اقتصادی طور پر سب سے زیادہ ذی‌اقتدار طبقہ کی ریاست ہوتی ہے۔ یہ طبقہ ریاست کے ذریعہ سے سیاسی طور پر بھی سب سے زیادہ ذی اقتدار طبقہ بن جاتا ہے اور اس طرح مظلوم طبقہ کو دبائے رکھنے اور اس کا استحصال کرنے کے نئے ذرائع حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ عہد قدیم کی ریاست سب سے بڑھہ کر غلاموں کے مالکوں کی ریاست تھی جس کا مقصد غلاموں کو دبائے رکھنا تھا۔ اسی طرح سامنتی ریاست امراء اور شرفاء کا آلۂ کار تھی جس کا مقصد زرعی غلام کسانوں اور زرخرید حلقہ بگوشوں کو دبائے رکھنا تھا۔ اور جدید نمائندہ ریاست سرمایہ کے ہاتھوں اجرتی محنت کے استحصال کا حربہ ہے۔ لیکن مستثنی طور پر ایسے بھی دور آتے ہیں جبکہ لڑنے والے طبقوں میں قریب قریب ایسا توازن قائم ہو جاتا ہے کہ ریاست بظاہر ایک پنچ کی حیثیت سے کچھہ دیر کے لئے اور کسی حد تک دونوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی خودسر بادشاہتوں کا یہی حال تھا۔ وہ شرفاء اور بورژوازی میں توازن قائم کئے ہوئے تھیں۔ پہلی اور اس سے بھی زیادہ دوسری فرانسیسی سلطنت کی بوناپارٹزم کا بھی یہی حال تھا۔ وہ کبھی بورژوازی کے خلاف پرولتاریہ کو اور کبھی پرولتاریہ کے خلاف بورژوازی کو بڑھاوا دیتے

رہتے تھے۔ اس کی تازہ ترین مثال جس میں حاکم اور محکوم دونوں یکساں مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں، بسمارک قوم کی نئی جرمن سلطنت ہے۔ یہاں سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ایک دوسرے کے خلاف توازن قائم کیا جاتا ہے اور پرشیا کے افلاس زدہ تنگ نظر یونکروں (زمینداروں) کے فائدے کے لئے دونوں کو یکساں طور پر دھوکا دیا جاتا ہے۔

تاریخ میں ابھی تک جتنی ریاستیں ہوئی ہیں، ان میں زیادہ تر شہریوں کو ان کی دولت کے مطابق کم یا زیادہ حقوق دئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ریاست ملکیت والے طبقوں کی ایک تنظیم ہے جو محروم ملکیت طبقہ سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ ایتھنز اور روم میں ایسا ہی تھا جہاں شہریوں کی طبقہ بندی ملکیت کے مطابق کی گئی تھی۔ ازمنۂ وسطی کی سامنتی ریاست میں بھی یہی حالت تھی۔ وہاں جس کے پاس جتنی زمین ہوتی تھی، اس کے ہاتھہ میں اتنی ہی سیاسی طاقت ہوتی تھی۔ اور جدید نمائندہ ریاست میں انتخاب میں حصہ لینے کے لئے شہریوں کو جو شرطیں پوری کرنی پڑتی ہیں، ان میں بھی یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ملکیت کے فرق کو سیاسی مانتا دی جائے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تو نشو و نما کے نیچی سطح پر ہونے کی علامت ہے۔ ریاست کی اعلی ترین شکل یعنی جمہوری ری پبلک جو سماج کے موجودہ حالات میں روز بروز ایک لازمی ضرورت ہوتی جا رہی ہے اور جو ریاست

کی وہ تنہا صورت ہے جس میں پرولتاریہ اور بورژوا طبقہ کی آخری فیصلہ‌کن جدوجہد ہو سکتی ہے—وہ جمہوری ری‌پبلک سرکاری طور پر ملکیت کے فرق کو نہیں مانتی ہے۔ اس میں دولت بالواسطہ طریقہ سے مگر اور بھی زیادہ کارگر ڈھنگ سے اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ایک تو دولت سے سرکاری عہدہ‌داروں کو سیدھے سیدھے رشوت دی جاتی ہے—اس کی ٹھیٹ مثال امریکہ ہے—دوسرے، حکومت اور اسٹاک اکسچینج میں گٹھہ بندھن ہو جاتا ہے۔ جتنا ریاست کا سرکاری قرضہ بڑھتا جاتا ہے، اور جتنا زیادہ سرمایہ‌دار کمپنیاں اسٹاک اکسچینج کو اپنا مرکز بناکر نہ صرف وسائل نقل و حمل کو بلکہ پیداوار کو بھی اپنے ہاتھوں میں جمع کرتی جاتی ہیں، اتنی ہی زیادہ آسانی سے یہ گٹھہ بندھن ہو جاتا ہے۔ تازہ‌ترین فرانسیسی ری‌پبلک اور امریکہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور اپنے نیک اور شریف سوئزرلینڈ نے بھی اس شعبہ میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن حکومت اور اسٹاک اکسچینج میں اس طرح کا دوستانہ تعلق قائم کرنے کے لئے جمہوری ری‌پبلک ضروری نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں انگلینڈ اور نئی جرمن سلطنت کی مثال دی جا سکتی ہے، جہاں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عام رائے دہندگی سے کس کا درجہ زیادہ اونچا اٹھا ہے، بسمارک کا یا بلائخروڈر کا۔ اور آخری بات یہ کہ دولتمند طبقہ براہ‌راست عام رائے دہندگی کے ذریعہ سے حکومت کرتا ہے۔ جب تک کہ مظلوم طبقہ جو آج کل مزدور طبقہ ہے،

اتنا پختہ نہیں ہو جاتا کہ اپنے آپ کو آزاد کر لے، تب تک اس کا بڑا حصہ صرف موجودہ سماجی نظام کو ہی ایک ممکن نظام سمجھتا رہےگا اور اس لئے سیاسی طور پر سرمایہ دار طبقہ کی دم، اس کا سب سے انتہائی بائیں بازو والا حصہ بنا رہےگا۔ لیکن جس حد تک یہ طبقہ خود اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لائق بنتا جاتا ہے، اسی حد تک وہ اپنے کو خود اپنی پارٹی کی شکل میں منظم کرتا ہے اور سرمایہ داروں کے نہیں بلکہ خود اپنے نمائندے چنتا ہے۔ چنانچہ عام رائے دہندگی مزدور طبقہ کی پختگی کی علامت ہے، اس کی کسوٹی ہے۔ موجودہ ریاست میں وہ اس سے زیادہ کچھہ نہیں ہے اور نہ کچھہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اتنا کافی ہے۔ جس دن عام رائے دہندگی کا تھرمامیٹر بتلائےگا کہ مزدوروں میں ابال آنےوالا ہے، اس دن مزدور اور سرمایہ دار دونوں کو معلوم ہو جائےگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

غرضکہ ریاست ازل سے نہیں چلی آ رہی ہے۔ ایسے بھی سماج ہوئے ہیں جنہوں نے ریاست کے بغیر اپنا کام چلایا اور ان میں ریاست اور ریاستی اقتدار کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اقتصادی نشو و نما کی ایک خاص منزل پر سماج لازمی طور پر طبقوں میں بٹ گیا اور اس تقسیم کی وجہ سے ریاست کا وجود ضروری ہو گیا۔ اب ہم تیزی سے پیداوار کی نشو و نما کی اس منزل کی طرف بڑھہ رہے ہیں جس میں ان طبقوں کا زندہ رہنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں رہےگا بلکہ پیداوار کے راستے میں ایک رکاوٹ بن

جائے گا۔ تب وہ اتنے ہی لازمی طور پر مٹ جائیں گے جتنے لازمی طور پر وہ پہلے کے ایک دور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے مٹنے کے ساتھہ ساتھہ ریاست بھی لازمی طور پر مٹ جائے گی۔ جو سماج مال پیدا کرنے والوں کے آزاد اور مساوی تعاون کی بنیاد پر پیداوار کو منظم کرے گا وہ سماج ریاست کی پوری مشین کو اٹھا کر اس جگہ رکھہ دے گا جو تب اس کے لئے سب سے مناسب جگہ ہوگی۔ یعنی وہ ریاست کو ہاتھہ کے چرخے اور کانسے کی کلہاڑی کی طرح آثار قدیمہ کے عجائب گھر میں رکھہ آئے گا۔

* * *

اس طرح مذکورۂ بالا تجزیہ بتلاتا ہے کہ تمدن سماج کے ارتقا کی وہ منزل ہے جس میں محنت کی تقسیم، اس کی بدولت افراد کے درمیان ہونے والا تبادلہ اور ان دونوں چیزوں کو ملانے والی جنس تبادلہ کی پیداوار اپنے ارتقا کی آخری حد پر پہونچ جاتی ہے اور اب تک کے پورے سماج میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

سماج کے تمام سابقہ ادوار میں عمل پیداوار بنیادی طور پر اجتماعی تھا اور اسی طرح استعمال کے لئے پیداوار کو چھوٹی یا بڑی قدیم کمیونسٹی برادریوں میں سیدھے سیدھے بانٹ لیا جاتا تھا۔ یہ ساجھے کی پیداوار نہایت ہی محدود دائرے کے اندر ہوتی ہوگی لیکن ساتھہ ہی اس میں پیدا کرنے والے لوگ اپنے عمل پیداوار اور پیداوار دونوں کے

مالک ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی پیداوار کا کیا ہوتا ہے۔ وہ اسے خود خرچ کرتے تھے۔ وہ کبھی ان کے ہاتھوں سے دور نہیں جاتی تھی۔ جب تک اس بنیاد پر پیداوار جاری رہی تب تک وہ پیدا کرنے والوں کے قابو سے باہر نہیں نکل پائی اور ان کے خلاف ویسی عجیب اور بھوت پریت جیسی قوتوں کو نہیں کھڑا کر سکی جیسا کہ تمدن کے عہد میں باقاعدہ اور لازماً نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ پیداوار کے اس عمل میں محنت کی تقسیم گھس آئی۔ اس نے پیداوار اور تصرف کی اجتماعی نوعیت کی جڑ کھود ڈالی۔ اس نے افراد کے تصرف کو عام قاعدہ بنا دیا اور اس طرح افراد کے درمیان تبادلہ کو جنم دیا۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یہ کیسے ہؤا۔ رفتہ رفتہ جنس تبادلہ کی پیداوار غالب شکل بن گئی۔

جب جنس تبادلہ کی پیداوار کا رواج ہؤا یعنی جب پیداوار اپنے استعمال کے لئے نہیں بلکہ تبادلہ کے لئے کی جانے لگی تو لازماً پیداوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونے لگی۔ تبادلہ کے دوران میں پیدا کرنے والا اپنی پیداوار سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا ہؤا۔ جیسے ہی زر اور اس کے ساتھ سوداگر مختلف مال پیدا کرنے والوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی کی حیثیت سے گھس آتے ہیں، تبادلہ کا عمل اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے، پیداوار کے مال کا حشر اور زیادہ غیریقینی ہو جاتا ہے۔ تاجروں کی تعداد بہت ہوتی ہے اور ان میں سے کسی

کو نہیں معلوم ہوتا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ اجناس صرف ایک آدمی سے دوسرے آدمی کے ہاتھہ میں نہیں بلکہ ایک منڈی سے دوسری منڈی میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اب پیدا کرنے والوں کا اپنی زندگی کے لئے ضروری چیزوں کی کل پیداوار پر کوئی قابو نہیں رہ گیا ہے اور تاجروں کو اس پر قابو حاصل نہیں ہوا ہے۔ مال اور پیداوار اتفاقات کے ہاتھہ میں کھلونا بن جاتے ہیں۔

لیکن اتفاقات باہمی تعلق کا محض ایک سرا ہیں۔ اس کا دوسرا سرا ضرورت کہلاتا ہے۔ فطرت میں جہاں اتفاقات کی بھی حکمرانی معلوم ہوتی ہے، ہم بہت پہلے دکھا چکے ہیں کہ ہر مخصوص شعبہ میں ان اتفاقات میں ایک ضرورت (جبر) اور باقاعدگی عمل پیرا ہوتی ہے۔ جو چیز فطرت کے لئے صحیح ہے وہ سماج کے لئے بھی صحیح ہے۔ کسی سماجی عمل یا سماجی اعمال کے کسی سلسلہ پر انسان کا ذی شعور طریقہ سے قابو رکھنا جتنا زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے، جتنا زیادہ یہ اعمال انسان کی قدرت سے باہر نکلتے جاتے ہیں، اتنا ہی زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال پر محض اتفاقات کی حکمرانی ہے اور اتنا ہی زیادہ ان کے مخصوص اور بنیادی قوانین اتفاقات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فطری ضرورت کی بدولت ہی ایسا ہوتا ہے۔ جنس تبادلہ کی پیداوار اور تبادلہ میں جن اتفاقات کا ہاتھہ دکھائی دیتا ہے، وہ بھی ایسے ہی قانونوں کے ماتحت ہیں۔ الگ الگ مال پیدا کرنے والوں اور تبادلہ

کرنے والوں کو یہ قوانین نہایت عجیب اور شروع میں اجنبی اور پراسرار قوت کی طرح بھی معلوم ہوتے ہیں جن کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لئے بڑی محنت کے ساتھہ کھوج اور چھان بین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جنس تبادلہ کی پیداوار کے اقتصادی قانون، پیداوار کی اس شکل کی نشو و نما کے ہر دور میں کسی قدر بدل جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی تمدن کے پورے عہد میں ان قوانین کا غلبہ رہتا ہے۔ آج بھی پیداوار پیدا کرنے والے کی مالک ہے۔ آج بھی سماج کی کل پیداوار کسی ایسے منصوبے کے مطابق طے نہیں ہوتی جسے سب نے مل کر سوچ سمجھہ کر تیار کیا ہو بلکہ اندھے قوانین کے ذریعہ طے ہوتی ہے جو فطرت کی قوتوں کی طرح کام کرتے ہیں اور آخر میں میعادی تجارتی بحرانوں کے طوفانوں کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ہم اوپر دیکھہ چکے ہیں کہ کس طرح پیداوار کی نشو و نما کے ایک نسبتاً ابتدائی دور میں ہی انسانی قوت محنت اس قابل ہو گئی تھی کہ پیدا کرنے والے کی ضروریات زندگی کے لئے جتنا کافی تھا، اس سے کہیں زیادہ پیدا کر سکے۔ اور کس طرح دراصل اسی دور میں پہلی تقسیم محنت اور افراد کے درمیان تبادلہ شروع ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اس بڑی «حقیقت» کا انکشاف ہوتے بھی بہت دیر نہیں لگی کہ انسان بھی ایک جنس تبادلہ ہو سکتا ہے اور انسان کو غلام بنا کر انسانی طاقت کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ انسان نے ابھی تبادلہ کرنا

شروع ہی کیا تھا کہ اس کا بھی تبادلہ کیا جانے لگا۔ آدمی نے چاہا ہو یا نہ چاہا ہو مگر ہؤا یہی کہ جو فعال تھا وہ دوسروں کے ہاتھہ کا کھلونا بن گیا۔

غلامی کے ساتھہ ساتھہ، جو تمدن کے عہد میں اپنی نشو و نما کی انتہا کو پہونچ جاتی ہے، استحصال کرنے والوں اور استحصال کئے جانے والوں میں سماج کی پہلی بڑی تقسیم ہوئی۔ تمدن کے پورے دور میں یہ تقسیم جاری رہی ہے۔ غلامی استحصال کی پہلی شکل تھی، جو قدیم زمانہ کی خصوصیت تھی۔ اس کے بعد ازمنۂ وسطی میں زرعی غلامی اور موجودہ زمانہ میں اجرتی محنت آئی۔ غلامی کی یہ تین بڑی شکلیں ہیں جو تمدن کے تین بڑے ادوار کی خصوصیتیں رہی ہیں۔غلامی ہر عہد میں رہی ہے، پہلے علانیہ اور پھر بعد میں پوشیدہ طور پر۔

تمدن کا عہد جنس تبادلہ کی پیداوار کی جس حالت سے شروع ہؤا اس کی اقتصادی خصوصیتیں یہ تھیں: (۱) دھات کے بنے ہوئے سکے استعمال ہونے لگے تھے اور اس لئے زر کی شکل میں سرمایہ کا، سود اور سودخوری کا رواج بھی ہو چکا تھا۔ (۲) پیدا کرنے والوں کے بیچ میں تاجر درمیانی آدمی کا کام کرنے لگے تھے۔ (۳) زمین پر افراد کی نجی ملکیت قائم ہو گئی تھی اور رہن کا رواج ہو چکا تھا۔ (٤) پیداوار کی مروجہ شکل غلاموں کی محنت تھی۔ تمدن کے عہد سے مطابقت رکھنے والی خاندان کی شکل جو اس عہد میں یقینی طور پر مروجہ شکل بن چکی تھی، یک زوجگی

ہے جس میں عورت پر مرد کا غلبہ ہوتا ہے اور الگ الگ ہر خاندان سماج کی اقتصادی اکائی ہوتا ہے۔ متمدن سماج کو باندھ کر رکھنے والی قوت ریاست ہے، جو ہر نمائندہ عہد میں محض حکمراں طبقہ کی ریاست ہوتی ہے اور جو بنیادی طور پر ہمیشہ مظلوم اور استحصال کئے جانے والے طبقہ کو دبا کر رکھنے والی مشین کا کام کرتی ہے۔ تمدن کی دوسری خصوصیتیں یہ ہیں: سماجی محنت کی پوری تقسیم کی بنیاد کے طور پر شہر اور دیہات میں مستقل تضاد قائم، ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف وصیت ناموں کا رواج ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ جائداد کا مالک اپنی موت کے بعد بھی اپنی جائداد کو جسے چاہے دے سکتا ہے۔ یہ رواج جس نے قدیم گن دستور پر براہ راست کاری ضرب لگائی، سولون کے زمانہ تک ایتھنز میں نہیں پایا جاتا تھا۔ روم میں بہت شروع میں ہی اس کا رواج ہو گیا تھا لیکن ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ کب*۔ جرمنوں میں وصیت کو پادریوں نے رواج

---

* لاسال کی کتاب «اکتسابی حقوق کا نظام» کے دوسرے حصہ میں اس رائے سے بحث کی گئی ہے کہ روم کا وصیت نامہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود روم۔ وہ لکھتا ہے کہ روم کی تاریخ میں «ایسا کوئی زمانہ نہیں رہا جب وصیت نامے نہ رہے ہوں»، بلکہ وصیت نامے ماقبل رومی زمانہ میں مردوں کی پرستش کا نتیجہ ہیں۔ پرانے مکتب کے پکے ہیگل وادی کی طرح لاسال نے رومن قانون کی دفعات کی بنیاد، رومیوں کے سماجی حالات کو نہیں بنایا بلکہ ارادے کے «نظری تصور» کو قرار دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ اس غیرتاریخی خیال کا

دیا تھا تاکہ بھولے بھالے خوش‌عقیدہ جرمن بلاکسی دشواری کے اپنی جائداد کلیسا کو دے جائیں۔

اس دستور کو اپنی بنیاد بنا کر تمدن نے ایسے ایسے کارنامے انجام دئیے ہیں جنہیں قدیم گن سماج ہرگز نہیں انجام دے سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے میں تمدن نے انسان کی اسفل‌ترین جبلتوں اور جذبات کو اکسا کر ان سے کام لیا اور اس کی تمام دوسری صلاحیتوں کو دبا کر ان جذبات کو بڑھایا۔ تمدن کے روز اول سے آج تک ننگی حرص و ہوس اس کی روح رواں رہی ہے۔ دولت، زیادہ دولت، اور زیادہ دولت ــــ یہی اس کا واحد اور غالب نصب العین رہا ہے۔ مگر وہ بھی سماج کی دولت نہیں بلکہ ذلیل و حقیر فرد کی دولت۔ اگر اس نصب‌العین کو پورا کرنے کی کوشش کے دوران میں سائنس نے زیادہ سے زیادہ ترقی کی اور فن کے انتہائی عروج کے دور بھی بار بار آتے رہے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ دولت بٹورنے میں آج جو زبردست کامیابی

حامی بن گیا۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اسی کتاب میں اسی نظری تصور کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ رومی وراثت کے نظام میں جائداد کا منتقل ہونا ایک ثانوی حیثیت کی چیز ہے۔ لاسال نہ صرف رومی قانون سازوں کی خوش‌فہمیوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور خاص کر پہلے کے زمانہ کے ماہرین قانون کی خوش‌فہمیوں پر، بلکہ اس معاملہ میں وہ ان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ (نوٹ از اینگلس۔)

حاصل ہوئی ہے، وہ سائنس اور فن کی ان کامیابیوں کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔

چونکہ تمدن کی بنیاد ایک طبقہ کے ہاتھوں دوسرے کا استحصال ہے، اس لئے اس کی ساری نشو و نما ایک مسلسل تضاد کے دائرے سے ہو کر گذرتی ہے۔ پیداوار میں ترقی کا جو بھی قدم اٹھتا ہے وہ مظلوم طبقہ یعنی بہت بڑی اکثریت کی حالت کو اور بدتر بنا دیتا ہے۔ ایک کے لئے جو نعمت ہے، وہ لازمی طور پر دوسرے کے لئے لعنت ہے۔ کسی ایک طبقہ کو جب بھی آزادی ملتی ہے تو وہ کسی دوسرے طبقہ کے لئے نئی غلامی کی زنجیر بن جاتی ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ہمیں مشینوں کے استعمال میں ملتی ہے، جس کے نتیجوں سے آج سبھی لوگ واقف ہیں۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بربری لوگوں میں حقوق اور فرائض میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن تمدن نے ایک طبقہ کو تقریباً سارے حقوق دے کر اور دوسرے طبقہ پر تقریباً ساری ذمہ داریوں کا بوجھ لاد کر، حقوق اور فرائض کے فرق اور ان کے تضاد کو اتنا واضح کر دیا ہے کہ جاہل سے جاہل آدمی بھی انہیں سمجھ سکتا ہے۔

لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ جو چیز حکمراں طبقہ کے لئے اچھی ہے، اسے پورے سماج کے لئے اچھا ہونا چاہئے جس کے ساتھ حکمراں طبقہ اپنایت جتلاتا ہے۔ لہذا جیسے جیسے تمدن کی ترقی ہوتی ہے، ویسے ویسے اسے ان برائیوں پر جنہیں وہ لازمی طور پر پیدا کرتا ہے، محبت کا پردہ

ڈالنا پڑتا ھے، انہیں جھوٹی آرائشوں سے چھپانا پڑتا ھے یا
پھر ان کے وجود سے ھی انکار کر دینا پڑتا ھے۔ مختصر
یہ کہ اسے رسمی منافقت اختیار کرنی پڑتی ھے جو کہ سماج
کی قدیم شکلوں میں اور یہاں تک کہ تمدن کی ابتدائی
حالتوں میں بھی موجود نہیں تھی۔ اور آخر میں اس اعلان
پر تان ٹوٹتی ھے کہ استحصالی طبقہ مظلوم طبقہ کا استحصال محض
اور پورے طور پر خود اسی طبقہ کی بھلائی کے لئے کرتا
ھے۔ اور اگر مظلوم طبقہ اس صداقت کو نہیں سمجھہ پاتا
اور یہاں تک کہ بغاوت پر بھی کمربستہ ھو جاتا ھے تو
وہ اپنے محسنوں یعنی استحصال کرنے والوں سے نہایت
احسان فراموشی کے ساتھہ پیش آتا ھے*۔

---

* شروع میں میرا ارادہ تھا کہ تمدن کی جو شاندار
تنقید فورئیے کی تصنیفات میں بکھری پڑی ھے، اسے میں
مارگن کی اور اپنی تنقید کے ساتھہ ساتھہ پیش کروں۔ لیکن
بدقسمتی سے میں اس کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ میں
صرف یہی کہنا چاھتا ھوں کہ فورئیے اسی وقت سے یک‌زوجگی
اور زمین کی ملکیت کو تمدن کی اصلی خصوصیت مانتا تھا
اور اس نے تمدن کو غریبوں کے خلاف امیروں کی جنگ
سے تعبیر کیا ھے۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیفوں میں اس
حقیقت کو بھی گہرائی کے ساتھہ پیش کیا گیا ھے کہ اس
طرح کے سبھی نامکمل سماجوں میں جن میں باھمی متضاد مفادوں
کی بدولت پھوٹ پڑ چکی ھے، الگ الگ خاندان (les familles
incohérentes) اقتصادی اکائی ھوتے ھیں۔ (نوٹ از اینگلس۔)

اور اب میں آخر میں تمدن پر مارگن کی فیصلہ کن رائے پیش کرتا ہوں: «تمدن کے آنے کے بعد سے ملکیت کو اتنا زبردست فروغ ہوا ہے، اس نے اتنی بھانت بھانت کی شکلیں اختیار کی ہیں، اس کے استعمال میں اتنا اضافہ ہوا ہے، اور اس کے مالکوں کے حق میں اس کا انتظام اتنی عقلمندی سے کیا گیا ہے کہ لوگوں کے لئے یہ ایک ایسی طاقت بن گئی ہے جس کو قابو میں رکھنا ناممکن ہے۔ انسانی ذہن خود اپنی تخلیق کے سامنے حیرت زدہ کھڑا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا وقت ضرور آئے گا جب انسان کی عقل ملکیت پر قابو پائے گی، اسے اپنے بس میں لانے میں کامیاب ہوگی اور جس ملکیت کی ریاست حفاظت کرتی ہے، اس کے ساتھ اس کے تعلق کو متعین اور اس کے مالکوں کے فرائض اور ان کے حقوق کی حدود کو واضح کر دے گی۔ سماج کے مفاد فرد کے مفاد سے بالاتر ہیں اور دونوں میں صحیح تعلق اور ہم آہنگی قائم کرنی چاہئے۔ اگر ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ترقی کے قانون کو جاری و ساری رہنا ہے تو انسانیت کا آخری نصب‌العین محض ملکیت بٹورنا نہیں ہو سکتا۔ تمدن کے شروع ہونے سے لےکر اب تک جو زمانہ گذرا ہے، وہ انسان کے پورے ماضی کا محض ایک ٹکڑا ہے اور جو زمانہ آئندہ آنے والا ہے، اس کا بھی محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جس سماج کا مقصد و منتہی ملکیت بٹورنا ہو، اس کا انجام یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے کیونکہ اس سماج کے اندر خود تخریب کے

عناصر پوشیدہ ہیں۔ تجربہ، عقلمندی اور علم سماج کی جس اعلی سطح کی طرف برابر اشارہ کر رہے ہیں، اس میں حکومت میں جمہوریت ہوگی، سماج میں بھائی چارہ ہوگا، حقوق اور منصب میں برابری ہوگی اور تعلیم عام ہوگی۔ اس سماج میں قدیم گنوں کی آزادی، مساوات اور بھائی‌چارے کو زیادہ اعلی شکل میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا» ۔ (مارگن، «قدیم سماج»، صفحہ ۵۵۲ ۔)

یہ کتاب چوتھے، اضافہ شدہ اس کتاب کو اینگلس نے ایڈیشن کے مطابق طبع ہوئی۔۔ مارچ جون ۱۸۸٤ء میں لکھا تھا ۔ سب سے پہلے ایک علیحدہ کتاب کے طور پر یہ ۱۸۸٤ء میں زورک سے شائع ہوئی تھی ۔

ناموں کا اِنڈکس (اشاریّہ)

— الف —

پرسیئس (۱۷۹-۱۶۸ ق-م-)- مقدونیه کا آخری بادشاہ- مقدونیه کی آزادی کے لئے روم کے خلاف جنگ کی- ص ۲۹۷

پروکوپیئس (چھٹی صدی عیسوی)- بازنطینی مورخ- بیلیساریئس کی مہموں میں اس نے حصه لیا تھا جس کی روداد اس نے لکھی ھے- ص ۱۳۵

پلوٹارک (۴۸ - ۱۲۰ عیسوی)- یونانی مصنف اور معلم اخلاق- ص ۱۲۲

پلینی بزرگ، گیئس سکنڈس (۲۴ - ۷۹ عیسوی)- رومن، ماھر جغرافیه- ص ۲۸۸، ۲۹۷

پیسیستراتس (۶۰۰ - ۵۲۷ ق-م-)- ۵۶۰ میں ایتھینز کا جابر فرماں روا بن گیا- ص ۲۳۸

— تھ —

تھیوسیڈیڈیز (۴۶۰-۴۰۰ ق-م-)- قدیم یونانی مورخ- ص ۲۱۱

تھیوکریٹس (تیسری صدی قبل مسیح) -قدیم یونانی شاعر جس نے چراگاھوں کی زندگی پر گیت لکھے ھیں- ص ۱۴۹

— ٹ —

ٹارکوئی نیئس، سوپربس- روم کا آخری بادشاہ- روایت ھے که اس نے ۵۳۴ سے ۵۱۰ ق-م- تک حکومت کی- ص ۲۵۶، ۲۶۱

— د —

— ڈ —

— ر —

رائٹ ایشر (ارتھر) (۱۸۰۳–۱۸۷۵)۔ امریکن مشنری۔ ماہر علم الاقوام۔ مارگن کے ساتھہ خط و کتابت کرنے والوں میں سے ایک۔ ص ۹۲

— ز —

زوریتا، جیرانیمو (۱۵۱۲–۱۵۸۰)۔ اسپینی مورخ۔ ص ۱۱۵

— ژ —

ژیرا تیولوں، الکسیز (پیدائش ۱۸۳۹ء)۔ ابتدائی سماج کا مورخ، جنیوا میں پروفیسر۔ باخوفن کا شاگرد ہے۔ ص ۳۰، ۳۵، ٦۰، ٦۲، ۱۱۸

— س —

سالویانس، مارسیلز کا (۴۰۰–۴۸۴)۔ مارسائی (گال) کا پادری، زبردست خطیب اور مورخ۔ ص ۳۰۵

سرویئس ٹولیئس۔ روم کا بادشاہ، جس کے بارے میں روایت ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں حکومت کرتا تھا۔ ص ۲۵۹

سوی لئس جولئس (پہلی صدی عیسوی)۔ جرمن قبیلے بٹاوی کا سردار جس نے ساتویں عشرے کے آخر میں روم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ص ۲۸۰

سکندر اعظم، مقدونیہ کا (۳۵٦–۳۲۳ ق–م–)۔ ص ۱۱۴

— ش —

— ف —

— ی —

Ф. ЭНГЕЛЬС

ПРОИСХОЖДЕНИЕ СЕМЬИ, ЧАСТНОЙ СОБСТВЕННОСТИ И ГОСУДАРСТВА